گاندھی جی بادشاہ خاں کے دیس میں

باراول

۱۰۰۰

شاخ دہلی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار
دہلی نمبر ۶

شاخ بمبئی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ جے جے ہسپتال
بمبئی نمبر ۳

اکتوبر ۱۹۵۰ء
جید برقی پریس، دہلی

فہرست مضامین

تقریب

گاندھی جی کی روحانی فتوحات میں صوبہ سرحد کی فتح بڑی حیرت انگیز سمجھی جاتی ہے۔ ناواقف لوگوں کو بڑا اچنبھا ہوتا ہے کہ ان کی اہنسا کی تعلیم نے جنگ جو پٹھانوں کے دلوں پر اتنا گہرا اثر کیسے ڈالا۔ لیکن جو لوگ اہنسا کی حقیقت سے واقف ہیں اور سرحدی پٹھانوں کو بھی جانتے ہیں ان کو اس میں کوئی تعجب کی بات معلوم نہیں ہوتی۔ اہنسا بہادروں کا ہتھیار ہے پٹھان صرف جنگ جو ہی نہیں بلکہ سچے معنی میں سپاہی اور اچھے ہتھیاروں کے قدرداں ہیں۔ پھر بھلا انھیں اہنسا کی تیغ جوہر دار جس کا لوہا دنیا کی سب سے بڑی سلطنت نے مانا ہے، کیوں نہ پسند آتی۔

سرحد میں گاندھی جی کی کامیابی کی ایک اور وجہ بھی ہے وہاں انھیں ستیہ گرہ کی لڑائی میں ایک ایسا سپہ سالار مل گیا جس کی کھری سچائی میں کھوٹ کا نام تک نہ تھا۔ خان عبدالغفار خاں جو سرحدی گاندھی کے نام سے مشہور ہیں چند گنتی کے آدمیوں میں سے ہیں جنھوں نے عدم تشدد کو وقتی غرض کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے قلب اور روح کے تقاضے سے اختیار کیا تھا۔ اس لیے انھوں نے اس کی آب و تاب کو سیاسی مصلحت کا زنگ

نہیں لگنے دیا۔ اور اس سے اسی طرح کام لیا جیسے گاندھی جی چاہتے تھے
شاید کہنے والے یہ کہیں کہ سرحد میں اہنسا کا ظہور محض ایک وقتی چیز
تھی۔ آج اہنسا کہاں ہے؟ اور ایک سرحد ہی پر کیا موقوف ہے ہندوستان
میں بھی تو کہیں نظر نہیں آتی۔

مگر یہ نظروں کی کوتاہی ہے۔ اہنسا آج بھی اس برصغیر میں جو کل تک
ہندوستان کہلاتا تھا اس سرے سے اُس سرے تک موجود ہے۔ مگر کہاں؟
وہیں جہاں پہلے تھی — خدا کے چند نیک بندوں کے دلوں میں صرف اتنی
بات ہے کہ ارباب سیاست جنھوں نے اُسے عارضی مصلحت سے اختیار
کیا تھا آج اس کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ اس لئے وہ ایک عام تحریک کی
حیثیت سے دکھائی نہیں دیتی۔ مگر اب بھی وہ ایک قوت ہے اور جھوٹ
نفرت، تعصب، ظلم کی قوتوں کا مقابلہ کر رہی ہے۔

بہرحال پٹھانوں کو اہنسا کا پیام پہنچانے کی یہ داستان جو پیارے لال
جی نے لکھی ہے بڑی دلچسپ اور سبق آموز ہے مجھے یقین ہے کہ پڑھنے
والے اس سے صرف لطف ہی نہیں بلکہ فائدہ بھی اٹھائیں گے۔

جامعہ نگر
۲۴ ستمبر ۵۰ء

ذاکر حسین
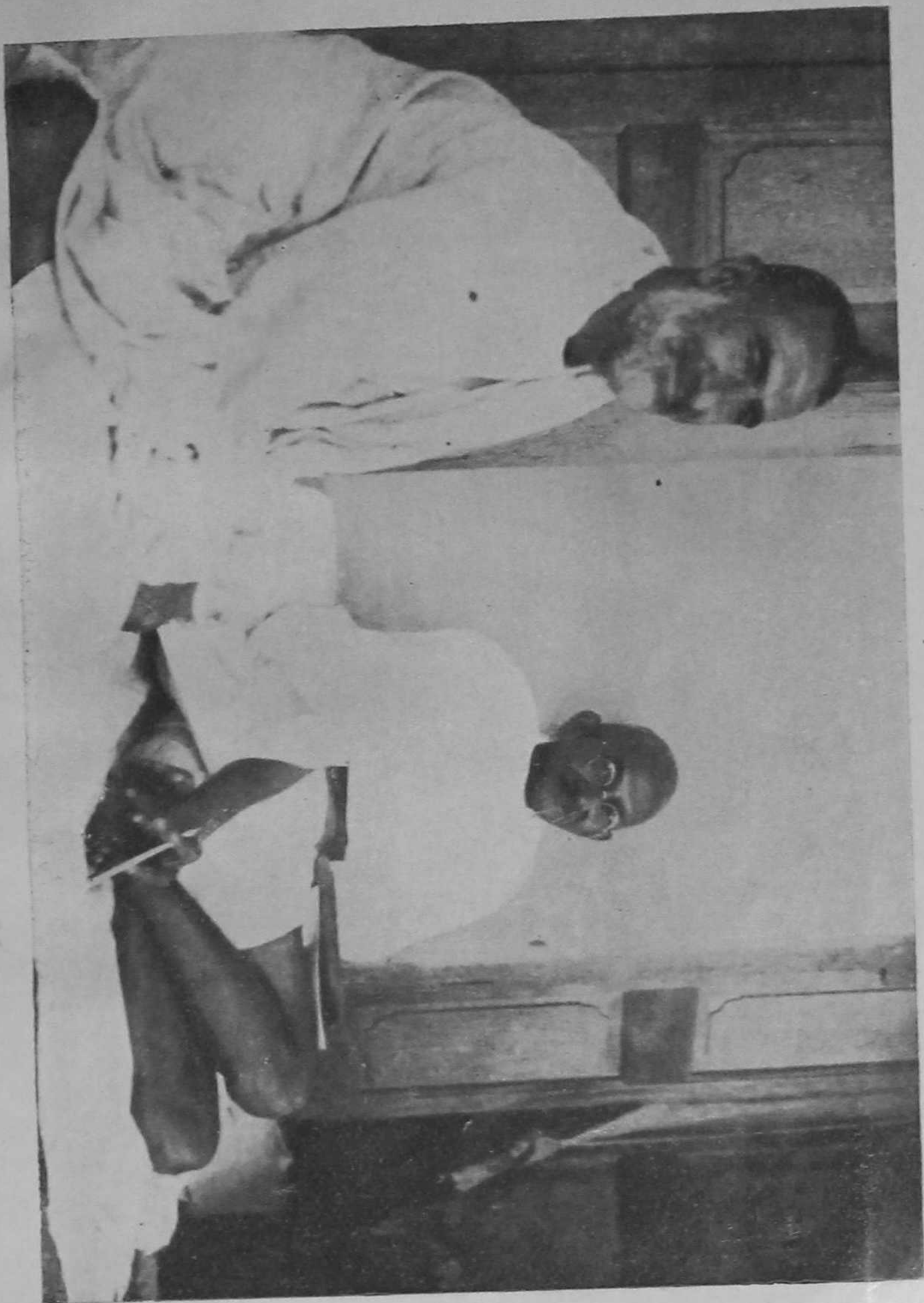
باپو کے قلم سے:—

خدائی خدمتگار اور بادشاہ خان

خدائی خدمت گار کچھ بھی ہوں اور بعد میں کچھ بھی نکلیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کے رہنما، جن کو انھوں نے بادشاہ خان کا خطاب دیا ہی، خدا کے ایک سچّے خادم ہیں۔ ان کا عقیدہ ہی کہ خدا حیّ و قیّوم ہی اور انھیں معلوم ہی کہ ان کی تحریک صرف اُسی کی مرضی سے کامیاب ہوسکتی ہی۔ انھوں نے اپنے آپ کو اس مقصد میں فنا کر دیا ہی اس لیے اب آگے کی انھیں کوئی پروا نہیں رہی۔ وہ سمجھ گئے ہیں کہ عدم تشدد کو اپنائے بغیر پٹھانوں کے لیے نجات کا کوئی راستہ نہیں، اور یہ اُن کے لیے کافی ہی۔ وہ اس بات پر فخر نہیں کرتے کہ پٹھان بہت اچھا لڑنے والا ہی۔ وہ اس کی بہادری کی قدر کرتے ہیں لیکن اُن کے خیال میں اُسے ضرورت سے زیادہ

تعریف کرکے بگاڑ دیا گیا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ پٹھان سماج کا غنڈہ بنے۔ وہ مانتے ہیں کہ پٹھان کو جاہل رکھا گیا ہے، اور اُس کی جہالت سے ناجائز فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ پٹھان اور بھی زیادہ بہادر بنے اور اس کے ساتھ ساتھ سچا گیان (علم) بھی حاصل کرے اور ان کے نزدیک یہ چیز صرف عدم تشدد سے حاصل ہو سکتی ہے۔

چونکہ بادشاہ خاں میری اہنسا پر اعتقاد رکھتے ہیں، اس لیے اُن کی خواہش تھی کہ جتنے دن ہو سکے میں خدائی خدمت گاروں میں رہوں وہاں جانے کے لیے مجھے کوئی لالچ دینے کی تو ضرورت تھی ہی نہیں کیوں کہ میری تو خود ہی یہ خواہش تھی کہ خدائی خدمت گاروں کو جان لوں۔ میں ان کے دِلوں تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں اس میں کامیاب ہو گیا۔ ہاں اس کی کوشش ضرور کی ہے۔

یہ بیان کرنے سے پہلے کہ میں نے اپنا کام کس طرح شروع کیا اور کیا کیا کام کیے، مجھے چند لفظ بادشاہ خاں کے بارے میں کہنے چاہئیں۔ میرے میزبان کی حیثیت سے، سارے دورے میں ان کو ایک ہی فکر رہی اور وہ یہ

تھی کہ جہاں تک ممکن ہو مجھے آرام ملے۔ مجھے تکلیف اور زحمت سے بچانے کے لئے انھوں نے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی۔ وہ پہلے ہی جان لیتے تھے کہ مجھے کیا چاہیئے اور جو کچھ بھی کرتے نہایت خاموشی سے کرتے تھے۔ اُن کے لیے یہ باتیں بالکل قدرتی تھیں۔ ان کا ہر کام خلوص سے ہوتا ہے۔ بناوٹ اُن کی فطرت ہی میں نہیں اور ظاہرداری کا وہ نام بھی نہیں جانتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی خاطرداری کبھی تکلیف دہ نہیں ہوتی، کبھی آنکھوں میں چبھتی نہیں۔ اس لیے جب ہم ٹیکسلا میں ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تو ہماری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جب ہم جدا ہوئے تھے تو ہمیں یہ امید تھی کہ آئندہ مارچ میں شاید پھر ملیں گے۔ سرحدی صوبہ تو میرے لیے تیرتھ استھان ہے، جہاں مجھے بار بار جانا چاہیئے۔ کیونکہ خواہ بقیہ ہندوستان سچی اہنسا کا مظاہرہ کرنے میں کامیاب نہ ہو، لیکن اس بات کی کافی امید ہے کہ سرحدی صوبہ عدم تشدد کی سخت سے سخت آزمائش میں کامیاب ہوگا۔ وجہ صاف ہے۔ بادشاہ خاں کے پیرو جن کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زیادہ

ہی، اپنے رہنما کا حکم دل سے مانتے ہیں، ان کی جنبشِ لب
کے منتظر رہتے ہیں۔ اِدھر ان کے منہ سے بات نکلی اور اُدھر
اس پر عمل ہوا۔ بادشاہ خاں کی اتنی عزت دل میں رکھتے
ہوئے بھی خدائی خدمت گار تعمیری اہنسا کے امتحان میں
کامیاب ہوں گے یا نہیں یہ ابھی دیکھنا ہے۔

پیارے لال تو سرحدی صوبے کے دورے کا ٹھیک ٹھیک
حال لکھتا ہی رہا ہے پھر بھی یہ ضروری ہے کہ وہاں جو کچھ
ہوا اُسے میں اپنے ڈھنگ سے بتاؤں چاہے اس میں
بات کو دُہرانے کا خطرہ ہو۔

شروع ہی میں میں نے اور خان صاحب نے یہ
فیصلہ کر لیا کہ الگ الگ مرکزوں میں جا کر سب خدائی
خدمت گاروں سے بات چیت کرنے سے یہ بہتر ہوگا
کہ اُن کے افسروں یا عہدہ داروں سے مل لیں۔ اس سے
میری کافی محنت بچ جائے گی اور یہی اس کا سب سے
زیادہ دانش مندانہ استعمال ہوگا۔ اور واقعی ایسا ہی ثابت
ہوا۔ پانچ ہفتے جو اس دورے میں صرف ہوئے اُن
میں ہم سب مرکزوں میں گئے اور ہر جگہ بات چیت میں

اس بہادری کو قائم رکھیں اور جب موقع پڑے اس کا ثبوت دینے کے لئے تیار رہیں۔ جو آدمی واقعی بہادر ہے اُسے ایسے موقعے بغیر تلاش کے کافی مل جاتے ہیں۔

اہنسا کوئی بے جان چیز نہیں ہے۔ یہ سب سے بڑی طاقت ہے جو خدا نے انسان کو عطا کی ہے۔ اہنسا ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ ہر انسان میں قدرتی طور پر موجود ہوتی ہے لیکن اکثر لوگوں میں یہ طاقت سوئی ہوئی ہوتی ہے۔ شاید عدم تشدد اہنسا کا پورا مفہوم ادا نہیں کرتا، بلکہ خود لفظ اہنسا بھی ان چیزوں کا ایک نامکمل نام ہے جو اس کے اندر داخل ہیں۔ محبت یا خیر اندیشی کا لفظ اس مفہوم کو زیادہ اچھی طرح ادا کرے گا۔ تشدد کا جواب نیکی سے دینا چاہیئے اور نیکی تبھی مزا دیتی ہے جب اس کے مقابلے میں بدی کھڑی ہو۔ بھلوں سے بھلائی کرنا برابری کا سودا ہے۔ روپے کے بدلے روپیہ رکھ دینا کوئی خاص خوبی نہیں۔ خوبی تو یہ ہے کہ ایک آنے کے مقابلے میں ایک روپیہ رکھا جائے۔ اسی لیئے بھلائی چاہنے والے کا امتحان اُسی وقت ہوتا ہے۔ جب وہ بُرائی چاہنے والے کا مدمقابل ہو۔ یہ

اہنسا یا خیر اندیشی ہمیں صرف انگریزوں کے ساتھ لڑنے ہی میں نہیں برتنی چاہیئے بلکہ آپس کے برتاؤ میں بھی اس کا پورا پورا استعمال کرنا چاہیئے۔ ہوسکتا ہے کہ انگریزوں کے مقابلے میں اہنسا سے کام لینا ایک لاچاری کی خوبی ہو۔ لوگ آسانی سے اسے اپنی بزدلی یا کمزوری کا پردہ بنا سکتے ہیں، یا محض مصلحت کی خاطر اختیار کر سکتے ہیں، اور اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہمیں ہنسا اور اہنسا میں سے کسی ایک کو پسند کرنے کا یکساں موقعہ ملے اور ہم اہنسا کو چنیں تو اسے محض ایک کام چلانے کی ترکیب سمجھ کر استعمال نہیں کر سکتے۔ ایسے موقع خانگی زندگی میں، آپس کے برتاؤ میں سماجی اور سیاسی تعلقات میں اکثر آتے ہیں۔ نہ صرف ایک مذہب کے دو فرقے بلکہ مختلف مذہبوں کے لوگ بھی ایک دوسرے کے ساتھ اہنسا کا برتاؤ کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنے ہمسایوں اور برابر کے لوگوں کی بات کو برداشت نہ کر سکیں تو انگریزوں کے ساتھ بھی سچی رواداری نہیں برت سکتے۔ اس لئے اگر ہمارے اندر دوسروں کی خیر اندیشی کا ذرا سا بھی مادہ ہے تو اس کا روزمرہ امتحان ہوتا رہے گا۔ اور اگر

ہم اس پر عمل کرنے کے عادی ہو گئے تو اس سے وسیع تر میدانِ عمل میں بھی ہمیں اس کے استعمال کی عادت پڑ جائے گی یہاں تک کہ یہ ہماری فطرت ثانیہ بن جائے گی۔

بادشاہ خان نے انھیں خدائی خدمت گاروں کا جو نام دے رکھا ہے، اسی سے ظاہر ہے کہ ان کا کام بنی نوع انسان کی خدمت کرنا ہے، انھیں نقصان پہنچانا نہیں۔ کیونکہ خدا تو نہ اپنے لیے کسی خدمت کا خواہاں ہے اور نہ کوئی ذاتی کام لیتا ہے۔ وہ خود اپنے بندوں کی خدمت کرتا ہے اور اس کے عوض کچھ مانگتا نہیں۔ اس کی ہستی اور چیزوں کی طرح اس معاملے میں بھی بے مثل ہے۔ اس لیے خدائی خدمت گار کی بھی سچی آزمائش اسی سے ہوگی کہ وہ خدا کے بندوں کی کتنی خدمت کرتا ہے۔

خدائی خدمت گاروں کی اہنسا اُن کے روزمرہ کے کاموں میں جھلکنی چاہیئے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اُن کے قول، خیال اور عمل میں اہنسا ہی اہنسا بھری ہو۔ جیسے اُس شخص کو، جو اپنے روزمرہ کے کاموں میں تشدد کی طاقت پر بھروسا کرتا ہے، فوجی ٹریننگ لینی پڑتی ہے،

اسی طرح ایک خدائی خدمت گار کو ایک خاص قسم کی تربیت حاصل کرنی ہوگی۔ اس کا انتظام سنہ ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے خاص اجلاس میں ایک تجویز کے ذریعے کیا تھا۔ آگے چل کر اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ ضابطہ کبھی کم زور نہیں ہوا۔ ہماری خیراندیشی جیتی جاگتی ہے کہ نہیں اس کے امتحان کے لیے چار خاص چیزیں رکھی گئیں :۔ فرقہ وارانہ اتحاد، ہندوؤں میں چھوت چھات کا مٹانا، کروڑوں انسانوں کے ساتھ اتحاد کی سچی نشانی کے طور پر گھروں میں ہاتھ سے کتے ہوئے سوت کی کھادی بننا اور اس کو استعمال کرنا اور شراب بندی۔ اس چہار پہلو پروگرام کو تہذیب نفس اور ملک کی حقیقی آزادی کے حصول کا یقینی طریقہ بتایا گیا تھا۔ کانگریسی اور عام لوگ اس پروگرام کو بے دلی سے چلا رہے ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یا تو انھیں اہنسا پر سچا عقیدہ نہیں یا جو طریقہ اس پر عمل کرنے کا رکھا گیا ہے اس پر بھروسہ نہیں، یا دونوں کو نہیں مانتے۔ لیکن خدائی خدمت گاروں کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس پر عقیدہ رکھتے ہیں۔

اس لیے ان سے یہ توقع ہے کہ اپنی صفائی قلب کے لئے
کانگریس کے بنائے ہوئے تعمیری پروگرام پر پورا پورا عمل
کریں گے۔ میں نے اس میں گاؤں کی صفائی، حفظان صحت
اور فرسٹ ایڈ کو بھی شامل کر دیا ہے۔ ایک خدائی خدمتگار
اپنے کاموں سے پہچانا جائے گا۔ اگر وہ کسی گاؤں میں ہو
تو یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اس کی صفائی نہ کرے اور گاؤں
والوں کو عام بیماریوں سے بچنے میں مدد نہ دے۔ ہسپتال
وغیرہ تو امیروں کے کھلونے ہیں اور صرف شہر والوں
کے لئے ہوتے ہیں۔ بے شک کوشش کی جا رہی ہے کہ
ملک میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے دواخانے قائم ہو جائیں،
لیکن ان کے اخراجات ہماری حیثیت سے زیادہ ہیں۔
خدائی خدمتگار تھوڑی سی لیکن ٹھوس ٹریننگ کے بعد
بڑی آسانی سے گاؤں کے زیادہ تر مریضوں کو عام طور پر
مدد پہنچا سکے گا۔

میں نے خدائی خدمتگاروں کو بتایا کہ سول نافرمانی
عدم تشدد کا پہلا قدم ہے آخری نہیں۔ یہ جانتے ہوئے
بھی میں نے ۱۹۱۸ء میں اس ملک میں غلط مقام سے

کام شروع کیا۔ میں حالات سے مجبور ہو گیا تھا۔ مگر اس سے ملک کو نقصان نہیں ہوا کیوں کہ عدم تشدد کے طریقِ عمل کے ایک ماہر کی حیثیت سے میں جانتا تھا کہ کب اور کیسے ہمیں اپنے قدم پیچھے ہٹا لینے چاہئیں۔ پٹنہ میں سول نافرمانی کو بند کرنا اس طریقِ عمل کا ایک جزو تھا۔ مجھے پٹنے میں بنائے ہوئے تعمیری پروگرام پر اب بھی اُتنا ہی اعتقاد ہے، جتنا کہ اس وقت تھا۔ میں مکمل آزادی کے لئے سول نافرمانی کر ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ ہم تعمیری پروگرام پر جیسا چاہیئے عمل نہ کریں۔ سول نافرمانی کا حق انھیں کو مل سکتا ہے جو اپنے یا دوسروں کے بنائے ہوئے قاعدوں پر عمل کرنا فرض سمجھتے ہیں اور عمل کرتے ہیں۔ قواعد کی پابندی خلاف ورزی کی سزا کے خوف سے نہ ہونی چاہیئے نہ محض عادت کے طور پر بلکہ دل سے اور فرض سمجھ کر ہونی چاہیئے۔ جب تک یہ پہلی شرط پوری نہ ہو، سول نافرمانی محض نام کی 'سول' ہوگی۔ وہ طاقتور کا ہتھیار نہیں بلکہ کمزور کی مصلحت یا حکمتِ عملی ہوگی۔ اس میں اہنسا یا خیر اندیشی نام کو بھی نہ ہوگی۔ خدائی خدمت گاروں نے سول نافرمانی

کی تحریک میں دوسرے صوبوں کے ہزارہا لوگوں کی طرح سختیاں برداشت کر کے اپنی بہادری کا وہ ثبوت دیا ہو جس میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ دلی خیر اندیشی کا یقینی اور پختہ ثبوت نہیں ہو۔ اور یہ تو ایک پٹھان کے لئے ذلت کی بات ہوگی کہ اس میں صرف ظاہری عدم تشدد ہو۔ اس لیے پٹھان میں تو کم زوری آنی ہی نہیں چاہیئے۔

جو کچھ میں نے کہا خدائی خدمت گاروں نے بڑے غور سے سُنا۔ یہ صحیح ہو کہ عدم تشدد پر اُن کا عقیدہ بادشاہ خان کی وجہ سے ہو، اور انھیں سے حاصل کیا گیا ہو، تاہم جب تک وہ اپنے رہنما پر کامل اعتماد رکھتے ہیں اور وہ اُن کے دلوں پر پوری پوری حکمرانی کرتا ہے تب تک اُن کے عدم تشدد کو ادھورا یا بے جان نہیں کہا جا سکتا اور بادشاہ خان کا عقیدہ کوئی زبانی چیز نہیں ان کا تو سارا دل اسی میں لگا ہو۔ جن کو شک ہو وہ اُن کے ساتھ رہ کر دیکھیں جیسے میں ان پانچ قیمتی ہفتوں میں رہا ہوں، اُن کے شکوک اس طرح دور ہو جائیں گے جیسے آفتاب کے نکلنے سے غبار چھنٹ جاتا ہو۔

دورے کے آخری دنوں میں مجھے ایک پٹھان ملے۔ ان پر میرے سارے دورے کا جو اثر ہوا اُس کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا: "جو کچھ آپ کر رہے ہیں، مجھے پسند ہے۔ آپ بہت چالاک ہیں (شاید "مکّار" کا لفظ ان کے مطلب کو زیادہ صحیح طور پر ادا کرتا ہو) آپ ہماری قوم کے لوگوں کو زیادہ بہادر بنا رہے ہیں۔ آپ انھیں اپنی طاقت کو بچا کر رکھنا سکھا رہے ہیں۔ بے شک یہ اچھا ہے کہ کچھ حد تک آدمی عدم تشدد پر قائم رہے۔ آپ کی تعلیم سے وہ ایسا کریں گے۔ تشدد کے استعمال کے بغیر تشدد سے کیونکر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اس فن کو ہٹلر نے کمال تک پہنچا دیا ہے۔ لیکن آپ ہٹلر کے بھی اُستاد نکلے۔ آپ ہماری قوم کو عدم تشدد کی تعلیم دے رہے ہیں۔ مارے بغیر مر جانا، تاکہ جب کبھی تشدد کے استعمال کا موقع آئے تو وہ اُسے پہلے سے کہیں زیادہ زور کے ساتھ استعمال کر سکیں اور یہ طے شدہ امر ہے کہ وہ اسے دوسروں سے زیادہ قابلیت سے استعمال کریں گے۔ میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔"

میں خاموش رہا۔ مجھے اتنی جرأت نہ ہوئی کہ اس کا جواب

دے کر اُن کے اس وہم کو دور کردوں۔ میں صرف مسکرادیا اور سوچ میں پڑگیا۔ مجھے یہ تو اچھا لگا کہ پٹھان میری تعلیم کی وجہ سے پہلے سے زیادہ بہادر ہوجائیں گے۔ ایسے کسی شخص سے میں واقف نہیں جو میرے اثر کی وجہ سے بُزدل بن گیا ہو۔ لیکن ان دوست نے اس سے جو نتیجہ نکالا وہ بہت زہریلا ہی۔ اگر آخری آزمائش میں خدائی خدمت گار اس عقیدے کو بھول گئے، جس کے ماننے کا وہ اقرار کرتے ہیں تو یقینی بات ہی کہ وہ اہنسا کو دل سے نہیں مانتے، اس کا ثبوت جلد ہی مل جائے گا۔ اگر وہ تعمیری پروگرام پر جوش اور صداقت کے ساتھ عمل کریں گے تو ان پٹھان دوست نے جس خطرے کا اظہار کیا ہی وہ کبھی پیش نہیں آسکتا۔ اس کے برعکس آزمائش کے وقت وہ سب سے بڑے بہادروں کی صف میں نظر آئیں گے۔

۱۱ر نومبر ۱۹۳۸ء

موہن داس کرم چند گاندھی

پیش لفظ

پچھلے سال گاندھی جی کی اَلم ناک وفات کے بعد ہمارے کئی محترم نیتاؤں اور عزیز دوستوں اور ساتھیوں نے جن کو گاندھی جی کا خاندان کہا جاسکتا ہی مجھ سے کہا کہ میں ان کی کمل اور مستند سوانح عمری لکھنے کا مقدس فرض ادا کردوں۔ اس کتاب کا خاکہ ۶ر مارچ ۱۹۴۹ء کے ہریجن میں شائع ہوا تھا۔ مگر نواکھالی میں گاندھی جی نے جو کام میرے اور دوسرے ساتھیوں کے سپرد کیا تھا اس کو پورا کرنے میں مجھے دس مہینے لگ گئے۔ اس کے بعد دوسرے ضروری ابتدائی کاموں میں کچھ اور وقت لگ گیا۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے کہ سب جزئیات کے تکمیل ہونے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ نوجیون ٹرسٹ کی سرپرستی میں جو اس سوانح عمری کو چھاپے گا کام شروع کردیا جائے۔

مکمل سوانح عمری شائع کرنے سے پہلے جو وقت ملا وہ میں نے گاندھی جی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر چھوٹی چھوٹی کتابیں تیار کرنے میں صرف کیا۔ خصوصاً ایسی کتابیں جو اُن کے آخری دنوں کے واقعات سے تعلق رکھتی ہوں۔ یہ اس سلسلے کی پہلی کتاب ہی۔ دوسری اُن کے

"کرو یا مرو" والی مشن کے بارے میں ہوگی جس کے ذریعے وہ نواکھالی میں امن قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ تیسری کتاب میری بہن ڈاکٹر سوشیلا کی ڈائری ہے جو انھوں نے آغا خاں پیلیس میں گاندھی جی کے ساتھ اکیس مہینے کی نظر بندی کے زمانے میں لکھی۔ اس کو ستا ساہت منڈل کناٹ سرکس۔ نئی دہلی شائع کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا گجراتی ترجمہ نوجیون پریس۔ احمد آباد سے شائع ہوگا۔

ان کتابوں کو پہلے شائع کرنے کی ایک خاص وجہ ہے۔ دنیا کو جوہری قوت نے چیلنج دیا ہے اس کا گاندھی جی کی طرف سے جواب ان کتابوں میں موجود ہے۔ ہمارے سامنے یہ اہنسا کے نظریے اور عمل کو جن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے گاندھی جی نے خاص طور سے اپنی زندگی کا آخری حصہ وقف کر دیا تھا تفصیل سے پیش کرتی ہیں۔ ان کا لب لباب گاندھی جی کی مکمل سوانح عمری میں شامل کر دیا جائے گا۔

میں خاص طور سے مسٹر آرتھر مور اور مسٹر ہورس الگزینڈر کا مشکور ہوں جنھوں نے نہایت خوشی سے اس مسودہ پر نظر ثانی کرنا منظور کیا۔ میں ان فوٹوگرافروں کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے اس کتاب میں اپنے فوٹو شامل کرنے کی اجازت دی اور آخر میں ان دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی مدد کے بغیر شاید یہ کتاب کبھی شائع نہ ہو پاتی۔

ہریجن کالونی
کنگس وے۔ دہلی
یکم جنوری ۱۹۵۶ء

پیارے لال

تمہید

۱۹۳۸ء کے موسم خزاں میں گاندھی جی ایک عرصے تک صوبہ سرحد میں ٹھیرے اور خان عبدالغفار خاں صاحب کے ساتھ صوبے کا دورہ کیا۔ یہ گاندھی جی کے لیے ایک پرانی آرزو کی تکمیل تھی۔ اس یادگار سفر میں روح کا جو اہتزاز گاندھی جی سے ظاہر ہوتا تھا اسے میں کبھی نہ بھول سکوں گا۔ اس کے مشاہدہ کا شرف بڑا ہی قیمتی شرف تھا۔

میں نے اس زمانے میں اس دورہ کی داستان اخبار ہری جن کے ایک سلسلۂ مضامین میں شائع کی تھی لیکن خاں صاحب کی خواہش تھی کہ اس دورے میں گاندھی جی نے جو کچھ فرمایا ہو خصوصاً خدائی خدمتگاروں کے سامنے انھوں نے عدم تشدد پر جو کچھ کہا ہو وہ سب کا سب اصل صورت میں پبلک تک پہنچ جائے۔ لیکن میں دوسرے کاموں میں پھنسا رہا اور ان بابرکت اور پرمسرت ایام کی کیفیت کو اس پس منظر سے دور جہاں وہ پیدا ہوئی تھی، پھر اپنے اوپر طاری نہ کر سکا۔ لیکن دو مرتبہ جیل جانے کے بیچ میں خرابیٔ صحت کی وجہ سے جو مختصر سا وقفہ ملا اس میں اس کام کی تکمیل کا موقع نکل آیا اور مجھے بڑی خوشی ہے کہ اس

فرض کو جس کے ادا کرنے کا بوجھ مجھ پر عرصے سے تھا اب ادا کر رہا ہوں۔

یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ (پہلے حصے میں "ہریجن" کے بارہ مضمون تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ درج ہیں ان سے پس منظر سمجھ میں آجائے گا۔ دوسرے حصے میں گاندھی جی کے اپنے ارشادات ہیں)

اس کتاب کی اشاعت کے لیے یہ زمانہ کچھ ناموزوں نہیں ہے۔ میں جو دو مرتبہ ناگپور جیل میں کانگریس کی جنگ میں شرکت نہ کرنے والی تحریک کے سلسلے میں قید رہا تو مجھے سی، پی کے کئی قومی کام کرنے والوں اور سیاسی رہنماؤں سے قریبی میل جول کا موقع ملا۔ یہ سب ستیہ گرہی تھے، اس لیے سب کے سب عدم تشدد کی نظری اور عملی حیثیت دونوں میں خاص دلچسپی رکھتے تھے، بار بار نت نئے سوال اٹھتے تھے اور وہ جواب چاہتے تھے، بحثیں اور مناظرے ہوتے تھے، جو کبھی کبھی تو ہفتوں چلتے تھے، مجھے بڑا اچنبھا ہوا یہ دیکھ کر کہ تقریباً سب ان سوالوں کا خیال گاندھی جی نے پہلے سے کر لیا تھا اور خدائی خدمت گاروں سے جو گفتگوئیں انھوں نے کی تھیں ان میں ان سب کا جواب دے دیا تھا۔ میرا تو خیال ہے کہ عدم تشدد کے طریق کار پر ان گفتگوؤں سے زیادہ مکمل اور کوئی کتاب نہ ملے گی۔

لیکن یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ صوبۂ سرحد میں گاندھی جی کو عدم تشدد کا مسلک ایسے لوگوں کے سامنے پیش کرنا تھا جن میں یہی نہیں کہ عدم تشدد کی روایات موجود نہیں بلکہ جن کی پچھلے دو

ہزار سال کی تاریخ اس مسلک کے بالکل خلاف ہی۔ ایسے لوگ جن کے لیے عدم تشدد کسی ایسی چیز کی توسیع کا نام نہ تھا جو ان میں پہلے سے پائی جاتی تھی، بلکہ اب تک جو کچھ ان کے پاس تھا اور جیسا کچھ ان کا عمل تھا وہ اکثر و بیشتر اس اصول کی ضد تھا۔ اس لئے انھیں اس مسلکے کی الف۔ بے سے شروع کرنا ضروری تھا اور اپنے دلائل کو ایسی سادہ سے سادہ شکل میں پیش کرنا تھا کہ بچہ بھی انھیں سمجھ سکے۔ گاندھی جی نے خدائی خدمت گاروں کے سالاروں سے جو کچھ کہا تھا اور جو ان تقریروں کا مغز ہی، اس میں انھوں نے ایک تشریح اعضا کے ماہر کی طرح عدم تشدد کی ماہیت اور اس کی بناوٹ کی تفصیلوں کو وہاں تک پرت پرت کھول کر سامنے رکھ دیا ہے کہ آخر میں آپ ان روحانی سرچشموں تک پہنچ جاتے ہیں جو اس الٰہی قوت سے پھوٹتے ہیں جو روحِ انسانی میں پوشیدہ ہیں۔

گاندھی جی کا یہ دورہ اس وقت ہوا جب دنیا پر میونک کے واقعہ کا سایہ پڑ رہا تھا۔ پڑھنے والے دیکھیں گے کہ اپنے ارشادات میں گاندھی جی نے بہیمی قوت کے مقابلے کے لیے (جس کا ایک مظہر یہ واقعہ بھی تھا) اپنے پیام کی عالمی اہمیت کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اور باتوں سے قطع نظر عدم تشدد کا ہتھیار اسی وقت کام دے سکتا ہی جب کہ وہ قوت جو مقابلہ میں ہو اخلاقی اثرات کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو، لیکن

اگر کسی طاقت نے اپنی ہر شعبۂ زندگی میں جاری وساری بے رحمی و سفاکی اور پروپیگنڈا سے اپنے آپ کو تمام وکمال دنیا کی رائے کے اثر یا اور ہر اخلاقی اثر سے "مامون" کر لیا ہو تو پھر یہ ہتھیار کسی کام نہیں آتا۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ جرمن یہودیوں کی مثال بتاتی ہے کہ اگر وہ ستیہ گرہ کرتے تو موجودہ نازی حکمرانوں کو اس میں ذرا تامل نہ ہوتا کہ وہ چند لاکھ یہودیوں کو مشین گن سے اس طرح مار کر کھپا دیتے جیسے کیڑے مکوڑوں کو مارا جاتا ہے اندریں حالات ساری شورش اور شورش کرنے والوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جاتا۔

یہ نکتہ چیں بھول جاتے ہیں کہ عدم تشدد اپنے عمل اور اپنی کامیابی کے لئے کسی شکل میں بھی ظالم کی تائید کا محتاج نہیں ہوتا۔ یہ تو تمام خارجی اثرات سے بے نیاز ہوتا ہے۔ مثلاً اس میں نیرو NERO کی قوت ارادی کی کمزوری نہ تھی نہ خود اعتمادی کی کمی کہ وہ اس "تاریک، حقیر، توہم پرست ارتداد" کو — جیسا کہ اس وقت عیسائیت کو سمجھا جاتا تھا — یک قلم مٹا سکتا ہے، جس نے اس کے ہاتھ کو اس وقت روکا تھا جب اس نے روم کے شبینہ کھیلوں میں روشنی کے لئے عیسائیوں کو زندہ جلانے کا کام شروع کیا تھا یا روما کے چھٹیوں والے ہجوموں کی تفریح کی غرض سے عیسائیوں کو خونی پہلوانوں اور بھوکے شیروں کے سامنے کولوسیم میں پھینکا جاتا تھا۔ عیسائیوں کو وبا کے کیڑوں کی

طرح فنا کر دینا ایک بڑا قابل تعریف اور نیک کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔
اس لیے کہ عوام کے تخیل میں یہ لوگ خود اپنی ذات سے ناپاک بغاوت
کے پتلے تھے، ریاست کے بھی دشمن اور سچے دین کے بھی۔ یہودیوں
کے خلاف گوئے بلز اور اشترائشر کی کوئی اشتعال انگیز تقریر شدت
اور نفرت میں مندرجہ ذیل الفاظ سے زیادہ تو نہیں ہو سکتی جو
اناطول فرانس نے پانٹیس پائلیٹ PONTIOS PILATE کی زبان
سے ادا کرائے ہیں جن سے ابتدائی عیسائیوں کے ساتھ رومی
حکام کے تاریخی رویہ کی سچی تصویر سامنے آجاتی ہے:۔

"ہم اُن پر حکومت نہیں کر سکتے، لہٰذا ہم مجبور ہوں گے کہ انھیں
تباہ کر دیں اور اس میں کوئی ذرا شک نہ کرے۔ یہ ہر دم ایک
نافرمانی کی سی حالت میں رہتے ہیں، ان کے مشتعل دماغوں میں ہمیشہ
بغاوت کا سودا پکتا رہتا ہے، یہ ایک دن ہم پر اس شدت سے
پھٹ پڑیں گے کہ اس کے سامنے نومیڈوں NUMIDIANS
کا غصہ اور پارتھیوں PARTHINS کا بلبلانا بچوں کا کھیل
معلوم ہوگا۔ یہ لوگ چھپے چھپے موہوم امیدوں کی پرورش کرتے ہے
ہیں اور اپنے جنون میں ہماری تباہی کے خواب دیکھ رہے ہیں،
اور کیوں نہ ہو جب کہ ایک غیبی آواز کے بھروسے پر یہ اس
توقع میں زندگی کاٹتے ہیں کہ خود ان کا ایک خون شریک شہزادہ
آئے گا اور اس کی حکومت سارے سنسار میں ہوگی۔ ان جلیبوں

کے ساتھ کوئی ادھوری بات تو چل ہی نہیں سکتی۔ انھیں تو بس نیست و نابود ہی کر دینا چاہیئے، بیت المقدس کو بنیادوں سے مسمار کر دینا چاہیئے۔ میں ہوں تو بوڑھا مگر کیا عجب ہے کہ مجھے بھی وہ دن دیکھنا نصیب ہو جب اس کی دیواریں گریں اور اس کے گھروں سے آگ کے شعلے اٹھتے ہوں، اس کے باشندے تلوار کے گھاٹ اتر رہے ہوں اور جہاں کبھی عبادت گاہ تھی وہاں ہل چلا کر نمک کی کھاد بکھیری جاتی ہو۔ اس دن میں سمجھ لوں گا کہ میں حق پر تھا"[۱]

یہ بھی نہ تھا کہ ان ابتدائی عیسائیوں کی تعداد اتنی کثیر ہو یا اور کسی حیثیت سے اتنی اہمیت رکھتے ہوں کہ رومی ظالموں کے خلاف "تنگ کرنے والی تدبیریں" اختیار کر سکتے ہوں۔ اور رومیوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم بھی تھی۔ اگر انھوں نے واقعی فیصلہ کر لیا ہوتا کہ عیسائیوں کو فنا ہی کر دیں تو کوئی چیز انھیں اس سے باز رکھنے والی نہ تھی۔ مگر پھر بھی انھوں نے ایسا نہیں کیا، نہ وہ ایسا کر سکتے تھے۔ اناطول فرانس نے، جس کے شاہکار سے ہم اوپر بھی ایک عبارت نقل کر چکے ہیں، بڑی خوبی سے رومی شہنشاہی دماغ کی اس گتھی کا خلاصہ پیش کیا ہے جو اس زچ کر دینے والے مظہر نے اس کے اندر پیدا کر دی تھی، لکھتا ہے :۔

---

[۱] ANATOLE FRANCE: THE PROCURATOR OF INDIA

اصبانی آس! تم نے تو خود اپنے سپاہیوں کی ضربوں سے سیدھے سادے انسانوں کو مرتے دیکھا ہی جو کسی ایسے مقصد کے لئے جان دیتے ہیں جسے وہ حق جانتے ہیں۔ یہ مرجاتے ہیں اور اپنے نام تک نہیں بتاتے۔ ایسے انسان ہماری حقارت کے مستحق نہیں ہیں۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ ہر معاملے میں میانہ روی اور توازن دماغی قائم رکھنا پسندیدہ چیز ہے۔ لیکن یہ اقرار ضرور کرتا ہوں کہ میرے دل میں یہودیوں کے ساتھ کبھی بھی ہمدردی کا کوئی خاص جذبہ پیدا نہیں ہوا۔"

اس وقت جو قوت ان کے مقابلے میں تھی وہ اپنی نوعیت میں ایسی نرالی تھی، اور جس قوت کو وہ ہمیشہ سے جانتے اور مانتے تھے اس سے اس قدر مختلف تھی کہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کے ساتھ کریں تو کیا کریں۔ انھیں خبر ہوتے ہوتے یہ ایک پوشیدہ خمیر کی طرح سارے میں سرایت کر گئی تھی، اور اس نے سب کی ماہیت پلٹ دی تھی۔ زندہ جلنے کے لئے خاموشی کے ساتھ جاتے وقت عیسائی شہید کے چہرہ کی فاتحانہ مسکراہٹ پہلے ان لوگوں کو حیرت میں ڈالتی تھی، پھر انھیں سراسیمہ کرنے لگی اور آخر میں تو اس نے ان بہ خود غلط نقش آرا کی خود اعتمادی کو کھوکھلا کر کے بالکل ہی ختم کر دیا تھا، رومی فوج کا فولادی لباس تبر اور نیزہ سے محفوظ تھا مگر اس نازک قوت سے ہرگز محفوظ نہ تھا۔ یہ دھیرے دھیرے

چھپے چھپے امراء اور اشراف کے خاندانوں میں داخل ہوئی اور آخر ایوانِ شاہی تک میں اس نے اپنے قدم جما لیے۔

ذرا اپنے زمانے سے قریب آئیے تو جسمانی زور اور مکاری پر عدم تشدد اور امداد باہمی کی فوقیت کے ثبوت اس مشہور عالم شہزادہ کروپوٹکن نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب "امداد باہمی بہ حیثیت ایک عنصر ارتقاء" میں پیش کیے ہیں، فطرت کے وحشت زار میں بھی جہاں جنگل کا آئین چلتا ہے اور طاقت ور کے تباہ کن رجحانات پر کسی قسم کی روک ٹوک نہیں ہوتی "باقی رہنے کی سب سے زیادہ صلاحیت ان میں نہیں ہوتی جو جسمانی حیثیت سے سب سے طاقتور ہیں، یا سب سے زیادہ چالاک اور مکار ہیں، بلکہ ان میں ہوتی ہے جو اس طرح ملنا سیکھ جاتے ہیں کہ ایک دوسرے کو مدد اور سہارا دے سکیں"۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات بتلانے کے لیے میں نے کافی نقل کر دیا ہے کہ عدم تشدد کے خلاف یہ جو دلیل ہے کہ جدید منظم اور کل زندگی پر حاوی استبدادوں کی بے ضمیری اور سفاکی کے سامنے عدم تشدد نہیں چل سکتا اس میں بڑی خامی اس وجہ سے ہے کہ ہم چیزوں کو ان کے وسیع پس منظر کے ساتھ نہیں دیکھتے اور جماعتی مظاہر کے ان رجحانوں پر نظر نہیں رکھتے جو اپنا اثر ذرا زیادہ دنوں میں دکھاتے ہیں۔
لیکن شک کرنے والا یہ دلیل دے گا کہ چاہے ایک مکمل خیالی

دنیا میں عدم تشدد ٹھیک سہی اور چاہے آج بہتیرے لوگ "اٹلانٹک چارٹر" کے اس مجرد اعلان کی تصدیق کر دیں کہ "روحانی اور مادی دونوں وجوہ سے آخر کار تشدد کا ترک کرنا لازم ہے"۔ پھر بھی انسانی ارتقا کا موجودہ جھکاؤ اس کے خلاف ہی جیسا کہ ساری زندگی پر حاوی ڈکٹیٹروں کے عروج سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ دلیل تبدیلی و تغیر کے اس عمل کو یکسر نظر انداز کر دیتی ہے جس سے کسی صورت حال سے اس کو ضد پیدا ہوا کرتی ہے۔ قدرت کے مظاہر میں ہم صاف دیکھتے ہیں کہ جب قدرت کا کوئی میلان بڑھتے بڑھتے اپنے کمالوں کو پہنچ جاتا ہے تو پھر وہ اس کے لیے تیار ہو چکتا ہے کہ یکایک جیسے ایک چھلانگ مار کر خود کو اپنی ضد میں تبدیل کر دے۔ ہم نے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا ہے کہ جب اسلحہ کی طاقت اپنی انتہا کو پہنچ گئی تو اس نے اپنے کو ہیبت خیزی کے ڈراوے کی شکل میں بدل دیا یعنی "اگر تم یہ جتا سکتے ہو کہ تم میں قتل کرنے کی طاقت ہے تو پھر واقعی قتل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" اس جنگ میں اس نئی تدبیر کو کس مہلک تاثیر کے ساتھ کام میں لایا گیا ہے؟ اس تدبیر سے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ قوموں کی قوموں کو دبا کر غلام بنا لیا جائے اور اسلحہ کے استعمال کی نوبت تک نہ آئے۔ فوجی اقتدار کی آہنی ایڑی تلے مظلوم آبادیاں جوں جوں بڑھتی جاتی ہیں توں توں اس انکشاف کے لئے بھی زمین تیار ہوتی جاتی ہے کہ اگر مظلوم موت کی

طرف سے بے پروا ہو جائیں تو انھیں آزادی حاصل کرنے کے لیے غالباً مرنا نہ پڑے۔ بربادی کے آلات جس قدر تباہ کن ہو جاتے ہیں اسی قدر اس کا امکان بڑھتا جاتا ہے کہ دنیا ان کی طرف سے اپنا منھ پھیر لے اور ان کے مقابل میں ایک اور طاقت کو لا کھڑا کرے جو بالکل ہی دوسری قسم کی طاقت ہو اور جس کے خلاف یہ آلات محض بے بس ہیں یعنی "نہیں" کہنے کی صلاحیت۔ اسلحہ بس تباہ ہی تو کر سکتے ہیں، وہ تم سے اطاعت اور تعاون تو جبریہ حاصل نہیں کر سکتے بشرطیکہ تم میں "نہیں" کہنے کی طاقت ہو۔ اور یہی چیز یعنی تعاون، رضامندی کا ہو یا جبر کا، یہی چیز تو ظلم کو زندہ اور برقرار رکھ سکتی ہے اور اسلحہ کے استعمال کا بھی اصل مقصد تباہی و بربادی نہیں بلکہ اسی تعاون کا حاصل کرنا ہے۔

اس طاقت کی فتح کی سب سے پہلی اور شاید سب سے شاندار تاریخی مثال اس مقابلے میں ملتی ہے جو ٹیکسلا کے میدان میں سکندر اعظم اور ہندوستانی حکیم داند آمی میں ہوا تھا۔ یونانی وقائع نگار اس حکیم کے متعلق لکھتا ہے کہ "اگرچہ بوڑھا تھا اور برہنہ لیکن یہی ایک مدمقابل تھا جو قوموں کے فاتح سکندر کے لیے برابر سے زیادہ تھا" ناظرین اس واقعہ کے داخلی معنی پر ذرا غور کریں۔ اس کے اندر مشرق کا جواب مضمر ہے جو مسیح سے تین سو سال پہلے اس مسلح قوت کو دیا گیا تھا جو مشرق پر حملہ آور ہوئی تھی۔ ہندوستان میں

یونانی قوت کی تاریخ سے اس طریق کار کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔
آج پھر ہمیں اسی قسم کے چیلنج سے واسطہ ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت چیلنج کا۔ اور پھر لوگوں کا دھیان اس آلے کی طرف اور قوت کے اس نہ ختم ہونے والے سوت کی طرف مڑ رہا ہے جو ہندوستان کو خاص طور پر اپنے ماضی سے ورثہ میں ملا ہے اور جس سے امید ہوتی ہے کہ وہ دنیا کی آنے والی ترقی میں ہندوستان کی طرف سے ایک خاص اضافہ ہوگا۔ اس قوت کی جس کو ہندوستان نے پھر سے دریافت کیا ہے ماہیت کیا ہے؟ یہ فرد میں کس طرح پیدا ہو سکتی ہے اور عوام میں اسے کس طرح منظم کیا جا سکتا ہے؟ اس کے لیے کس قسم کے نظم کی ضرورت ہے؟ دوسرے نظاموں سے جو تشدد پر مبنی ہوتے ہیں یہ نظم کس طرح مختلف ہے؟ آس پاس کی دنیا سے اس عدم تشدد کے رویے کا کیا علاقہ ہونا چاہیے، اس لیے کہ آس پاس کی دنیا یہی نہیں کہ بے میل اہنسا کی قائل نہیں بلکہ زیادہ تر اس کی ضد پر یقین بھی رکھتی ہے اور عمل بھی کرتی ہے۔ اہنسا کے ماننے والے کے لئے یہ چند سوالات ہیں جن کا جواب ان صفحات میں ملے گا۔

لیکن اگرچہ انفرادی طور پر اہنسا ماحول سے بے نیاز ہے اور ہر جگہ اس پر عمل کیا جا سکتا ہے مگر اس پر اجتماعی پیمانے پر عمل کرنے کے لیے ایک خاص قسم کا سماج درکار ہے۔ عدم تشدد کا مطالبہ کرنے والے کے لئے دوسرا سوال قدرتی طور پر یہ پیدا ہوتا ہے

کہ جس سماج کی بنا عدم تشدد پر ہو اس کی صورت اور اس کی ذہنیت کیا ہوگی؟ اس 'نئی دنیا' کی کچھ جھلک آپ کو ان مضامین میں ملے گی جو "ٹیکسلا" پر اس کتاب کے پہلے حصے کے آخر میں درج ہیں۔ وہ بڑی ہی دلفریب دنیا ہے، جو کبھی واقعی موجود بھی تھی، سادگی کی دنیا فطری زندگی کی آزادی والی دنیا، ایمان دار اور تن درست محنت کی دُنیا، ایک دنیا جس میں بہت کم قانون تھے مگر جس کا معاشرتی نظام نہایت ترقی یافتہ تھا، ایک دنیا جس میں جنگ و جدل کا خاتمہ ہو چکا تھا، اور رواداری، خصوصاً مذہبی رواداری کا دور دورہ تھا۔ یہ ساری بہار عدم تشدد کے رائی جیسے ننھے بیج سے پیدا ہوئی تھی۔

ان صفحات سے معلوم ہوگا کہ گاندھی جی اس ننھے سے بیج کو صوبہ سرحد کے خدائی خدمت گاروں کے دل میں پھر بونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ناظرین اس تصویر کے داخلی معنی اور اہمیت پر غور کریں اور خود فیصلہ کریں کہ یہ اس قابل ہے کہ نہیں کہ اسی کے لئے جیا جائے اور اسی کے لیے مرا جائے؟

پیارے لال

پہلا باب

تضاد کا قانون

صوبۂ سرحد کو لوگوں نے "دھوپ چھاؤں کی، رنج و راحت کی، رومان اور حقیقت کی، محبت اور نفرت کی، ہم آہنگی اور بے آہنگی" غرض یہ کہ اضداد کی سرزمین کہا ہے۔ آب و ہوا کے لحاظ سے دیکھئے تو اس میں ڈیرہ جات کا جھلسا ہوا علاقہ بھی ہے جس میں قیامت کی گرمی پڑتی ہے اور ہزارہ کا صحت بخش خطہ بھی جس میں برف پوش پہاڑیاں پرا جمائے کھڑی ہیں۔ قدرتی مناظر میں بھی بڑی رنگا رنگی ہے۔ شمال کے خوش منظر پہاڑی علاقے میں کہیں گھنے جنگل اور کھیتوں کے سلسلے ہیں جو سیڑھیوں کی طرح درجہ بدرجہ چڑھتے چلے گئے ہیں اور کہیں گنے اور غلّے کے سبز کاہی کھیت اور میووں کے خوش نما باغ ہیں جو بہترین قسم کے رسیلے بیر، سیب خوبانی، ناشپاتی، انگور، سنترے اور انار سے لدے رہتے ہیں۔ نمک کے پہاڑ کے پار جنوب میں چکنی مٹی کا بنجر علاقہ اور لکی اور مروت کا چٹیل میدان ہے جس کی پشتہ بندی وزیرستان کی

طوفان زدہ، بے رونق، ویران پہاڑیاں گرتی ہیں۔ ایک طرف قدرتی دولت کی افراط ہے اور دوسری طرف وہاں کے رہنے والوں کا انتہائی افلاس۔

سرحدی صوبہ کی حدود مختلف اوقات میں بدلتی رہتی ہیں۔ آریوں کے ابتدائی زمانہ میں اس کی سرحد وادئ سندھ سے وسط ایشیا کے دور دراز خطے تک چلی گئی تھی اور اس میں افغانستان کے بڑے حصّے اور موجودہ صوبۂ سرحد کے علاوہ دریائے سندھ کی جنوبی وادی جو صوبۂ سندھ میں ہے اور شاید بلوچستان بھی شامل تھا۔ چھٹی یا آٹھویں صدی قبل مسیح سے لے کر ۱۸۱۹ء تک وہ علاقہ جو اب صوبۂ سرحد کہلاتا ہے ایرانی، یونانی کشان، گپت، ترکی، غوری، مغل اور دُرّانی سلطنتوں کا ایک جُزو رہا۔ بیس سال تک سکھوں کی حکومت میں رہنے کے بعد اس حصّے پر جو اب آئینی اضلاع کے نام سے موسوم ہے انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

افغانستان سے گنڈمک کا صلح نامہ ہونے کے بعد جو سرحد مقرر ہوئی اس کی وجہ سے قندھار کے قدیم صوبہ کا آدھا حصّہ بھی برطانوی ہند میں شامل ہو گیا۔ نئی حد جو ڈیورنڈ لائن کہلاتی ہے ۱۸۹۴ء میں اس طرح مقرر ہوئی کہ کوہ سلیمان کی سب سے اونچی پہاڑیوں کے برابر برابر چلی جائے۔ اس کے بعد وہ
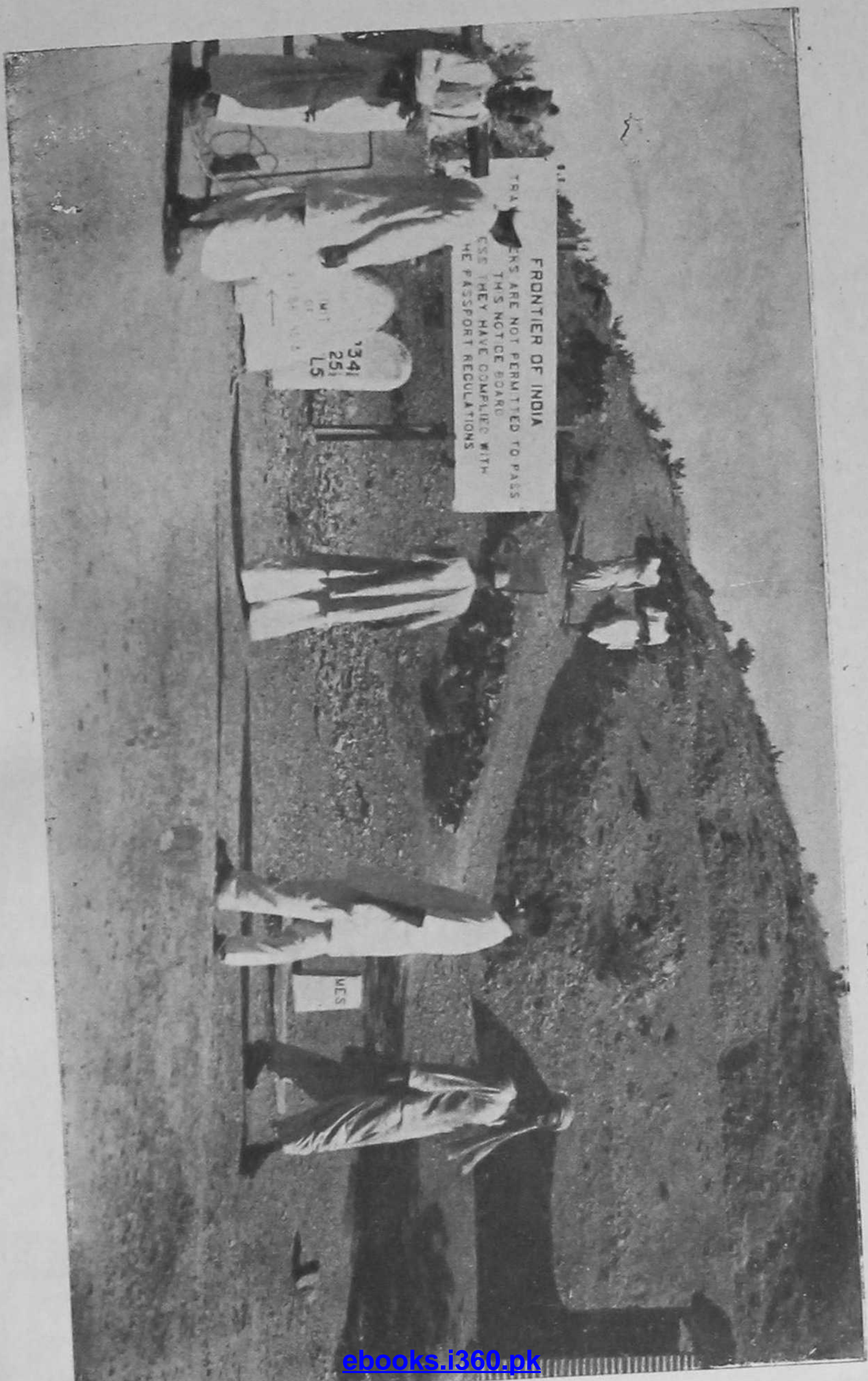
سب قبائل جو خیبر، مہمند، تیرہ، قرم اور وزیرستان میں رہتے تھے انگریزوں کے حلقۂ اثر میں آگئے۔

اس کا عجیب و غریب نتیجہ یہ ہوا کہ صوبۂ سرحد کی دو حدیں قرار پائیں۔ ایک تو ڈیورنڈ لائن جو برطانوی ہند کو افغانستان سے جدا کرتی ہے اور دوسری انتظامی جہاں سے اصلی انگریزی علاقہ شروع ہوتا ہے۔ جو علاقہ ان دونوں کے درمیان واقع تھا اور قبائلی علاقہ کہلاتا تھا اس پر دراصل کسی کا قبضہ نہیں تھا۔ وہ "نقشے پر تو ہندوستان کا ایک حصہ تھا مگر دراصل برطانوی ہند میں شامل نہ تھا۔" اس کے باشندے براہِ راست تاج برطانیہ کی رعایا نہیں تھے اور انھوں نے اپنے علاقے کا الحاق نہیں ہونے دیا۔ وہاں شاہ برطانیہ کا حکم نہیں چلتا تھا لیکن انگریز اسے اپنا "علاقہ زیر حمایت" کہتے تھے اور ان کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ اس کے باشندوں میں "امن قائم کرنے کے لیے" ہوائی جہاز سے گولہ باری کرنے کا اخلاقی حق رکھتے ہیں۔

آجکل صوبۂ سرحد کا نقشہ یہ ہے کہ اس کی شمالی حد کوہ ہندوکش ہے، جنوبی حد بلوچستان اور پنجاب کا ضلع ڈیرہ غازی خاں ہے، مشرقی حد کشمیر اور پنجاب ہے اور مغربی حد افغانستان ہے۔ وسعت کے لحاظ سے وہ چیکوسلوواکیہ سے تین ہزار مربع میل بڑا ہے یعنی اس کا مجموعی رقبہ اڑتیس ہزار مربع میل ہے۔ وہ تین جغرافی خطوں

پر مشتمل ہے (۱) ضلع ہزارہ کا وہ حصہ جو دریائے سندھ کے اُس پار واقع ہے۔ (۲) دریائے سندھ اور پہاڑوں کے درمیان کی پتلی پٹی جس میں پشاور، کوہاٹ، بنوں، مردان اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے آئینی ضلعے شامل ہیں (۳) وہ ناہموار پہاڑی علاقہ جو ان ضلعوں کے اور افغانستان کی سرحد کے درمیان ہے۔ اس میں سے ایک تہائی سے کچھ زیادہ یعنی تیرہ ہزار ایک سو ترانوے میل کے علاقے میں چھ آئینی ضلعے پھیلے ہوئے ہیں۔ باقی دو تہائی یعنی تقریباً پچیس ہزار مربع میل میں قبائلی علاقے اور آزاد علاقے کے قبیلے بستے ہیں جنہوں نے کوئی سو سال تک انگریزوں کی مزاحمت کی اور ان کو اپنے دیس پر قبضہ نہیں کرنے دیا۔ موخر الذکر علاقہ (تقسیم ہند سے پہلے) پانچ پولیٹیکل ایجنسیوں یعنی ملاکنڈ، قرم، خیبر، لوڑچی، وانا اور قسمتوں (۱) آئینی اضلاع (۲) قبائلی علاقہ (۳) آزاد علاقہ جسے سرحد پار کا علاقہ بھی کہتے ہیں اور (۴) چترال، دیر اور سوات کی ریاستوں پر مشتمل تھا۔

یہ صوبہ اب تک "اچھوتی زمین" ہے۔ وہ طرح طرح کی معدنیات سے مالا مال ہے جن سے اب تک فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ ان میں سے خاص خاص یہ ہیں۔ پہاڑی نمک، تیل، سیمنٹ، سنگ مرمر، گندھک، کوئلہ، اور رانگ۔ یہاں مزدوری بہت سستی ہے اور پانی کے بے انتہا خزانے موجود ہیں۔ جاڑوں کی خاص فصلیں

مکی اور جو اور موسم بہار کی گیہوں، جو اور چنا ہیں۔ چاول اور گنّا زیادہ تر ہزارہ، پشاور اور بنوں ضلعوں کی نہری زمین میں پیدا ہوتا ہے۔ پشاور ضلع کی چاہی اور نہری زمین میں اچھی قسم کی کپاس اور تمباکو بھی اگتی ہے۔ سرحد پار کے علاقے میں سوات، قرم اور ٹوچی دریاؤں کی وادیوں میں دھان کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔

جغرافیہ طبعی کے لحاظ سے اس صوبہ کا نقشہ حسب ذیل ہے:۔

ضلع ہزارہ ایک گاؤ دُم پٹی کی شکل میں شمال مشرق کی طرف ہمالیہ کے بیرونی سلسلے تک چلا گیا ہے اور وادیٔ کگن کے سرے پر پتلا ہوتے ہوتے ایک نقطہ سا بن گیا ہے۔ اس میں تحصیل مانسہرہ اور ایبٹ آباد کا پہاڑی علاقہ بھی شامل ہے اور تحصیل ہری پور کا سیراب میدانی علاقہ بھی۔ یہی خطّہ تھا جہاں قدیم زمانے میں دریائے سندھ کے اس پار کی ریاست ٹکشا سیلا یا ٹیکسلا واقع تھی جسے سکندر اعظم نے فتح کیا تھا۔ پہاڑوں کے سلسلے جن کے درمیان کگن کی تنگ گھاٹی واقع ہے، جنوب کی طرف اس ضلع کی سرحد تک چلے گئے ہیں۔ جا بجا ان پہاڑوں کے درختوں سے ڈھکے ہوئے پتلے حصے آگے کو نکلے ہوئے ہیں۔ اس طرح یہ علاقہ بہت سی تنگ وادیوں میں بٹ گیا ہے۔ یہ ضلع ایک بہت اچھی صحت گاہ ہے جہاں بہترین قسم کے شیریں پھل، آڑو، آلو بخارا، سیب، ناشپاتی خوبانی، انگور، سنترے اور انار کثرت سے پیدا ہوتے ہیں اور

ایسے ایسے خوش نما مناظر ہیں کہ دنیا میں بہت کم ہوں گے۔

دریائے سندھ اور پہاڑوں کے درمیان کا علاقہ تین میدانوں یعنی پشاور، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خاں پر مشتمل ہے جنھیں کوہاٹ کی نیچی پہاڑیاں اور نمک کے پہاڑوں کے آگے نکلے ہوئے حصے ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں۔ پشاور کی وادی کا بہت بڑا حصہ سیراب اور درختوں سے ڈھکا ہوا ہے اور بہار خزاں کے موسم میں "ناہموار پہاڑیوں کے جو گھٹے میں غلے کی بالیوں سے لہلہاتے ہوئے کھیتوں اور میوے کے شگفتہ باغوں کی ایک دلکش تصویر پیش کرتا ہے"۔ پشاور سے بالکل ملا ہوا کوہاٹ کا ضلع ہے بس ایک جو اکی پہاڑ بیچ میں ہے۔ یہ ضلع "ایک ناہموار پہاڑی علاقہ ہی جس کے بیچ بیچ میں تنگ گھاٹیاں واقع ہیں"...... کوہاٹ کی پہاڑیوں کے آگے کو نکلے ہوئے حصے جنوب کی طرف رفتہ رفتہ نیچے ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ بنوں کے میدان سے مل جاتے ہیں۔ یہ دریائے قرم سے سیراب ایک ایسا خطہ ہے "جو زرخیزی میں آپ اپنی مثال ہی اور کوہاٹ کی بنجر پہاڑیوں کے مقابلے میں ایک عجیب متضاد منظر پیش کرتا ہی......" اس کے جنوب میں مروت کا وسیع چورس میدان ہے "جو لکی سے شیخ بودن پہاڑ کے دامن تک پھیلا ہوا ہے"۔ "ریتیلے پتھر اور جمے ہوئے ذرات کے تودوں کا ایک سلسلہ جو بیچ بیچ میں ٹوٹ جاتا ہی بنوں کے

میدان کو ڈیرہ اسماعیل خان کے دمن یا میدان سے الگ کرتا ہی
"اس کا بڑا حصہ ایک چکنی مٹی کا چٹیل میدان ہے۔ یہ ان سیلابوں
کی مٹی کے جمع ہونے سے بنا ہے جو مغرب کی طرف سے کوہ سلیمان سے
آتے رہے ہیں"۔

جو پہاڑی علاقہ آئینی اضلاع اور افغانستان کے درمیان واقع
ہے اس کے انتہائی شمال میں دیر، سوات اور چترال ایجنسیاں ہیں۔
چترال کے نیچے دیر اور باجوڑ کے "عمارتی لکڑی کے گھنے جنگل"
واقع ہیں...... اس ایجنسی اور خیبر کے درمیان مہمند کی پہاڑیوں
کا ناہموار علاقہ ہے۔ خود خیبر" ایک چھوٹا تنگ اور تاریک درہ ہی جس
میں کھیتی برائے نام ہی"۔ لیکن قلعوں، چوکیوں اور بارکوں کا جال
پھیلا ہوا ہی، خیبر کے مغرب اور شمال مغرب میں آفریدی اور
کرزئی قبائل کے دیس ہیں۔ کرم کے جنوب میں "وزیری پہاڑیوں
کے بے ترتیب ٹیلے" ہیں شمال میں انھیں وادئی ٹوچی اور وہ گھاٹیاں
کاٹتی ہیں جن سے گزر کر جنوب میں دانا کا میدان آتا ہی۔ یہ خشک
پہاڑیاں زیادہ تر بے آب وگیاہ ہیں۔ لیکن کہیں کہیں ان کے
درمیان زرخیز اور سیراب وادیاں ہیں مثلاً شوال کے گرد درویش
خیل کی چراگاہ جو گھنے جنگلوں سے پٹی پڑی ہی۔

سیاسی اعتبار سے تقسیم ہند سے پہلے یہ صوبہ چار حصوں میں
میں بٹا ہوا تھا (۱) چھ آئینی اضلاع یہ کم و بیش اس علاقے پر

مشتمل ہیں جو ۱۸۹۴ء میں انگریزوں نے سکھوں سے لے لیا تھا اس کی آبادی تقریباً پچیس لاکھ تھی۔ (۲) قبائلی علاقے کی پٹی جس کی آبادی کوئی تیرہ چودہ لاکھ تھی۔ یہ آئینی اضلاع کی سرحد سے کر آزاد علاقے کی سرحد تک چلی گئی تھی۔ یہ علاقہ آئینی اضلاع کے ڈپٹی کمشنروں کی سیاسی نگرانی میں تھا جو آزاد قبائل کے انتظام کے بارے میں حکومت ہند کے پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کے سامنے جواب دہ تھے۔ (۳) شمالی ریاستیں جو ملاکنڈ ایجنسی کے حلقے میں تھیں یعنی چترال، دیر اور سوات۔ ان کی مجموعی آبادی ساڑھے نو لاکھ تھی۔ (۴) قبائلی پٹی اور ڈیورنڈ لائن کے درمیان کا علاقہ جسے آزاد علاقہ کہتے تھے۔ اس میں کوئی پانچ ساڑھے پانچ لاکھ پٹھان آباد تھے جن کی بڑی تعداد تیرہ اور وزیرستان میں رہتی تھی۔

صوبہ سرحد کے باشندوں کی بہت بڑی تعداد پٹھان ہے۔ لفظ پٹھان کا اطلاق ہر اس قبیلے پر ہوتا ہے جو پشتو (پختو) زبان بولتا ہے۔ اسے نسل سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ اس کا استعمال صوبہ سرحد کے ہندوؤں اور سکھوں کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور خدائی خدمتگاروں کی تحریک شروع ہونے کے بعد اکثر ہوتا بھی تھا سرحد پار کے قبائلی علاقے کے پٹھان اپنے اُن بھائیوں سے جو آئینی اضلاع میں رہتے ہیں زیادہ جفاکش اور جنگ جُو ہیں۔ ان کی قبائلی پٹی اصل صوبۂ سرحد اور ڈیورنڈ لائن کے درمیان کا پہاڑی علاقہ ہے۔ اس میں چار بڑے قبیلے یعنی آفریدی، مہمند، وزیری اور محسود آباد ہیں۔ ان

کے علاوہ اور قبائل یعنی گزئی، یوسف زئی، بھٹانی اور شنواری وغیرہ بھی ہیں۔

شمال سے چلئے تو بونر اور پشاور کی گھاٹی سے آگے کے علاقے میں یوسف زئی رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بونر کے یوسف زئی کفایت شعار پرہیزگار اور انتہا درجے کے مہمان نواز ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی ایک حجرہ یا مہمان خانہ ہوتا ہے۔ وہ بڑے محبِ وطن ہیں اور انھیں اپنی شرافتِ نسب کا بڑا دعویٰ ہے (جس پر وہ ہمیشہ فخر کرتے ہیں)۔

پشاور کے شمال مغرب میں دریائے کابل اور دریائے سوات کے درمیان مہمند رہتے ہیں۔ ان کی خانگی زندگی یوسف زئیوں کی طرح ہے البتہ ان کے ہاں حجرے یا مہمان خانے نہیں ہوتے۔ خیبر کے اُدھر جنوب کی طرف بے چارے بدنام آفریدی رہتے ہیں جنھیں واقعات کے جبر نے "دُنیا بھر سے بدگمان کر دیا ہے" لیکن کہا جاتا ہے اگر یہ بدگمانی ایک بار دور ہو جائے تو آفریدی میں وفاداری کی اتنی صلاحیت ہے کہ وہ آپ کا بڑا پکّا دوست بن سکتا ہے۔ وہ چھریرے اور مضبوط جسم کا ہوتا ہے۔" اس کی عقاب جیسی تیز آنکھ، اس کا مغرورانہ انداز اور "سُبک رفتار" اس کی

ملف شمالی مغربی سرحد کا مسئلہ از ڈاکٹر کالن ڈیویز۔

آزادی کی مظہر ہے جو پہاڑ کی کھلی گھاٹیوں کی پیداوار ہے۔ آفریدیوں نے ان دونوں لڑائیوں میں جو انگریزوں اور افغانوں میں ہوئی تھیں اور ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کی تحریک میں بہت اہم حصّہ لیا تھا۔ پشاور اور آئینی اضلاع کے دوسرے حصّوں میں خدائی خدمت گاروں پر جو وحشیانہ مظالم کئے گئے تھے اس کی وجہ سے ان میں بڑی ہل چل مچ گئی تھی۔

گاندھی ارون صلح کے زمانے میں آفریدیوں کے بارے میں ایک دل چسپ روایت مشہور تھی جس سے اُن کی سادہ دلی کا اندازہ ہوتا ہے کہا جاتا ہے کہ پولیٹیکل افسروں سے ان کی جو گفت وشنید ہوئی تھی اس میں ان کی طرف سے صلح کی یہ شرطیں کی گئی تھیں کہ حسب ذیل اشخاص کو رہا کردیا جائے۔

(۱) بادشاہ خاں (عبدالغفار خاں)

(۲) ملنگ بابا (گاندھی جی)

(۳) انقلاب

اس زمانے میں انقلاب زندہ باد کا نعرہ بہت عام تھا۔ وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ بھی کسی محب وطن کا نام ہے جسے برطانوی حکومت نے قید کردیا ہے۔

تیرہ کے جنوبی دیہات میں مختلف قبائل رہتے ہیں جو مجموعی اورکزئی یا کھوئے قبائل کہلاتے ہیں۔ قرم اور گومل کے درمیان

وزیرستان واقع ہے جسے صوبہ سرحد کا سوئزرلینڈ کہنا چاہیئے۔ یہ پہاڑیوں اور وادیوں کی ایک بھول بھلیاں سی ہی جس میں وزیری رہتے ہیں۔ چونکہ وہ سخت اور ناہموار پہاڑیوں کے درمیان رہتے ہیں اس لیے ان کی سیرت میں بھی اپنے ماحول کی بے لوچ تندی اور سختی آگئی ہے۔ وزیریوں کی ایک شاخ محسود ہے جو "سرحد ڈیرہ جات کی بلا" کہلاتی ہے۔ یہ وزیرستان کے قلب میں رہتے ہیں۔ بھٹانی اس علاقے میں آباد ہیں جو وزیرستان کی مشرقی سرحد کے ساتھ ساتھ گومل سے مروت تک چلا گیا ہے۔ ان میں اور محسودوں میں پرانا "خونی بیر" چلا آتا ہی۔ بنوں سے لے کر کوہاٹ کے دوسرے سرے تک کھٹک قبائل کا دیس ہی۔ یہ لوگ بڑے محنتی اور جفاکش ہیں ان کا مشغلہ یا تو کھیتی ہی یا نمک کی تجارت۔ بنوں میں بنوچی اور مروت قبائل رہتے ہیں جو پٹھانوں میں سب سے زیادہ مخلوط النسل ہیں" ان میں ڈیرہ اسماعیل خاں کے ہموار اور چٹیل" میدان میں زیادہ تر جاٹ رہتے ہیں۔ پٹھانوں کی آبادی صرف ایک تہائی ہی۔ اسی طرح ہزارہ کے ضلع میں بھی زیادہ تر آبادی غیر پٹھانوں کی ہے جن میں پنجابی مسلمان، گکھر اور سید وغیرہ شامل ہیں۔

تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب قبائلی پکے سنی مسلمان ہیں یعنی وہ حضرت محمد کے سب خلفا کو تسلیم کرتے ہیں اور قرآن کے علاوہ

احادیث یعنی پیغمبر اسلام کے اقوال کو بھی بہت اہمیت دیتے ہیں۔
پٹھانوں میں بچپن کی سی سادگی اور خوش مزاجی پائی جاتی ہے۔ انھیں موسیقی، شاعری اور لوک ناچ کا بڑا شوق ہے اور جب مزے میں ہوتے ہیں تو اظہارِ مسرت کے لیے بندوقوں کے فیر کرتے ہیں۔
لوک ناچ میں عورتوں کے پارٹ ہمیشہ مرد ادا کرتے ہیں۔ ان کے پسندیدہ باجوں میں نقارہ، بانسری (سرنائے) اور ایک قسم کا بین ہے۔ لوک ناچ کی مختلف قسمیں ہیں جن میں غالباً کھٹک ناچ سب سے زیادہ دل کش ہے۔ ان ہی کھٹک رقاصوں کے متعلق آج ایک انگریز مصنف لکھتا ہے[1] "وہ پیریٹک رہے تھے اور کود رہے تھے۔ کبھی ہاتھی کی سی قوت سے اور کبھی غزالوں کی سی نزاکت سے"۔ آگے چل کر اس نے کہا ہے "جو لڑکی" سب سے پیش پیش تھی کی خوش ادائی اور پھرتی میرے پروازِ خیال سے بڑھ کر تھی۔ یخنکی، میسن، جوس اور دوسرے رقاص جن کا میں بہت قائل ہوں کیا جائیں کہ ایک دور دراز ملک میں ان کے مدمقابل موجود ہیں"۔
پٹھانوں کی زبان پشتو یا پختو کہلاتی ہے۔ یہ سنسکرت سے نکلی ہے اور اس سے بہت مشابہ ہے۔ اس کا اچھا خاصا ترقی یافتہ

---

[1] ہندوستان میں تین دن از فیلڈنگ ہال۔

ادب موجود ہے اور اس نے متصوفانہ اور وطن پرستانہ شاعری کے بعض حیرت انگیز نمونے پیدا کئے ہیں۔ سب سے مشہور مصنفوں میں جنگ جو شاعر خوشحال کھٹک (سنہ ۱۶۳۰ء تا سنہ ۱۶۶۰ء) اور جید صوفی عبدالرحمن بابا گزرے ہیں۔ پٹھانوں کو اپنی زبان سے بڑی محبت ہے اور اگر کوئی اُن سے ان کی مادری زبان میں گفتگو کرے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔

برطانوی عہد میں قبیلوں کا اندرونی انتظام جرگے کے اصول پر قبائلی سرداروں کی نگرانی میں ہوتا تھا جو ملک کہلاتے تھے۔ جرگے کے معنی ہیں بڑے بوڑھوں کی پنچایت۔ جتنی زیادہ کسی قبیلے میں جمہوریت ہوتی اتنا ہی اس کا جرگہ بڑا ہوتا۔ چنانچہ جرگے میں کل بالغ مرد شامل ہوتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ قبائلی جرگہ خصوصاً ایجنسی کے علاقوں میں نوجوان برطانوی افسروں کے لیے اعلیٰ درجے کے حکمت عملی کے مدرسے کا کام دیتا تھا۔

سرحد کی حفاظت کا جو طریقہ برطانوی حکومت نے اختیار کیا تھا وہ یہ تھا کہ وہ سرحد پار کی فوجی خدمات اور غیر اہم وادیوں کی چوکی داری خاصہ داروں یعنی مقامی سپاہیوں کے سپرد کرتے تھے اور قبائلیوں اور ان کے سرداروں کو امن قائم رکھنے کے لیے بڑے بڑے وظیفے دیتے تھے۔ یہ وظیفوں کا طریقہ دراصل دھونس میں آکر وظیفے دینے یا رشوت دینے کا ایک خوش نما نام تھا اور اس کے حامیوں میں برطانوی سامراج کے علم بردار مثلاً

ڈیویز[1]، بروس اور سر مائیکل اڈائر وغیرہ شامل ہیں۔

افغانستان، بلوچستان اور صوبہ سرحد میں مسلمانوں کی آبادی کے درمیان ہندوؤں اور سکھوں کی بستیاں بھی موجود تھیں۔ آئینی اضلاع کی چوبیس پچیس لاکھ آبادی میں ان کی مجموعی تعداد دو لاکھ کہی جاتی تھی۔ لیکن ان کی اہمیت کا اندازہ ان کی تعداد سے نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان کے سرحدی علاقہ کی قریب قریب ساری تجارت ان کے ہاتھ میں تھی۔ دراصل ان کا وجود ایک معاشی ضرورت تھا۔ یہ ساہوکارہ کرتے تھے، مال رہن رکھتے تھے اور سنار کا کام کرتے تھے۔ ان کی ہر قسم کی دوکانیں خصوصاً غلے اور کپڑے کی، ہر جگہ پائی جاتی تھیں۔ مجموعی طور پر ان کے تعلقات آزاد علاقے کے قبائل سے پُر امن تھے۔

---

[1] "ان وظیفوں میں خرچ تو ضرور ہوتا ہے اور شاید خوردہ گیر انھیں دھونس میں آکر روپیہ دینا سمجھیں تاہم یہ تعزیزی مہموں سے بہت بہتر ہیں جن پہ کہیں زیادہ روپیہ خرچ ہوتا ہے۔"

(شمال مغربی سرحد کا مسئلہ از ڈیویز صفحہ ۳۳)

دوسرا باب

تاریخی جائزہ

صوبہ سرحد کی دلکش کہانی

اپنے جغرافی محل وقوع کی وجہ سے صوبۂ سرحد نے ہندوستان کی تاریخ میں اہم حصہ لیا ہے۔ اس صوبہ کی کوئی معیّن حدود نہیں ہیں۔ یہ پہاڑوں کا ایک منطقہ یا پٹی ہے جس کی چوڑائی مختلف ہے اور لمبائی بارہ سو میل ہے۔ یہ ایک سنگی دیوار ہے جس سے بیرونی حملہ آوروں کا گزرنا سوا خیبر، قرم، ٹوچی، گومل اور بولن کے درّوں کے قریب قریب ناممکن ہے۔ یہی "شمالی مغربی پھاٹک" ہے جس سے بیرونی حملوں کی لہریں یکے بعد دیگرے ہندوستان پہنچیں اور انھوں نے اس صوبے کو "بدیسی جرگوں کا کارواں سرائے" یا دوسرے الفاظ میں بہت سی ایشیائی نسلوں کا عجائب خانہ بنادیا۔ یورپ کی بحری طاقتوں کے ہندوستانی ساحل پر پہنچنے کے

بعد بھی صوبۂ سرحد کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ تقریباً ایک صدی تک وہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی خارجی پالسی پر چھایا رہا۔ صوبۂ سرحد اور اس کے متصل قبائلی علاقے کو "ایک آتش گیر بارود کے ذخیرے" سے تشبیہ دی گئی ہے۔ برطانوی سامراج کے ماہرین حرب کے لیے آزاد علاقہ جس کے پیچھے دعوئی آزادی کی تائید کے لیے کوئی طاقت نہیں تھی ایک "غیر مقبوضہ" علاقہ تھا۔ جس کو وہ اپنی فوجوں کی جنگی تربیت کے لیے تختۂ مشق کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہ مشق سرحدی لڑائیوں اور جنگی مہموں کے ذریعے کی جاتی تھی۔ فوج کے نوجوان حوصلہ مند افسر اُسے ایک بہترین "شکارگاہ" سمجھتے تھے جہاں بین الاقوامی ضابطوں کی رکاوٹ سے آزاد ہو کر وہ اپنے طور پر تھوڑا بہت قتل و غارت کر لیا کرتے تھے۔ تاکہ کچھ جنگی تجربہ حاصل ہو جائے۔ دراصل کسی نوجوان افسر کی ٹریننگ اس وقت تک نامکمل سمجھی جاتی تھی جب تک وہ صوبۂ سرحد میں کچھ دن تک جنگی خدمت انجام نہ دے چکا ہو۔ صوبۂ سرحد پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کا ایک طلسمی حصار تھا جس میں اس کی خاص برادری کے باہر کا کوئی شخص قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ یہ "امن کے زمانے میں جب کہ برطانوی افسروں کے لیے میدان جنگ میں جوہر دکھانے کا موقع نہیں ہوتا تھا، امتیاز حاصل کرنے کے لیے ایک اچھا میدان تھا۔"

اس سیاسی رازداری کی بدولت جو "پولیٹیکل اور فوجی افسروں

کے اس خلوت خانے" میں چھپائی ہوئی تھی، ہندوستان کے عام لوگوں کو کچھ دن پہلے تک اس کا کچھ علم نہ تھا کہ یہ علاقہ کیا ہے، اس کے رہنے والے کون لوگ ہیں، ان کی رسوم و روایات، ان کی امیدیں اور حوصلے کیا ہیں اور ان کی زندگی کی تشکیل کون سی قوتوں نے کی ہے۔ مغربی ملکوں کے عام لوگوں کے لئے صوبۂ سرحد محض اس سرزمین کا نام تھا جہاں "دنیا میں سب سے زیادہ قتل ہوتے ہیں"۔ ان کے نزدیک وہ جادوگرنی کا کڑھاؤ جس میں فتنہ و فساد کا حریرہ پکتا رہتا ہے اور اس میں بسنے والا پٹھان ایک لٹیرا جس کی "رگوں میں صدیوں کی مطلق العنانی کا خون" دوڑ رہا ہے۔ جس کا محبوب مشغلہ خون کا بدلہ لینا ہے اور جس کا خاص پیشہ اور آمدنی کا ذریعہ چھاپہ مارنا، اغوا کرنا اور قیدیوں کا زر رہائی وصول کرنا ہے۔" "پرلے سرے کا بدمعاش، دغاباز، بے رحم، کینہ پرور، خونخوار" یہ ہیں وہ الفاظ جو اس کے لیے استعمال کئے جاتے تھے۔ لیکن کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اس کے ساتھ تقریباً ایک صدی سے کیا برتاؤ ہوتا رہا ہے۔ اس کو کس کس طرح ستایا گیا، دبایا گیا، اور دھوکا دیا گیا۔ اس سے بین الاقوامی سیاست کی بساط پر ایک مہرے کا کام لیا گیا۔" اس کا مغرورانہ انداز اور اس کے مضبوط قدم، اس کی فوجی صلاحیت اور آزاد طبیعت، اس کے بے تکلف اور بے بناوٹ اطوار، اس کی غیروں کے تسلط سے نفرت، اس کی

حیرت انگیز جفاکشی" وہ صفات ہیں جس کا ڈیویزنے سے لے کر اب تک سب مصنفوں نے ذکر کیا ہے۔ لیکن مغربی ملکوں میں کتنے لوگ یہ جانتے ہیں کہ اس صوبے نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں کتنا بڑا حصہ لیا، کس طرح ۱۹۲۰ء کے بعد عدم تشدد کی زبردست تحریک چلائی، اور یہ ثابت کر دیا کہ "بہادر پٹھان جو چھاپہ مار لڑائی میں بے نظیر ہے، پہاڑی جنگ میں سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے" سپاہیانہ جرأت، جسمانی طاقت اور برداشت، بے مثل نشانہ بازی اور سپہ گری کے کمال میں دنیا بھر میں مشہور ہے" مسکینوں اور خاکساروں کی صف میں بھی پیش پیش ہے اور اس بے تشدد شجاعت میں بھی کمال رکھتا ہے جو روحانی ہتھیار کے سوا اور کسی ہتھیار سے کام نہیں لیتی اور جسے کوئی مادی ہتھیار مغلوب نہیں کر سکتا۔

صوبہ سرحد ہندوستان کی طویل تاریخ سے بے شمار رشتوں سے وابستہ ہے۔ اشوک کی لافانی یادگاریں جو اس میں بکھری پڑی ہیں بودھ مت کی شوکت و عظمت کی شہادت دیتی ہیں جو کسی زمانہ میں اس علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ پشاور، کنشک کی بودھ سلطنت کا جو وندھیاچل سے وسط ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی، دارالسلطنت تھا، ٹیکسلا میں، جو اپنے زمانے میں مشرق کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی، دور مشرقی اور مغربی ملکوں سے یاتری اور طلبہ علم اور ایمان

کی تلاش میں آیا کرتے تھے۔ آگے چل کر چوتھی صدی عیسوی میں جب بہار میں مشہور نالندہ یونیورسٹی قائم ہوئی تھی تو وہاں اکثر طالب علم بدھ سلطنت کے اسی حصے سے جایا کرتے تھے جو تین بڑی تہذیبوں یعنی ہندوستانی، چینی اور یونانی ۔رومی تہذیبوں کا سنگم تھا۔ اسی راستے سے ہندوستان نے اپنا مذہب اور آرٹ کا شاندار پیام دُور مشرق کے ملکوں میں بھیجا تھا۔

اس علاقے کی جو آج کل صوبۂ سرحد کہلاتا ہے پہلی جھلک ہمیں آریوں کی اس ہجرت کے سلسلے میں نظر آتی ہے جو ہندوکش کے برف پوش پہاڑوں کی راہ سے ہندوستان میں ہوئی تھی۔ یہ لوگ دریائے جیحون سے ہرات تک آئے اور وہاں سے ایک شاخ غزنی اور کابل سے ہوکر اور دوسری قندھار اور کوہِ سلیمان سے گزر کر اس علاقے میں پہنچی جسے دریائے سندھ سیراب کرتا ہے۔ مشہور اور معروف رزمیہ نظم مہابھارت میں جس کی تصنیف کا زمانہ ۳۰۰۰ ق۔م کے لگ بھگ سمجھا جاتا ہے، مشہور ہیروئن گندھاری، (گندھار یعنی پشاور کی رہنے والی) کا ذکر آتا ہے جو ہستناپور (جسے اب دہلی کہتے ہیں) کے حکمران کوروں کی ماں تھی۔ سنسکرت کا نامور نحوی بنسی جو غالباً دنیا کا سب سے بڑا عالم نحو تھا اسی علاقے میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا۔ کہا جاتا ہے کہ پشاور کی بنیاد پرشورام یعنی اس زبردست برہمن سپہ سالار نے ڈالی تھی

جس کا ذکر ہندوستان کی دوسری رزمیہ نظم رامائن میں آیا ہے۔
پانچویں صدی ق۔م کے لگ بھگ ایران کے بادشاہ سائرس نے اس علاقے پر فوج کشی کی جو اب افغانستان اور بلوچستان کہلاتا ہے اور دارائے اوّل نے گندھارا پر (جو اب پشاور اور راولپنڈی کے ضلعوں پر مشتمل ہے) قبضہ کر لیا۔ زرکسیز نے جب یونان پر حملہ کیا تو اس صوبے نے اس کے لیے فوج مہیا کی۔
۳۲۶ سنہ ق۔م میں یونانیوں نے سکندر اعظم کی سرکردگی میں ہندوستان پر حملہ کیا اور وادئ پشاور کو فتح کر لیا۔ یہاں اس زمانے میں ایک راجا کی حکومت تھی جس کی راج دھانی پشکروتی (موجودہ چارسدہ) دریائے کابل کے کنارے تھی۔ سکندر نے اسے اپنی سلطنت کا ایک صوبہ بنا کر ایک مقدونی افسر فلپ کو اس کا گورنر مقرر کر دیا۔ ٹیکسلا (جو اس زمانے میں بودھ علوم کا بہت بڑا مرکز تھا) کے ہندو راجہ نے جس کی اپنے ہم سایہ راجہ پورس سے مخالفت تھی، سکندر سے درخواست کی کہ وہ اس کے حریف پر حملہ کرے۔ پورس کو لڑائی میں شکست ہوئی مگر سکندر اسے اس کا راج واپس دے کر آگے بڑھتا ہوا بیاس تک پہنچا۔ لیکن اس کی فوجوں نے مگدھ کے زبردست راجا کے مقابلے کے لیے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور سکندر کو واپس ہونا پڑا۔ اس کے مرنے کے بعد ۳۲۳ سنہ ق۔م میں ٹیکسلا کے صوبہ دار امبھی اور پورس کو جنھیں یونانیوں کے حملے

نے کمزور کر دیا تھا، چندر گپت نے مغلوب کر لیا اور ان کے علاقے کو مگدھ کی موریا سلطنت میں شامل کر لیا۔ سارا افغانستان اور شمالی ہند کا سرحدی علاقہ جس میں کشمیر بھی شامل تھا، چندر گپت کے ترقی یافتہ ملکی اور فوجی نظام کے ماتحت ہو گیا۔ جس کی تفصیل چندر گپت کے مشہور عالم وزیر کوتلیہ نے ارتھ شاستر میں بیان کی ہے۔ چندر گپت کے عہد میں (۳۰۰ ق۔م) گندھارا (پشاور ضلع) اور پاکھلی (ہزارہ ضلع) میں بدھ مت کا عام رواج ہو گیا۔ موریہ سلطنت کا نقطۂ عروج اشوک کا عہد تھا جو غالباً دنیا کا سب سے عالی قدر فرماں روا گزرا۔ اس نے بدھ مت کو سرکاری مذہب قرار دیا۔ ایک بار اس نے کلنگ کی فتح میں میدان جنگ میں ڈیڑھ لاکھ قیدی دیکھے اور جنگ کی تباہ کاریوں سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے لڑائی کو بالکل ترک کر دیا[1]۔ اس کے بجائے جنگی مہمیں بھیجنے کی جگہ وہ امن کے پیام بر بھیجنے لگا کہ دنیا کی قوموں کو امن کا اور "دھرم" کا پیام پہنچائیں۔ اس کے زمانے میں ایک عظیم الشان نظامِ سلطنت نے جو خدا ترسی اور "دھرم" پر مبنی تھا نشو و نما پائی۔ یونانی مصنّفوں نے تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے فرمانوں اور کتبوں سے جو مانسہرہ کے قریب شہباز گڑھی میں پائے گئے ہیں

---

[1] اس واقعہ کا ذکر کلنگ کے مشہور تیرھویں فرمان میں ہے۔

ٹیکسلا کا نام اس کے ماتحت علاقے کی حیثیت سے آیا ہے۔ اشوک کی سرحدی پالیسی یہ تھی کہ اپنے ہمسایوں سے پُرامن تعلقات قائم رکھے وہ فتوحات کے ذریعے سے اپنی سلطنت کی توسیع نہیں چاہتا تھا۔ کلنگ کے پہلے فرمان میں اس نے یہ اعلان کیا کہ "غیر مفتوح سرحدی علاقے کے لوگوں کو مجھ سے ڈرنا نہیں چاہیئے۔ انھیں مجھ پر بھروسا کرنا چاہیئے اور مجھ سے رنج کی جگہ خوشی کی توقع رکھنی چاہیئے"

سنہ ۲۳۱ ق م میں اشوک دُنیا سے رخصت ہو گیا اور اس کے بعد بدھ مت سرکاری مت نہیں رہا۔ دوسری صدی ق م کے وسط سے لے کر ۱۳۵ ق م تک باختر کے بادشاہ باختر، کابل، گندھارا اور ٹیکسلا پر حکومت کرتے رہے۔ اس کے بعد سیتھین قوم کی باری آئی (سنہ ۱۳۵ ق م) جسے ننک بھی کہتے ہیں اور اس کے بعد کُشن قبائل نے جنھیں ہنوں نے ان کے پہاڑی وطن سے نکال دیا تھا اس سارے علاقے کو جس پر یودن ننکوں اور پہلویوں کی حکومت تھی، تاخت و تاراج کیا۔ سنہ ۲۹ء میں ہم انھیں ٹیکسلا پر حکمرانی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ تیسرے کشن راجہ کنشک کی سلطنت سارے شمال مغربی ہند اور کشمیر میں پھیلی ہوئی تھی جس کی راجدھانی پرش پورہ (پشاور) میں تھی۔ کشن راجہ پانچویں صدی عیسوی میں ہنوں کے حملے تک اس شمال مغربی علاقے پر حکومت کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ ہرشش کی سلطنت میں شامل

ہو گیا۔ (ساتویں صدی عیسوی)

سنہ ۱۷۱ء میں مسلمان ہندوستان میں آئے۔ سبکتگین نے جو بلخ اور غزنی کے غلام بادشاہوں کے سلسلے کا تیسرا حکمران تھا وزیری اور آفریدی قبائل کے ساتھ پشاور اور دریائے سندھ کے مغرب کے میدان پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد محمود غزنوی کے حملے شروع ہوئے۔ لیکن محمود ہندوستان کو مستقل طور پر فتح کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر بھی صوبۂ سرحد کا سارا علاقہ جو دریائے سندھ کے اس پار ہے اس کے ایک نائب کی حکومت میں تھا۔ سنہ ۱۱۸۰ء میں محمد غوری نے پشاور پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد غلاموں، خلجیوں تغلقوں کے زمانے سے لے کر اکبر کے زمانے تک، جب کہ سلطنت مغلیہ مضبوطی سے قائم ہوئی، اس علاقے میں ابتری بدنظمی اور نزاع کا دور دورہ رہا اور کبھی کبھی باہر سے حملے بھی ہوتے رہے۔ ان میں سب سے مشہور تیمور کا حملہ تھا جو اپنے دارالسلطنت سمرقند سے سواروں کی ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ روانہ ہوا اور کابل سے اور درہ خیبر سے گزرتا ہوا دلی تک پہنچا جسے اس نے پانچ دن تک لوٹا اور ایک لاکھ ہندو قیدیوں کو قتل کر کے اُن کے سروں کا ایک مینار بنایا۔ اس نے اپنے حملہ کی وجہ یہ ظاہر کی کہ ایک کٹر مسلمان کی حیثیت سے اُسے وہ رواداری بہت گراں گزری جو دلی کے مسلمان بادشاہ

ہندو مذہب کے ساتھ برتتے تھے۔

اکبر کے زمانے میں جب خوش انتظامی اور رواداری کا زمانہ تھا اس کی شمالی قلمرو میں بلوچستان اور قندھار کا زبردست قلعہ جو پہلے ایران کے ماتحت تھا شامل کر لیا گیا اور اورنگ زیب کی وفات کے بعد تک سلطنت مغلیہ کا ایک جُز رہا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں یوسف زئی اور خٹک قبائل نے شورش کی اور ان کی سرکوبی کے لئے تعزیری فوجیں بھیجی گئیں۔ پہلے خٹک اور آفریدی نے مل کر مغلوں کو شکست دی اور "قندھار سے اٹک تک" عام بغاوت ہو گئی۔ اس پر خود شہنشاہ نے اُس مہم کی کمان جو یوسف زئی قبیلے کے خلاف بھیجی گئی تھی خود اپنے ہاتھ میں لے لی (۱۶۷۴ء) اور حکمت عملی صورت حال پر قابو پا لیا۔" اکی پالیسی جس کی بعد میں برطانوی حکومت نے تقلید کی، یہ تھی کہ "ایک قبیلے کو دوسرے سے لڑائے اور ان کے سرداروں کو وظیفے دے کر ان کے ذریعے سے سرحد میں امن قائم رکھے۔ اس لیے کہ یہاں فوجی چوکیوں کا رکھنا زیادہ کامیاب نہیں ہوا تھا۔"

نادر شاہ دُرّانی نے ۱۷۳۹ء میں دریائے سندھ کو عبور کر کے بالکل اُسی طرح جیسے تیمور لنگ نے ۱۳۹۸ء میں کیا تھا اس علاقہ کو تاخت و تاراج کیا۔ اس کے قتل کے بعد احمد شاہ ابدالی نے (۱۷۴۸ء تا ۱۷۷۳ء) قندھار، کابل اور غزنی کے ساتھ ساتھ

پشاور، ڈیرہ جات، ہزارہ، سندھ، کشمیر اور ملتان کو ملا کر ایک جداگانہ درّانی ریاست قائم کی۔

"دُرّانی سلطنت کے زوال کے بعد سکھوں کی حکومت قائم ہونے تک مرکزی حکومت کی" اس علاقے پر جسے سرحد کہتے تھے ایک بے قاعدہ اور غیر مسلسل حکمرانی تھی۔" پنجاب کے سکھ حکمراں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے صوبۂ سرحد سے نو آباد افغانیوں کو نکال دیا ۱۸۲۰ء تک پشاور، بنوں، کوہاٹ اور ڈیرہ جات کے کچھ حصّے پر ان کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے افغانوں کو دریائے سندھ کے پار پہاڑوں میں بھگا کر موجودہ صوبۂ سرحد کی بنا ڈالی۔ "مگر سکھوں کی حکومت صوبہ سرحد پر (سنہ ۱۸۳۴ء تا سنہ ۱۸۴۸ء) محض تلوار کی حکومت تھی۔ ڈکیتیوں اور انتقامی لڑائیوں کا زور تھا اور اُن سے بھی زیادہ تباہی اس وقت ہوتی تھی جب سکھ مال گزاری وصول کرنے کے لئے آتے تھے۔ ایسے موقعوں پر عورتوں اور بچوں کے جھُنڈ اپنے گھروں سے ڈر کر بھاگ جاتے تھے اور اس علاقے کی حالت مہاجروں کی نو آبادی کی سی ہو جاتی تھی۔" (میجر جیمس)

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد ان کی سلطنت میں ابتری پھیل گئی۔ سکھوں اور انگریزوں کی پہلی لڑائی کے بعد بدامنی اور انتشار کا دور شروع ہوا۔ سکھوں کی طاقت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی۔ لیکن اس خطرے نے کہ کہیں افغان فوجیں سرحد سے گزر کر

دریائے سندھ کے اس پار نہ پہنچ جائیں، برطانوی حکومت کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ پنجاب کے الحاق کا سوال چھوڑ دے اور نابالغ مہاراجہ دلیپ سنگھ کو اس صوبے کا حکمران تسلیم کر لے۔ ۱۶ ردسمبر ۱۸۴۶ء کے معاہدے کی رو سے نظم و نسق ایک ریجنسی کاؤنسل کے سپرد کیا گیا جو برطانوی ریزیڈنٹ کے ماتحت تھی۔ ۱۶ ردسمبر کے معاہدے میں یہ شرط بھی تھی کہ " ایک برطانوی افسر اور اس کے ساتھ ایک بڑا عملہ گورنر جنرل کی طرف سے لاہور تعینات کیا جائے گا اس افسر کو پورا اختیار ہو گا کہ ریاست کے ہر محکمے کی نگرانی کرے "۔ سر ہنری لارنس لاہور میں برطانوی ایجنٹ مقرر ہوئے۔ جان نکلسن اور ہربرٹ ایڈورڈس کو حکم دیا گیا کہ بنوچیوں یعنی بنوں کے باشندوں کے مال گزاری نہ ادا کرنے کی سزا میں " بنوں کی سرکش وادی کو قابو میں لانے کے لئے خالصہ دیوان کی طرف سے فوج کشی کرے "۔ اس وادی کو دو دریا سیراب کرتے تھے " یہاں کبھی ایسا نہ ہوتا تھا کہ فصل اچھی نہ ہو۔ زمین اس قدر زرخیز تھی کہ بغیر کسی خاص محنت کے قریب سب اناج جو ہندوستان میں ہوتے تھے، افراط سے پیدا ہوتے تھے "۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا نقشہ میجر ہربرٹ ایڈورڈس نے اپنی کتاب " سرحد پنجاب میں ایک سال " میں کھینچا ہے در اصل یہ ایک خلاصہ ہے ہندوستان میں برطانوی حکومت کی انیسویں صدی

کے نصف آخر کی تاریخ کا" اس وادی پر قبضہ بندوق یا توپ سے
نہیں کیا گیا بلکہ محض دو نسلوں اور دو مذہبوں کو ایک دوسرے
کے مقابلے میں کھڑا کرنے سے۔ سکھ فوج کے خوف سے دو جنگجو اور
آزاد مسلم قبائل نے میرے اشارے پر چار سو قلعے جن پر ان کے
دیس کی ساری طاقت منحصر تھی، مسمار کر دیے اور انھیں مسلم
قبائل کے خوف سے سکھ فوج نے میرے حکم پر برطانوی حکومت
کے لیے ایک قلعہ تعمیر کیا جس کے ذریعے سے اس وادی پر پورا
تسلط ہو گیا اس طرح ایک وحشی قوم پُرامن طریقے سے تہذیب
کے دائرے میں آگئی اور ایک نیک نیت انگریز نے تین مہینے
کے اندر بغیر لڑائی کے وہ فتح حاصل کر لی جو مذہبی دیوانے سکھ
تلوار کے زور سے پچیس برس سے حاصل کرنے کی کوشش
کر رہے تھے۔

تیسرا باب

سڑکیں اور حملے

۱۸۴۹ء میں جب لارڈ ڈلہوزی نے پنجاب کا باقاعدہ الحاق کر لیا تو صوبہ سرحد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت آگیا، اس طرح برطانوی ہند کو پٹھانوں کے کئی آزاد اور جنگ جو قبائل سے براہ راست سابقہ پڑا جو نام نہاد قبائلی علاقے میں رہتے تھے اور سرحدی پالیسی کا ایک نیا دور شروع ہوا، ہندوستان اور افغانستان کے تعلقات مختلف زمانوں میں مختلف رنگ اختیار کرتے رہے۔ لیکن ان سب میں دراصل ایک ہی پالیسی مدنظر تھی کہ "حکمراں خاندان کی آزادی کو اس وقت تک برقرار رکھا جائے جب تک وہ انگلستان کا دوست رہے اور اس کی حریف طاقتوں کے مضر اثرات سے محفوظ رہے"! حریف طاقتوں سے خاص طور پر روس مراد ہے جس کی وسط ایشیا میں پیش قدمیاں پچھلی صدی کے وسط سے برابر برطانیہ کے لئے پریشانی کا

باعث رہی ہیں۔ پہلے تو "خطرے کی پیش بندی" کی پالیسی اختیار کی گئی اور ۱۸۰۹ء میں ماؤنٹ اسٹوارٹ ایل فنسٹن "کابل کے مشن" پر بھیجا گیا۔ اس کے بعد ۱۸۳۲ء میں "دست اندازی کی پالیسی" شروع ہوئی، جب اے برنس "تجارتی مشن" پر گئے اور ۱۸۳۸ء میں جنرل کین نے افغانستان پہنچ کر ہر دل عزیز بارک زئی سردار دوست محمد کو معزول کر کے اپنے دوست شاہ شجاع کو تخت پر بٹھایا۔ یہیں سے پہلی جنگِ افغان (۱۸۳۹ء تا ۱۸۴۲ء) شروع ہوئی۔ اس کے پہلے دور میں برطانوی حکومت کو شکست ہوئی برطانوی سفیر سر ولیم میک ناٹن اور سر ولیم برنس پولیٹیکل ایجنٹ مارے گئے اور ایک سپاہی کے سوا کابل کی ساری برطانوی فوج کام آئی اس کا بدلہ لینے کے لئے ایک اور فوج بھیجی گئی وہ مار دھاڑ کرتی کابل تک پہنچی اور اس نے شہر کے بڑے بازار کو بارود سے اڑا دیا جو بقول جنرل رابرٹس کے ایک ناقابل معافی وحشیانہ فعل تھا اس طرح برطانیہ کا رعب دوبارہ قائم کر کے یہ فوج ہندوستان واپس آئی اور افغانستان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ اس کے بعد سر جان لارنس کی حاکمانہ عدم مداخلت کی پالیسی شروع ہوئی۔ ۱۸۶۳ء میں امیر دوست محمد خاں کے مرنے کے بعد جب ان کے دونوں بیٹوں میں تخت کے لئے جنگ شروع ہوئی تو سر جان لارنس نے کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ لیکن جب شیر علی اس جنگ میں غالب آیا تو ہندوستان

کی حکومت نے افغانستان سے رشتہ جوڑ لیا اور وائسرائے نے شیر علی کو امیر تسلیم کر لیا۔

سنہ ۱۸۶۴ء میں روس نے خیوا کی طرف پیش قدمی کی۔ سنہ ۱۸۶۵ء میں یارقند پر قبضہ کر لیا۔ سنہ ۱۸۶۷ء میں بخارا کو اور سنہ ۱۸۷۳ء میں خیوا کو اپنی "باجگزار" ریاست بنا لیا۔ ان سب باتوں کو برطانوی حکومت اپنے مشرقی مقبوضات کے لئے کھلا ہوا خطرہ سمجھتی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ جب لارڈ لٹن نے ایک برطانوی مشن بھیجا کہ کابل کے حکمران سے دوستی کا باضابطہ معاہدہ کرے تو امیر شیر علی نے اُسے رد کر دیا۔ اس حرکت کو "برطانیہ کے مقاصد سے حقارت آمیز بے پروائی" سمجھا گیا۔ اور جب امیر نے روسی سفیر کی پذیرائی کی تو اُسے ہندوستان کی برطانوی حکومت کے خلاف "جنگ کا اقدام" قرار دیا گیا۔

سنہ ۱۸۷۸ء میں اس پالیسی کی جگہ سرحد پر قدم جما کر ہندوستان کو بیرونی حملوں سے بچایا جائے۔ "پیش قدمی کی پالیسی" اختیار کی گئی اور وہ یہ تھی کہ برطانیہ کی طرف سے افغانستان یا اس کے ایک حصے پر مستقل قبضہ رکھا جائے یہ پالیسی اس قسم کی تھی جیسے نیپیر کا "ٹیکا وہی" (مجرمانہ) طرزِ عمل سندھ کے امیروں کے ساتھ۔ چنانچہ گلگت میں ایک برطانوی ایجنسی قائم کی گئی اور اس کے بعد اعلانِ جنگ کر کے کابل پر تین مختلف سمتوں سے حملہ کیا گیا (دوسری

جنگ افغان) کوئٹہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ اس لئے کہ "اس سے قندھار کا راستہ کھل جائے گا اور دشمن کو جو شمالی دروں سے ہندوستان پر حملہ کرنا چاہے آگے بڑھ کر گھیر لینے کا موقع ملے گا"۔ صلح نامہ گنڈمک (سنہ ۱۸۷۹ء) کی رو سے امیر کابل اس پر راضی ہو گئے کہ کابل میں ایک برطانوی ریذیڈنٹ کو رکھیں اور شمالی دروں کے علاوہ قندھار کے پرانے صوبوں کا مشرقی حصہ انگریزوں کے حوالے کر دیں۔

سنہ ۱۸۹۳ء میں نیا سرحدی خط ڈیورنڈ لائن کہلاتا ہے کوہ سلیمان کی سب سے اونچی پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ کھینچا گیا جس کی وجہ سے خیبر، مہمند، تیراہ، کرم اور وزیرستان کے قبائل انگریزوں کے حلقۂ اثر میں آ گئے۔ پشاور، نوشہرہ، رسال پور، لنڈی کوتل اور کرم میں مضبوط فوجی چوکیاں قائم کی گئیں تاکہ برطانوی حکومت دروں کو پوری طرح قابو میں رکھ سکے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر قبائلی علاقے کو "کھولا گیا" یعنی مزید فوجی چوکیاں محسود علاقے کے قلب میں وانا، رزمک اور میرانشاہ میں قائم کی گئیں۔ اور ان کو قوت پہنچانے کے لئے موٹر کی فوجی سڑکوں کا ایک جال بچھایا گیا اور جا بجا چھوٹی چھوٹی چوکیاں، مورچے اور قلعے بنائے گئے۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں لارڈ کرزن کے دریائے سندھ کے پار کے پانچ آئینی اضلاع یعنی ہزارہ، پشاور، کوہاٹ، بنوں، ڈیرہ اسمٰعیل خاں اور پانچ ایجنسیوں کو پنجاب سے الگ کر کے

ایک جُداگانہ صوبہ بنادیا۔ اسی سال لارڈ کرزن نے آئینی اضلاع میں ایک چیف کمشنر اور اس کی مدد کے لئے ایک جوڈیشنل اور ایک ریونیو کمشنر مقرر کیا اور انجینیو نیں چیف کمشنر کو ایجنٹ گورنر جنرل کی حیثیت دی جو براہ راست مرکزی حکومت کے ماتحت تھا" تاکہ پنجاب کی سرحد پر رہنے والے قبائل کے ساتھ بیرونی تعلقات پر برطانوی حکومت کی نگرانی پہلے سے زیادہ ہو جائے صوبہ سرحد کو ان سیاسی اصلاحات سے جو ۲۰-۱۹۱۹ء کی مانٹفرڈ اسکیم کے ماتحت نافذ کی گئی تھیں الگ رکھا گیا۔

اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ سرحد پار کے پانچ ترقی یافتہ اور آئینی اضلاع میں نظم و نسق کا معیار گر گیا۔ سارے ہندوستان میں تو اصلاحات کا نفاذ ہوا لیکن صوبہ سرحد چیف کمشنر کی استبدادی حکومت کے ماتحت رہا، اور اوپر سے اس پر ۱۹۰۱ء کے ضابطہ جرائم نمبر ۳ کا بوجھ ڈال دیا گیا جس نے شہریوں کو عدالتی چارہ جوئی کے بنیادی حق سے بھی محروم کر دیا۔ یہ نظام اتنا نمایاں تھا کہ ہندو اور مسلمان نیشنلسٹ حلقوں میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ اور انھوں نے یہ مطالبہ کیا کہ اس صوبے کو دوبارہ پنجاب سے ملا دیا جائے۔ ایک حد تک اسی ایجی ٹیشن کی وجہ سے ۱۹۳۰ء کی دوسری گول میز کانفرنس کے بعد صوبہ سرحد کو ایک گورنر کے صوبے کا درجہ دے دیا گیا اور اس میں بھی وہی آئین

نافذ کیا گیا جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں تھا، اس کے علاوہ پانچ آئینی اضلاع کو بجٹ کا خسارہ پورا کرنے کے لیئے مرکز کی طرف سے ایک ایک کروڑ سالانہ کی امداد ملنے لگی۔

پنجاب کے الحاق سے جو ۱۸۴۹ء میں ہوا تھا ناگوار نتائج پیدا ہوئے جن کی وجہ سے صوبہ سرحد میں امن قائم نہ ہو سکا۔ لارڈ لٹن کے آنے تک (۱۸۷۶ء) بقول ڈیویز کے پنجاب کی سرحد کے بارے میں "عدم مداخلت کا اور اس کے ساتھ کبھی کبھی فوجی مہم بھیجنے کا" طریقہ اختیار کیا گیا مگر دراصل عدم مداخلت کا محض نام ہی نام تھا۔ پنجاب کے الحاق اور ۱۸۵۷ء کے غدر کے درمیانی عرصے میں سب ملا کر سترہ فوجی مہمیں بھیجی گئیں، اسی طرح دوسری جنگ افغان اور ۱۸۹۷ء کی پٹھانوں کی بغاوت کے درمیان سرحدی قبائل پر سولہ بار چڑھائی کی گئی، جولائی ۱۸۹۷ء میں سرحد میں ایک عام شورش برپا ہو گئی۔ قبائلیوں کے بڑے لشکر نے مجنون ملا کی سرکردگی میں جس نے برطانیہ کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا تھا ملاکنڈ کی پہاڑیوں پر حملہ کر دیا۔ اسی کے ساتھ دریائے کابل کے پار پشاور کی وادی پر بھی قبائلیوں کے ایک ملے جلے لشکر کا حملہ ہوا جس میں خیبر کے آفریدی بھی شامل تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہمند کے علاقے میں تیرہ کی مہم بھیجی گئی، تاکہ آفریدیوں کو "سزا" دی جائے۔ ان مہموں کے تجربے سے اس خیال کو روز بروز تقویت ہو رہی تھی کہ افغانستان کو

قوم سے گذرتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ برطانوی حکومت کا دخل قبائلی علاقے میں ہوتا گیا جس کی بدولت وہاں پکی سڑکوں اور فوجی ریلوے کی "برکتیں" پہنچ گئیں۔ ان چیزوں میں اور اس علاقے کی سیاسی اور معاشی پستی میں ایک عجیب تضاد محسوس ہوتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ان سڑکوں پر مغرب کا ہر مہذب ملک رشک کر سکتا تھا اور فوجی ریلیں خصوصاً وہ جو آئینی اضلاع سے پرے پہاڑیوں کے گرد چکر کھاتی اور پہاڑوں کے بیچ سے گذرتی چلی جاتی تھیں فن انجینیری کے کمال کی نشانیاں تھیں۔ لیکن آزاد قبائل ان سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئے۔ وہ جاہل تو تھے، مگر بے وقوف نہیں تھے۔ وہ ان سڑکوں اور بارکوں کو اپنی غلامی کی نشانیاں اور زنجیریں سمجھتے تھے اور انھیں، برطانوی حکومت کا فوجی مقصد کے ماتحت ایک ایک انچ زمین پر قبضہ کرنا بھی جارحانہ پیش قدمی کی حیثیت سے شاق گذرتا تھا۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ قبائلیوں کی طرف سے حملے ہوتے رہے، اور برطانوی حکومت کی طرف سے تعزیری مہمیں بھیجی جاتی رہیں۔ اس طرح دونوں میں ایک مسلسل اور مستقل "جنگ" شروع ہو گئی۔ بقول میجر راس کیپل فرقبیلے کے تمام مرد، عورت اور بچے ان لوگوں کو غازی سمجھتے تھے۔ جو پشاور اور کوہاٹ پر حملے کرتے اور ڈاکے ڈالتے تھے۔ وہ قوم کے مجاہد تصور کیے جاتے تھے۔ ان کو دعائے خیر کے ساتھ رخصت کیا جاتا

فتح کرنے اور اس پر قبضہ رکھنے میں روپے کا اور جانوں کا بے حد نقصان ہوتا ہے۔ "معقول تدبیر" یہ ہے کہ یہ خرچ دشمن پر ڈالا جائے، چنانچہ پیش قدمی کی پالیسی رفتہ رفتہ ترک کردی گئی اور اس کی جگہ پر یہ پالیسی اختیار کی گئی کہ افغانستان کی ایک آزاد، مضبوط اور پائیدار حکومت کے ساتھ جو سرحد کے آزاد قبائل کی نگرانی برطانوی حکومت کے سپرد کرنے پر تیار ہو، دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔ اس پالیسی کے مطابق امیر عبدالرحیم کو کابل کے تخت پر بٹھایا گیا اور وہ برطانوی فوج کی مدد سے بہت عرصے تک حکومت کرتا رہا۔ اس درمیان میں اُسے اپنے ملک کی حفاظت کے لئے ایک معقول رقم وظیفے کے طور پر ملتی رہی۔ یہ طریقہ اس کے جانشین امیر حبیب اللہ خاں کے زمانے میں بھی جاری رہا جو ۱۹۱۹ء میں قتل کر دیا گیا۔ لیکن اس "سائنٹیفک" سرحد کی وجہ سے برطانوی حکومت کو سرحد پار کے قبائل سے براہ راست سابقہ پڑا جس سے دوسری قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں۔ افغانستان کے حکمراں فائدے میں رہے کہ ان کے حریف برطانوی حکومت کے سر پڑ گئے۔ عہد نامہ گنڈمک جو افغانستان سے ہوا تھا اور وہ سیاسی مفاہمت جو سرحدی قبائل سے کی گئی تھی اُن کی رو سے برطانوی حکومت نے دروں پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا، اور ہندوستان سے کابل تک دو فوجی سڑکیں اس کے قبضے میں آگئی تھیں اور جن میں سے ایک خیبر سے اور دوسری

تھا اور جب وہ کامیاب و کامران واپس آئے تھے تو بڑی خوشیاں منائی جاتی تھیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۸۹۳ء تک اور آزاد علاقے کی طرح وزیرستان بھی برطانوی حلقۂ اثر سے باہر تھا اور افغانستان کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔ ڈیورنڈ معاہدے کی رو سے امیر عبدالرحمٰن خاں اس سے دستکش ہو گئے۔ ۱۸۹۰ء سے پہلے قبائلیوں کی طرف سے حملے بہت ہی کم ہوتے تھے لیکن ڈیورنڈ لائن کی حد بندی کے دوران میں وانا کے مقام پر ایک برطانوی دستے پر حملہ کیا گیا، اور اس کی وجہ سے جنگ شروع ہو گئی۔ (۱۸۹۴ء تا ۱۸۹۵ء)۔ ۱۹۱۲ء سے قبل وزیرستان کے علاقے میں ایک سڑک بھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۱۳ء کی انتظامی رپورٹ کے ساتھ جو نقشہ شائع ہوا اس میں پہلی بار تھال سے ایدک تک جو ٹوچی علاقے میں تھا ایک سڑک دکھائی گئی۔ وزیرستان میں جنگی سڑکوں کی اسکیم عمل میں آ رہی تھی کہ محسود قبیلے نے بغاوت کر دی اور ان کے خلاف فوجی کارروائی کرنی پڑی۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۴ء تک وہ دور تھا جب محسود قبیلے کے خلاف مہم بھیجی گئی اور اس کے علاقے پر قبضہ کیا گیا۔ اسی کے ساتھ سڑکوں کی تعمیر بڑے زور شور سے شروع ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرحد پار سے سال بھر میں جتنے حملے ہوا کرتے تھے ان کی تعداد بہت

بڑھ گئی، ذیل کے نقشے سے معلوم ہو گا کہ سڑکوں اور حملوں میں باہم کیا تعلق تھا۔

سنہ ء	حملوں کی تعداد
سنہ ۱۲-۱۹۱۱ء	۷۱
سنہ ۱۳-۱۹۱۲ء	۷۷
سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء	۹۳
سنہ ۱۵-۱۹۱۴ء	۱۶۵
سنہ ۱۶-۱۹۱۵ء	۳۴۵
سنہ ۱۷-۱۹۱۶ء	۲۹۲
سنہ ۱۸-۱۹۱۷ء	۲۲۳
سنہ ۱۹-۱۹۱۸ء	۱۸۹
سنہ ۲۰-۱۹۱۹ء	۶۱۱
سنہ ۲۱-۱۹۲۰ء	۳۹۱
سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء	۱۹۴
سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء	۱۳۱
سنہ ۲۴-۱۹۲۳ء	۶۹

ہندوستان کی برطانوی حکومت کے فوجی محکمے کے لئے یہ صورت حال کچھ زیادہ ناخوش گوار نہیں تھی۔ ہندوستان میں اس بات کے

خلاف عام احتجاج تھا کہ ملک کی آمدنی کا بہت بڑا حصہ یعنی ساٹھ فیصدی تک "فوجی مصارف" میں کھپ جاتا تھا، اس لئے کبھی کبھی جھڑپیں ہو جانے سے اور قبائلی علاقوں میں فوجی مہم بھیجنے سے اِن مصارف کے لئے حکومت کو ایک معقول عذر ہاتھ آجاتا تھا۔ لیکن اِن حملوں کی زد خاص طور پر صوبہ سرحد کی برطانوی رعایا پر پڑتی تھی، قبائلی برطانوی حکومت میں اور برطانوی ہند کی رعایا میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہی لوگ ہمارے دیس پر حملہ کرنے کے لئے اور ہمارے بھائیوں کا خون بہانے کے لئے روپیہ اور آدمی مہیا کرتے ہیں۔ اس لئے وہ انھیں قتل کرنے، لوٹنے اور فدیہ وصول کرنے کے لئے اپنا جائز شکار سمجھتے تھے۔ یہاں مشرقی ملکوں کی یہ مثل صادق آتی ہے۔ "جب فوجیں لڑتی ہیں تو گھاس بچاری مفت میں کچل جاتی ہے۔"

اس سلسلے میں شری بھولا بھائی ڈیسائی نے ۱۹۳۵ء میں مرکزی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے ایک دفعہ کہا تھا "مہمیں تو فوج رکھنے کا ایک بہانہ ہیں۔ ان کے بغیر چار کروڑ پونڈ کا خرچ حق بجانب ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں فوج ہو وہاں ہمیشہ اس کے استعمال کا میلان ——— بلکہ یوں سمجھئے جواز ——— بھی ہوتا ہے جب ہم اپنی حد میں ہوتے ہیں تو اس سے تجاوز کرنا چاہتے ہیں اور جب ایک حصے پر قابض ہو جاتے ہیں تو آگے بڑھ کر کچھ اور لینا چاہتے ہیں

اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ اصل میں سرحد کی جنگ کو پچھلے تیس، اکتیس سال سے اسلحہ کا ذخیرہ جمع کرنے کا بہانہ بنایا گیا ہے اور اس طرح ہمارے ملک کی غریب جنتا کا خون چوسا گیا ہے۔!

موقع پرست لوگ، رشوتوں، تعزیری مہموں اور بس میل ریل یا سڑک بنانے میں اس سے کہیں زیادہ روپیہ صرف کر دیتے تھے، جتنا اسکول، ڈاک خانے، اسپتال اور دوسری آسائشوں کے مہیا کرنے میں صرف ہوتا جن کی سرحد پار کے لوگوں کو سخت ضرورت تھی اور جنھیں وہ دوستی کی نشانی سمجھ کر خوشی اور احسان مندی کے ساتھ قبول کرتے۔ ۱۸۴۹ء سے ۱۸۹۱ء تک فوجی مہموں کے بھیجنے پر تیرہ کروڑ روپیہ صرف ہوا۔ مرکز کی سرحدی پالیسی کی وجہ سے جو مستقل مالی ذمہ داریاں اٹھانی پڑتی تھیں۔ ان میں ذیل کی رقمیں شامل تھیں۔

(۱) ایک کروڑ چون لاکھ روپیہ ہر سال محکمۂ خارجہ کے ذریعے سے صرف ہوتا تھا۔

(۲) فوجی ریلوے کو دو کروڑ سالانہ کا خسارہ ہوتا تھا۔

(۳) اس علاقے میں فوج کو رکھنے اور مورچہ بندی کرنے کا خرچ دس گیارہ کروڑ کے قریب تھا۔

(۴) تعزیری مہموں کے خوفناک فوجی کھیل پر جو قریب قریب ہر سال کھیلا جاتا تھا یا بڑی اور چھوٹی لڑائیوں پر جو جنگ چترال

کے بعد چالیس سال کے اندر ہوئیں، اوسط خرچ دو کروڑ سالانہ سے کم نہ تھا۔ ایک بیان کے مطابق جو ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں دیا گیا تھا اس وقت سے جب برطانوی حکومت نے پنجاب کو سکھوں سے چھینا، نوے سال کے اندر (سنہ ۱۸۹۹ء تا سنہ ۱۹۳۸ء) کل خرچ چار ارب کے قریب ہوا۔

یہ سلسلہ ستر سال سے زیادہ جاری رہا۔ ان بے شمار مہموں کا جنھیں سر مائیکل اوڈائر نے "آتش زنی اور غارت گری کے واقعات" کہا ہے، نتیجہ قریب قریب صفر تھا۔ ایک اور موقع پر سر مائیکل نے کہا تھا "ان سے قبائلی کچھ عرصہ کے لئے دب جاتے تھے لیکن پھر وہی پہلی سی بدامنی کی حالت پیدا ہو جاتی تھی۔"

چوتھا باب

ایک عجیب و غریب مظہر

سنہ ۲۰-۱۹۱۹ء میں ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ ستیہ گرہ کی تحریک بہت بڑے پیمانے پر شروع ہوئی۔ پہلی عالمگیر جنگ میں ہندوستان نے اپنے بدیسی حکمرانوں کی پریشانی سے فائدہ اٹھانے کے بجائے ان کے ساتھ جنگ میں تعاون کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن جنگ کے ختم ہونے کے بعد اس کے حصے میں آزادی کے بجائے رولٹ ایکٹ آیا جس کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ باغیانہ جرائم کا انسداد کرے مگر اصل میں یہ شہری حقوق کو بے دردی سے کچلنے کی ایک ایسی تدبیر تھی جو ہندوستان میں اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ اس کی بدولت گاندھی جی جنھیں اب تک برطانوی سلطنت کی "نہایت وفادار رعایا" ہونے پر فخر تھا افراری باغی اور ہندوستان کی برطانوی حکومت کے کھلے ہوئے باغی بن گئے۔ انھوں نے اس کے خلاف سارے ملک میں ستیہ گرہ کی تحریک شروع کر دی۔ حکومت نے اس کے جواب میں پنجاب میں مارشل لا نافذ کر دیا جس کی تان امرت سر

میں جنرل ڈائر کے ہاتھوں ہندوستانیوں کے قتلِ عام پر ٹوٹی۔ اس لیے وہ تحریک جو رولٹ ایکٹ کے خلاف شروع ہوئی تھی کچھ دن بعد زیادہ وسیع ہو کر بے تشدد ترکِ موالات کی تحریک بن گئی۔ یہ تحریک گاندھی جی کی قیادت میں ان وحشیانہ مظالم کی دادخواہی کے لیے جو پنجاب میں مارشل لا کے سلسلے میں ہوئے تھے اور اس بے انصافی کی تلافی کے لیے جو خلافت کو ختم کر کے اور ہندوستان کو اس کے پیدائشی حق یعنی سوراج سے محروم کر کے کی گئی تھی، شروع ہوئی۔ اس وقت ایک عجیب معجزہ دیکھنے میں آیا ہندو اور مسلمان جنھیں برطانوی حکومت کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی نے ایک مدت تک الگ کر رکھا تھا، اس پر تُل گئے کہ آپس کے جھگڑوں کو بھول کر ایک ہو جائیں ظاہر ہے کہ اس سے برطانوی سامراجی جن کو دن رات یہ فکر رہتی تھی کہ ان دونوں کو ٹکرا کر ہندوستان کو دائمی طور پر "برطانوی حکومت کے لیے محفوظ" بنا دیں۔ اب تک ان کی یہ پالیسی رہی تھی کہ صوبۂ سرحد کو روسی خطرے کے خلاف ایک مورچہ بنائیں۔ مگر اب انھوں نے یہ سوچا کہ اسے ہندوستان کی اندرونی اور بیرونی مصلحتوں کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ مسلمان کی اکثریت کے صوبے کی حیثیت سے ترقی دیں تاکہ ہندو اکثریت کے صوبوں کا توڑ ہو سکے اور ہندوستانی قومیت کے سیلاب کے لیے پشتے کا کام دے سکے۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر چیف کمشنر

اور پولیٹیکل سروس کے کل ذمہ دار افسروں کو ہدایت کی گئی کہ ان اضلاع کے باشندوں کے مقابلے میں جن پر براہ راست حکومت کی جاتی تھی۔ قبائلیوں کی دل جوئی کو ترجیح دی جائے۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں ترک موالات کی تحریک سارے ہندوستان کی طرح صوبہ سرحد میں بھی پھیل گئی۔ اس کے بعد وہ دور آیا کہ فرقہ وارانہ فسادات بہت بڑے پیمانے پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ بعض صورتوں میں حکام نے اور ان کے ایجنٹوں یعنی مقامی افسروں نے اگر قصداً نہیں کرائے تو انھیں شہ ضرور دی۔ صوبہ سرحد کے سب سے بڑے فساد سنہ ۱۹۲۴ء میں کوہاٹ اور سنہ ۱۹۲۷ء میں ڈیرہ اسماعیل خاں میں ہوئے۔ لیکن باوجود فرقہ واریت کے زہر کے جو برطانوی حکومت کی پالیسی نے پھیلایا تھا سنہ ۱۹۳۰ء میں سرحد میں عوام کی ایک بہت بڑی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب ایک عجیب و غریب منظر نمودار ہوا یعنی بے تشدد پٹھان۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں نمک کی ستیہ گرہ کے سلسلے میں صوبہ سرحد کے پٹھانوں نے ہزاروں کی تعداد میں عدالتوں اور بدیسی کپڑے اور شراب کی دوکانوں کی پُرامن پکٹنگ کی۔ سرحد کے حکام نے جو اپنے مقاصد کے لیے بے تشدد پٹھان کو مسلح پٹھان سے کہیں زیادہ خطرناک سمجھتے تھے اس تحریک کو کچلنے میں کسی قسم کی سختی اٹھا نہیں رکھی ۲۳ر اپریل کو لیڈروں کی گرفتاری کے بعد پشاور میں پٹھانوں کے

ایک پُرامن مجمع پر جس میں ہندو اور سکھ بھی شامل تھے، گولی چلائی۔ اس الم ناک واقعہ کی تفصیل کے لیے شری وی۔ جے۔ پٹیل کے پشاور فائرنگ کی تحقیقاتی رپورٹ (سنہ ۱۹۳۰ء)[1] کو پڑھنا چاہیے جسے برطانوی حکومت نے اس زمانے میں ممنوع قرار دیا تھا۔

---

[1] ذیل میں ایک رپورٹ کے کچھ اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں یہ رپورٹ پنجاب کے ایک ذمہ دار مسلم لیڈر نے بھیجی تھی اور اسی زمانے میں ینگ انڈیا میں شائع ہوئی تھی :۔

"انگریز سپاہیوں کا ایک دستہ..... پشاور پہنچا اور اس نے بغیر پہلے سے تنبیہ کئے ہوئے مجمع پر جس میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے فیر کرنا شروع کر دیا..... جب اگلی صف والے گر گئے تو پیچھے سے ہزاروں سینہ کھولے ہوئے گولی کھانے کو تیار آگے بڑھ گئے...... بعض کے اکتیس اکتیس گولیاں لگیں..... سب کے قدم جمے رہے۔ گھبراہٹ اور بھگدڑ کا نام تک نہ تھا۔ ایک کم سن سکھ لڑکا ایک گورے کے سامنے آکر کہنے لگا کہ مجھے گولی مار دو۔ گورے نے بے تامل فیر کر دیا اور لڑکا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ایک بوڑھی عورت نے اپنے عزیزوں اور دوستوں کو زخمی ہوتے ہوئے دیکھا تو آگے بڑھی اور گولی کھا کر گر گئی۔ ایک پیر مرد جس کے کندھے پر چار سال کا ایک بچہ سوار تھا اس وحشیانہ قتل عام کو برداشت نہ کرسکا اور آگے بڑھ کر گوروں سے التجا کرنے لگا کہ مجھے بھی مار ڈالو۔ اس کی فرمائش پوری ہوئی اور وہ بھی گولی کا نشانہ بنایا گیا.... لوگ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ہے)

ہر شخص جسے پٹھان سے ذرا سی بھی واقفیت تھی حیرت میں رہ گیا۔
رائل گڑھوال رائفلز کے جنگ آزمودہ گڑھوالی سپاہیوں کی دو پلٹنیں اس نظارے سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ انھوں نے گولی چلانے کے حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ ان کو کورٹ مارشل کر کے دس سے چودہ سال تک قید کی سزائیں دی گئیں۔ جب گاندھی ارون معاہدہ ہوا تو عام معافی کی دفعہ ان پر عائد نہیں کی گئی اور انھیں اپنی پوری سزائیں بھگتنی پڑیں ان میں سے ایک اپنی میعاد ختم ہونے کے بعد گاندھی جی کے پاس آیا اور کچھ عرصے تک ان کے آشرم کے ایک رُکن کی

(صفحہ ۷۶ کا بقیہ حاشیہ)

ایک ایک کر کے آگے بڑھ رہے تھے اور گولیوں کی باڑھ کا سامنا کر رہے تھے۔ جب وہ زخمی ہو کر گر پڑتے تو انھیں پیچھے گھسیٹ لیا جاتا تھا اور دوسرے ان کی جگہ لے لیتے تھے......"

ایک خاصے سینیر افسر نے اس واقعہ کا ذکر انڈین ڈیلی میل کے کالموں میں جس کا ایڈیٹر انگریز تھا ان الفاظ میں کیا ہے :-

"میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اخباروں میں جتنی دیر گولی چلنے کا ذکر کیا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ دیر تک چلتی رہی۔ ہم نے ان کم بختوں کو ایسا سبق دیا کہ یاد ہی تو کریں گے...... ہمارے آدمی کھڑے دنادن گولیاں چلا رہے تھے اور شورش پسندوں اور ان کے لیڈروں کو جن کی طرف پولس اشارہ کرتی تھی مار کر گرا رہے تھے۔ محض چند گولیاں نہیں چلیں بلکہ مسلسل گولی باری کی گئی؟

حیثیت سے رہا۔

وہ جس نے پٹھانوں میں یہ حیرت انگیز کایا پلٹ کردی خان عبدالغفار خاں تھا جو اپنے صوبے میں بادشاہ خاں کے نام سے مشہور تھا۔ خان عبدالغفار خاں اور ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب نے ۳۰-۱۹۲۹ء میں خدائی خدمت گار تحریک شروع کی تھی۔ چارلی اینڈریوز کے الفاظ میں "وہ اپنے مزاج اور چال ڈھال کے لحاظ سے سچ مچ بادشاہ ہے۔ وہ خود اہنسا کا پابند ہے اپنے پیرؤوں کو بھی اس کی تاکید کرتا ہے اور مہاتما گاندھی کی ہدایتوں پر حرف بہ حرف عمل کرتا ہے"۔ ان کی زندگی کی روداد ایک کہانی یا رومان معلوم ہوتی ہے وہ ۱۸۹۰ء میں محمد زئی قبیلے کے دولت مند خوانین کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بہرام خاں تحصیل چارسدّہ ضلع پشاور کے ایک گاؤں اُتمان زئی کے سب سے بڑے خان تھے۔ عبدالغفار خاں نے ایڈورڈ مشن ہائی اسکول میں تعلیم پائی لیکن وہ میٹرک کے امتحان میں فیل ہوگئے اور گھر پر رہنے لگے بخلاف اس کے ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب طب کی اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے اور پہلی جنگ عظیم میں طبی خدمات انجام دینے کے بعد آئی۔ ایم۔ ایس کے رکن ہوکر ہندوستان واپس آئے۔ بادشاہ خاں کو بھی کچھ عرصے تک یہ شوق رہا کہ فوج میں داخل ہوکر ایک سپاہی کی حیثیت سے امتیاز حاصل کریں لیکن قدرت نے انھیں اس سے محفوظ رکھا۔ اس لئے کہ

جب وہ اپنے ایک دوست سے جو فوج میں افسر تھے، ملنے کے لئے گئے تو ان کی آنکھوں نے یہ ناگوار منظر دیکھا کہ ایک کم تر درجے کے برطانوی افسر نے ان کے دوست کی سخت توہین کی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں داخل ہوئے لیکن ان کے والد نے انھیں واپس بلا لیا اور انھیں انجنیری کی تعلیم کے لیے انگلستان بھیجنا چاہا سارے انتظامات ہو چکے تھے یہاں تک کہ پی اینڈ ریو کے ایک جہاز میں ان کا ٹکٹ بھی خرید لیا گیا تھا۔ مگر ماں کی محبت انجنیری کے شوق پر غالب آگئی۔ جب وہ رخصت ہونے کے لئے گئے تو وہ سسکیاں لے کر کہنے لگیں "میرا ایک بیٹا تو پہلے ہی مجھ سے جدا ہو چکا ہے اگر تم بھی چلے گئے تو میں کیا کروں گی"۔ بیٹے کا دل ہل گیا اور اس نے یورپ جا کر تعلیم پانے کا خیال چھوڑ دیا۔ گاندھی جی کو تو ماں کی محبت نے تین چیزوں یعنی شراب، عورت اور گوشت سے پرہیز کرنے کا عہد لے کر عمر بھر کی تپسیا کی راہ پر ڈال دیا تھا مگر بادشاہ خان سے جنھیں ان کے دوست پیار سے سرحدی گاندھی کہتے ہیں دنیاوی جاہ پسندی ہی چھڑا دی اور انھیں بقول سرحد کے عوام کے ایک فقیر بنا دیا۔ جس نے اپنی زندگی ایثار، قربانی اور خلق خدا خصوصاً غریبوں کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ دونوں نے جس راہ میں قدم رکھا تھا اُس سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ دونوں سینہ تانے ہوئے اپنے اپنے انداز میں اس منزل کی طرف بڑھتے چلے گئے جو تقدیر نے ان کے لئے معین کر دی تھی۔

۱۹۱۱ء میں حاجی صاحب ترنگ زئی کے ساتھ جنھیں اپنے حُبِ وطن کی بدولت گھر چھوڑ کر قبائلی علاقے میں جلاوطنی کی زندگی بسر کرنی پڑی، بادشاہ خاں نے اپنے صوبے میں کئی نیشنل اسکول قائم کئے۔ اس زمانے میں راسخ العقیدہ مُلّا سرکاری اسکولوں کے خلاف ایجی ٹیشن کر رہے تھے لیکن وہ تعلیم کی کوئی دوسری راہ نہیں بتاتے تھے۔ بادشاہ خاں نے اس ایجی ٹیشن کو تخریبی رنگ کے بجائے تعمیری رنگ دے دیا۔ ان کے اپنے پرانے ایڈورڈ مشن کے پرنسپل پادری وگرام کی مثال نے ان کے دل میں یہ حوصلہ پیدا کیا کہ اپنے آپ کو قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دیں۔

بادشاہ خاں نے اپنے قول کے مطابق دین داری کا جذبہ اپنی ماں سے ورثے میں پایا تھا اور اپنے باپ سے انھیں عدم تشدد کا فطری رجحان ملا تھا۔ دونوں ان پڑھ تھے اور انھیں جسمانی دنیا سے زیادہ روحانی دنیا سے لگاؤ تھا۔ "میری والدہ اکثر نماز کے بعد خاموش مراقبے میں بیٹھی رہتی تھیں۔ میرے والد کے دوست تو بہت تھے مگر ساری عمر ان کی کسی سے دشمنی نہیں ہوئی ...... ان میں انتقام کا مادہ بالکل نہیں تھا اور ان کا خیال تھا کہ دھوکا کھانا کوئی شرم کی بات نہیں البتہ دھوکا دینا ضرور شرمناک ہے۔ وہ اپنی بات کے پکے تھے اور ان کی سچائی کا یہ حال تھا کہ دشمن بھی ان پر شبہ کرنے یا ان کی تردید کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔" سرحد کے لوگ ان کے قول کو

دستاویز سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ بادشاہ خاں بیان کرتے ہیں کہ لوگ گروہ در گروہ آکر اپنا پس انداز کیا ہوا روپیہ ان کے پاس امانت رکھاتے تھے اور رسید تک نہیں مانگتے تھے۔ وہ حکام کی درباداری کے قائل نہیں تھے، اس کے باوجود بڑے بڑے برطانوی حکام انھیں چھاہتے تھے، اور انھیں ناراض کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے"

حاجی ترنگ زئی کے چلے جانے کے بعد بادشاہ خاں نے مہمند اور باجوڑ کے علاقے کا دورہ کیا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ قبائلیوں میں رہ کر اپنا مشن پورا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ وہ کئی دن تک روزہ رکھتے رہے اور دعائیں مانگتے رہے لیکن کوئی فیصلہ نہ کر سکے آخر انھوں نے پھر عوام کی تعلیم اور ترقی کا پرانا شغل شروع کر دیا۔ جب رولٹ ایکٹ کے خلاف ایجی ٹیشن شروع ہوا تو بادشاہ خاں دل و جان سے اس میں شریک ہو گئے وہ فوراً گرفتار کر لئے گئے۔ ۶ را اپریل ۱۹۱۹ء کو اتمان زئی میں ایک لاکھ آدمیوں کا جلسہ ہوا جس میں بادشاہ خاں کے بوڑھے باپ بھی شریک تھے بادشاہ خاں کی گرفتاری کے بعد پولیس کا افسر ایک جرگے کے ساتھ اُن کے والد کے پاس آیا اور انھیں یہ دھمکی دی کہ بادشاہ خاں کو گولی مار دی جائے گی۔ پھر اس نے ان کو بھی گرفتار کر لیا۔ جب بادشاہ خاں جرگے کے سامنے پیش ہوئے تو ان سے پوچھا گیا کہ کیا تم پٹھانوں کے

بادشاہ خان نے کہا یہ تو میں نہیں جانتا مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ میں قوم کا خادم ہوں اور اس قانون (رولٹ ایکٹ) کو چپ چاپ برداشت نہیں کر سکتا .... پھر مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی .... جرگے نے طرح طرح کی دھمکیاں دیں اور جھوٹی دلیلوں سے کام لیا .... مگر مجھ پر کچھ اثر نہ ہوا۔"

اس طرح باپ بیٹے دونوں کی سنہ گرہ کی بسم اللہ ہوئی۔ مجھے ہتھکڑیاں پہنا کر جیل لے گئے۔ اور جب تک میں قید رہا میرے پاؤں میں بیڑیاں پڑی رہیں۔ ان دنوں میرا جسم اب سے دگنا تھا، اور میرا وزن دو سو بیس پونڈ تھا .... کوئی بیڑیاں میرے پاؤں میں نہیں آتی تھیں .... بیڑیوں کے تلاش کرنے میں بڑی مشکل پیش آئی اور جب وہ مجھے پہنائی گئیں تو ٹخنوں کے اوپر کا حصہ چھل گیا، اور بہت سا خون بہا .... افسروں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی اور یہ کہا کہ تھوڑے دن میں تمھیں اس کی عادت ہو جائے گی۔

خان بہرام خاں تین مہینے بعد چھوٹ گئے اور بادشاہ خاں بھی چھ مہینے سے زیادہ قید نہیں رہے۔ اس لئے کہ اس زمانے کے چیف کمشنر سر روس کیپل کی یہ پالیسی تھی کہ پٹھانوں کی "تالیف قلوب" کی جائے۔

اس اثنا میں بڑے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب نے سنٹ ٹامس ہاسپٹل سے ایم آر سی ایس (لندن) کی ڈگری لی اور جنگی خدمت کے لیے فرانس چلے گئے۔ انھیں کچھ خبر نہ تھی کہ اُن کے چھوٹے بھائی اور والد پر کیا گذر رہی ہے۔ ہندوستان سے کوئی خط ان تک نہیں پہنچنے دیا گیا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں جب وہ ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

بادشاہ خاں سنہ ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے اجلاس ناگ پور میں شریک ہوئے، اور انھوں نے خلافت کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ اُن کی سرکردگی میں مہاجرین کی ایک بڑی جماعت تحریک خلافت کے سلسلے میں احتجاج کے طور پر ہجرت کر کے کابل کی طرف روانہ ہوئی ان غریبوں کو آتے جاتے بڑی سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، بوڑھے بہرام خاں بھی جن کی عمر اب نوّے سال کے قریب تھی۔ جانے پر تیار تھے مگر انھیں بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر روکا گیا۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں برطانوی حکام نے بادشاہ خاں کو محض نیشنل اسکول کھولنے کے جرم میں گرفتار کر لیا۔ "آزاد مدرسے" اس قدر مقبول تھے کہ ملاکنڈ، باجوڑ اور سوات کے علاقوں سے بھی قبائلی اپنے بچوں کو ان میں پڑھنے کے لئے بھیجتے تھے، اور یہ حکام کی نظر میں بڑی خطرناک چیز تھی۔

سر جان میفی چیف کمشنر نے بادشاہ خاں کے والد سے

کہا تمھارے بیٹے کو کیا ضرورت ہے کہ وہ مدرسہ کھولے جب کہ کسی اور شخص کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ باپ نے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی۔ بیٹے نے جواب دیا "ابا جان فرض کیجیے کہ دوسرے لوگوں کو نماز سے دلچسپی نہ رہے تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ تم نماز ترک کر دو یا کہیں گے کہ چاہے جو ہو تم اپنا فرض پورا کرتے رہو۔"

باپ نے کہا "ہرگز نہیں، دوسرے کچھ بھی کریں، میں یہ کبھی نہ چاہوں گا کہ تم اپنے مذہبی فرض کو چھوڑ دو۔"

"تو پھر ابا جان قومی تعلیم کا کام بھی اسی قسم کا ہے، اگر میں نماز چھوڑ دوں تو مدرسے کو بھی چھوڑ سکتا ہوں۔"

باپ نے جواب دیا "اچھا میں سمجھ گیا تم حق بجانب ہو۔"

اس بار بادشاہ خاں کو تین سال قید سخت کی سزا دی گئی اور انھیں جیل کی ساری کڑیاں جھیلنی پڑیں ——— قید تنہائی، ہتھکڑیاں بیڑیاں پہننا، چکی پسنا وغیرہ۔ ان کا وزن پچیس پونڈ کم ہو گیا، اور جیل کی سختیوں کی وجہ سے انھیں فاسد خون اور کمر کے درد اور دوسری طرح طرح کی شکائتیں نازل ہو گئیں۔ اس کے باوجود ان کا طرزِ عمل ایک مثالی قیدی کا سا رہا وہ ہنسی خوشی جیل کے ضابطوں کی پابندی کرتے تھے کبھی کوئی رعایت نہیں چاہتے تھے، مگر کبھی اپنے اصول سے نہیں ہٹتے تھے۔ جیل کے افسر دل تنگ

پر اس با اصول نامور قیدی کی تکلیفیں دیکھ کر بہت اثر ہوا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ قاعدے کے مطابق جو سختیاں ہونی چاہئیں انھیں ڈھیلا کر دیں مگر بادشاہ خاں نے یہ درخواست کی کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ انھوں نے جیل کی بد عنوانیوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ ان کے افسر سے ایک کانسٹبل نے یہ کہہ کر استعفیٰ دے دیا کہ وہ بغیر رشوت لیئے ہوئے اپنا گذارہ نہیں کر سکتا۔ جیل کے افسر گھبرائے اور انھوں نے بادشاہ خاں کو یہاں سے منتقل کر کے پنجاب کے گجرات جیل میں بھیج دیا۔ یہاں اُن کی دیانت داری اور جیل کے ضابطوں کی پابندی دوسرے قیدیوں کے لیئے ایک مصیبت ہو گئی۔ مگر وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے۔ اس لیئے کہ وہ ایک اور مشہور قیدی ٹام کلارک کی طرح اس کے قائل تھے کہ "اگر آدمی اپنے اصول سے ہٹے تو نہ صرف حق کی بلکہ اپنی خودداری کی توہین کرتا ہے" جو سول نافرمانی کرنے والے کی سب سے بیش بہا دولت ہے۔

گجرات کے جیل میں منتقل ہونے کے بعد انھیں ایک زیادہ وسیع حلقے میں رہنے اور دوسرے مذہبوں کی مقدس کتابوں کے مطالعے کا موقع ملا۔ خصوصاً بھگوت گیتا اور سکھوں کی گرنتھ صاحب کے مطالعے کا۔ باہمی مفاہمت کی غرض سے انھوں نے اپنے ہندو ساتھیوں کے مشورے سے یہ تجویز پیش کی کہ گیتا اور قرآن کے

سبق ہوا کریں۔ یہ سبق کچھ دن تک ہوتے رہے لیکن آخر میں انھیں بند کرنا پڑا" اس لئے کہ گیتا کے سبق میں میرے سوا اور کوئی شریک نہیں ہوتا تھا اور اسی طرح قرآن کے سبق میں بھی صرف ایک ہی طالب علم تھا۔"

بہ خلاف ڈاکٹر خاں صاحب کے جو اکثر مذاق میں یہ کہا کرتے تھے کہ میرا بھائی میرے بارے کی نماز بھی پڑھ لیتا ہے"۔ بادشاہ خاں نے کبھی نماز یا روزہ قضا نہیں کیا۔ مگر اسی کے ساتھ ان کی نظر میں بڑی وسعت تھی۔ انھوں نے ایک بار مہادیو ڈیسائی سے کہا تھا" میں کسی مذہب کی قوت کا اندازہ اس کے پیرووں کی تعداد سے نہیں لگاتا ہوں اس لئے کہ عقیدہ بجائے خود کوئی چیز نہیں۔ جب تک وہ انسان کی زندگی میں نہ ظاہر ہو۔ میرا یہ ایمان ہے کہ اسلام عمل، یقین اور محبت کا نام ہے اور ان صفات کے بغیر مسلمان کا لفظ محض باجے کی ایک جھنکار ہے جس کے کوئی معنی نہیں۔ قرآن شریف میں صاف صاف آیا ہے کہ خدا کو وحدہٗ لاشریک ماننا اور نیک عمل کرنا انسان کی نجات کے لئے کافی ہے"۔

ایک اور موقع پر انھوں نے کہا تھا" میرے خیال میں ہمارے جھگڑوں کی جڑ یہ ہے کہ ہم اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ہر مذہب میں اس کے پیرووں کے لئے کافی ہدایت موجود ہے۔ قرآن میں صریحی طور پر کہا گیا ہے کہ خدا نے سب قوموں کے لئے ہدایت

کرنے والے بھیجے اور وہی ان کے پیمبر ہیں۔ در اصل سب اہل کتاب ہیں .... بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ سب مذہبوں کے بنیادی اصول ایک ہی ہیں۔ اگرچہ ان کی فروعات میں فرق ہو گیا ہے اس لئے کہ ہر مذہب اس زمین کے رنگ میں رنگ گیا جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔"

سنہ ۱۹۲۴ء اور سنہ ۱۹۲۹ء کے بیچ کا زمانہ تحریک آزادی کے لئے بڑی کش مکش کا وقت تھا۔ فرقہ وارانہ جذبات بھڑکے ہوئے تھے اور بہت سے لوگوں نے اپنا ذہنی توازن کھو دیا تھا۔ لیکن خاں بھائی اس رو میں نہیں بہے اور ان کے قدموں کو کبھی لرزش نہیں ہوئی۔ بادشاہ خاں ان تھک کوشش کرتے رہے اور انھوں نے پا پیادہ بڑے لمبے اور کٹھن سفر کرکے دیہات اور پہاڑی قلعوں میں قبائلیوں کو حق اور عدم تشدد کا پیام پہنچایا، اور بے ہتھیاروں کی لڑائی کا طریقہ، جو گاندھی جی نے پیش کیا تھا، سکھایا۔ اس کے بعد جب سنہ ۱۹۳۰ء کی کش مکش شروع ہوئی تو وہ اپنے بھائی کے ساتھ میدان میں اُتر آئے لیکن تعجب یہ ہے کہ اب تک اُن کی گاندھی جی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سنہ ۱۹۳۱ء کے اجلاس کراچی میں وہ اور اُن کے خدائی خدمت گار جن کی شہرت پہلے ہی دور دور پہنچ چکی تھی۔ پہلے پہل گاندھی جی سے اور ان کے ساتھیوں سے جو ہندوستان کے دوسرے حصوں میں کام کر رہے تھے، ملے۔

خدائی خدمت گاروں کی تحریک اصل میں ایک معاشرتی اصلاح کی تحریک تھی، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ پٹھانوں کی اور بے آئینی لوٹ مار کی عادت چھڑائی جائے۔ اور انھیں محنت، کفایت شعاری اور خود اعتمادی کا سبق پڑھایا جائے۔ انھیں باقاعدہ تعلیم دی جائے اپنی عزت کرنا اور خدا سے ڈرنا "جو ہر ڈر کے خوف کو دل سے دور کر دیتا ہے" سکھایا جائے۔ آگے چل کر ۱۹۲۹ء میں بادشاہ خاں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے والنٹروں کی چھوٹی سی جماعت کو ایک باضابطہ سیاسی جماعت بنا دیں تاکہ وہ کانگریس کے پورے پروگرام پر عمل کرے خدائی خدمت گاروں کا نصب العین، جیسا کہ اُن کے نام سے ظاہر ہے خلق خدا کی خدمت کے ذریعے سے خدا کی خدمت کرنا تھا۔ ان کو باقاعدہ ڈرل کرائی جاتی تھی اور فوجی طرز سے لمبے لمبے مارچ کرائے جاتے تھے۔ ان کے پاس کوئی ہتھیار یہاں تک کہ لاٹھی اور چھڑی تک نہ ہوتی تھی۔ وہ خدا کی ملت اور وطن کی وفاداری کا حلف اٹھاتے تھے۔ وہ سب کے سب اُس کے پابند تھے کہ خیال، قول اور عمل میں عدم تشدد سے کام لیں گے، اور اپنے ہم جنسوں کی بغیر کسی ذاتی صلے کی توقع کے خدمت کریں گے۔ انھوں نے یہ عہد کیا تھا کہ پاک بازی کی زندگی بسر کریں گے اور فرقہ پرستی سے دور رہیں گے۔ سُرخ رنگ کے کرتے پہننا انھوں نے اس غرض سے اختیار کیا تھا کہ کھادی کے سفید کرتے بہت جلدی میلے ہو جاتے تھے
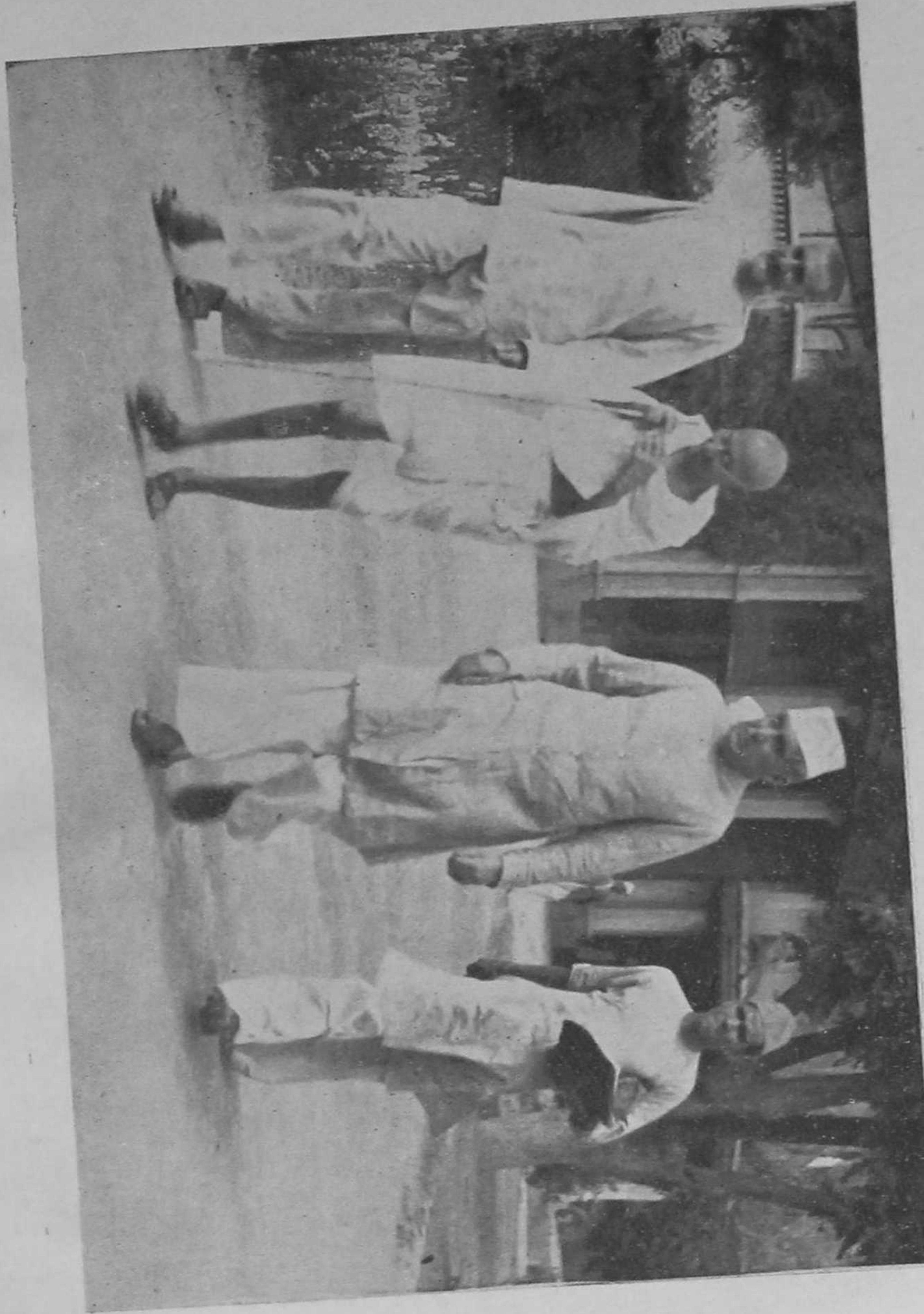
اور صوفیانہ سرخ رنگ پشاور کے آس پاس آسانی سے دستیاب ہوتا تھا (اپریل سنہ ۱۹۳۰ء تک خدائی خدمت گاروں کی تعداد پانسو سے زیادہ نہیں تھی۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں یہ تعداد ایک لاکھ سے بڑھ گئی)۔

گاندھی اروِن معاہدے کے نتیجے کے طور پر جنوری سنہ ۱۹۳۱ء میں خان بھائی رہا کر دئے گئے۔ لیکن انھیں زیادہ دن تک آزاد رہنا نصیب نہ ہوا۔ خدائی خدمت گاروں کی یہ خصوصیت ہے کہ انھوں نے گاندھی اروِن صلح کو اپنی فتح نہیں سمجھا۔ ڈاکٹر خان صاحب نے شری مہادیو ڈیسائی سے ذکر کیا تھا کہ ایک بار کوئٹے کے مشہور سر رابرٹ سینڈیمن کے بیٹے کرنل سینڈیمن اپنے گائڈ دستے کے ساتھ پشاور آئے اور ان کے انداز سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ اس صلح سے بہت ناخوش ہیں اور دوسرے برطانوی افسروں کا بھی یہی خیال ہے۔ ڈاکٹر خان صاحب جو پیدائشی اسپورٹس مین ہیں اور اپنے کالج میں کرکٹ کے کپتان تھے، کرکٹ کی روایات کو کبھی نہیں بھولے۔ انھوں نے اُن کی تسکین دیتے ہوئے کہا "نہیں کرنل سینڈیمن آپ اس خیال کو دل سے بالکل نکال دیجئے کہ آپ کو شکست ہوئی ہے۔ سیاسی زندگی ایک کھیل ہے جس میں غالب اور مغلوب کو اسی طرح تپاک سے ہاتھ ملانا چاہئے جیسے کرکٹ یا فٹ بال میں۔ اور ہمارے آپ کے معاملے میں تو فتح شکست کا کوئی سوال ہی نہیں کشتی برابر کی چھوٹی ہے۔ نہ کوئی غالب ہے اور نہ مغلوب جب دونوں ایک

دوسرے سے رخصت ہونے لگے تو کرنل نے کہا "خیر ہمارے آپ کے پرانے تعلقات ہیں مجھے امید ہے کہ میرے گائڈ دستے کو چارسدے میں کوئی ناز یبا کارروائی نہیں کرنی پڑے گی"۔ انگریز افسر اس معاہدے کو اپنی ذاتی شکست سمجھتے تھے، اور اس کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ وہ بار بار معاہدے کی خلاف ورزی کرتے تھے اور خدائی خدمت گاروں کو چین نہیں لینے دیتے تھے۔ ۲۳ر دسمبر کو چیف کمشنر نے انھیں دربار میں شریک ہونے کی دعوت دی مگر انھوں نے اس وجہ سے کہ عام خدائی خدمت گاروں پر اب تک سختیاں جاری تھیں احتجاج کے طور پر دربار میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ ۲۴ر دسمبر کی رات کو وہ قریب قریب اپنے سارے خاندان کے ساتھ ایک آرڈیننس کے ماتحت گرفتار کر لئے گئے اور صوبہ سرحد کے باہر لے جا کر ایک غیر معیّن مدت کے لئے بند کر دئے گئے۔ یہ واقعہ عین اس وقت ہوا جب گاندھی جی دوسری گول میز کانفرنس سے واپس آ رہے تھے۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۳ء کے درمیان سول نافرمانی کی دونوں تحریکوں کے دوران میں صوبہ سرحد میں نادر شاہی حکومت تھی۔ سول نافرمانی کرنے والوں کی کھیتیاں جلا دی گئیں۔ غلّے کے ذخیروں پر تیل چھڑک کر انھیں آگ لگا دی گئی، اور ان کے گھر بھی خاکستر کر دئے گئے۔ مارشل لا کا زور تھا۔ لاٹھی اور گولی چل رہی

تھی اور لوگوں کے ساتھ ایسا ذلت آمیز اور وحشیانہ برتاؤ کیا جاتا تھا جو بیان سے باہر ہے۔" سرخ پوشوں کو گولی سے مارنا صوبہ سرحد میں برطانوی فوج کے لئے شکار اور تفریح سمجھا جاتا تھا۔" وہ ننگے کرکے برطانوی سپاہیوں کی صفوں کے بیچ میں دوڑائے جاتے تھے اور یہ انھیں ٹھوکریں لگاتے تھے اور سنگینوں اور رائفلوں کی نوکیں چبھوتے تھے۔ وہ مکانوں کی چھتوں سے گرائے جاتے تھے۔ گندے تالابوں میں ڈھکیلے جاتے تھے اور ان کے ساتھ ایسی ایسی ناشائستہ حرکتیں ہوتی" تھیں کہ بعض عمر بھر کے لئے اپاہج ہو کر رہ گئے۔

پٹھان ایک خود دار اور حساس قوم ہے جو ذلت پر موت کو ترجیح دیتی ہے۔ خان بھائیوں کے ایک رشتے کے بھائی جو بعض نازک حالات سے مجبور ہو کر اپنی رہائی کے لئے ضمانت دینی پڑی، اپنی اس کمزوری پر اس قدر نادم ہوئے کہ اس کی تلافی کے لئے انھوں نے خودکشی کرلی۔ ان کے دوستوں اور عزیزوں نے ہر چند سمجھایا کہ تم قانون کی خلاف ورزی کرکے پھر جیل خانے جا سکتے ہو مگر کچھ اثر نہ ہوا، وہ یہ لکھ کر چھوڑ گئے کہ ان کی وجہ سے خاندان کی جو بے عزتی ہوئی ہے اس کی تلافی صرف ان کی موت ہی کر سکتی ہے۔

ایک اور ممتاز سیاسی کارکن سید عبدالودود باشا، جو ملاکنڈ کے قبائلی علاقے کے معزز مذہبی پیشوا اور زمیندار تھے،

تین سال سے قید تھے۔ اُن کے بوڑھے باپ نے جو مرنے کے قریب تھے، ان کی طرف سے ضمانت داخل کر دی تاکہ دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے اپنے بیٹے کی صورت دیکھ لیں۔ بیٹے نے جیل سے چھوٹ کر شرم کے مارے اپنے آپ کو گولی مار کر جان دے دی۔

ہر شخص جانتا ہے کہ پٹھان کتنے غصہ ور ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود اس سارے زمانے میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہوا جس سے خدائی خدمت گاروں پر تشدد کا الزام آ سکے۔ ان میں سے بعض نے یہ دیکھ کر اب اُن کے لئے عدم تشدد کو نبھانا مشکل ہے خود کشی کر لی۔

۱۹۳۴ء میں خان بھائی پھر رہا ہو گئے۔ لیکن صوبہ سرحد میں اُن کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ بادشاہ خاں وردھا میں گاندھی جی کے پاس آ گئے۔ انھوں نے اپنی بیٹی کو (جو تعلیم کی غرض سے انگلستان میں تھیں)، بلا کر وردھا کے مہلا آشرم میں، میرا بہن (یعنی ایڈمرل سلیڈ کی بیٹی مس سلیڈ)، کی نگرانی میں داخل کر دیا جو گاندھی جی کے طرز زندگی سے متاثر ہو کر اُن کی وفادار رفیق بن گئی تھیں۔ یہ نومبر کے آخری ہفتے کا ذکر ہے۔ ۷ دسمبر کو بادشاہ خاں بمبئی گورنمنٹ کے ایک وارنٹ کے ماتحت ایک تقریر کی وجہ سے جو انھوں نے بمبئی میں عیسائی نوجوانوں کی انجمن کی دعوت پر کی تھی، پھر گرفتار کر لئے گئے اور تین سال قید سخت کی سزا دی گئی۔
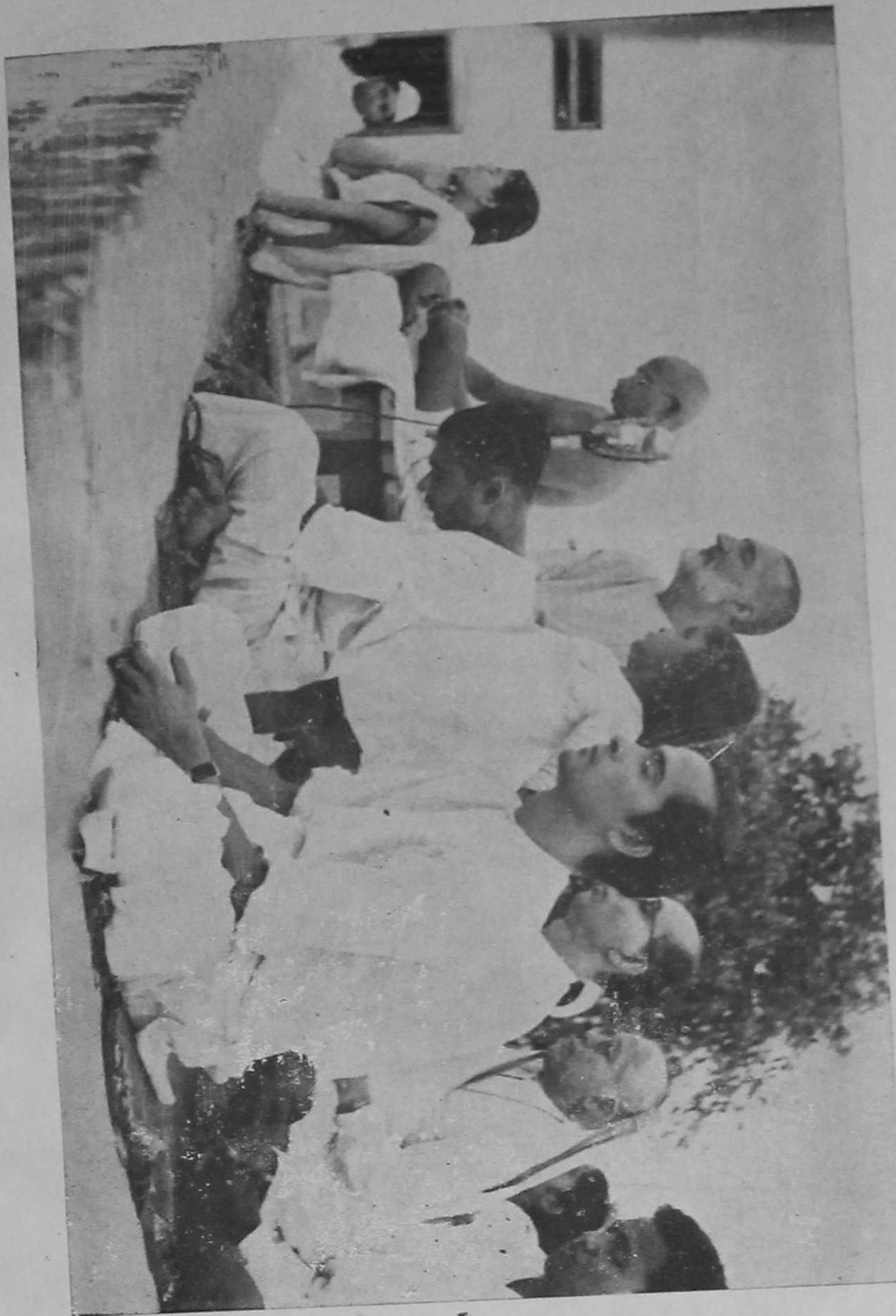
۱۹۳۶ء میں جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ پھر گاندھی جی کے پاس پہنچے۔ اس سال وہ وردھا میں سیٹھ جمنا لال بجاج کے مہمان تھے۔ لیکن اپنے وقت کا زیادہ حصہ گاندھی جی کے ساتھ سیواگرام آشرم میں بسر کرتے تھے۔ اب یہی ان کا گھر بن گیا تھا اور جب تک انھیں اپنے صوبے میں واپس جانے کی اجازت نہیں ملی یہیں رہے یہ دونوں کے لئے بہت اچھا اور قابل قدر موقع تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہونے کا موقع ملا اور ان میں دوستی کا رشتہ قائم ہو گیا۔ اور یہ دوستی روز بروز زیادہ گہری ہوتی ہوگئی۔

اس طویل رفاقت کے زمانے میں ان دونوں کا گھل مل کر باتیں کرنا، ایک دوسرے کے ساتھ انتہائی قدر و عزت کا برتاؤ کرنا اور اپنی اپنی واردات قلب ایک دوسرے سے بیان کرنا۔ یہ ایسے منظر تھے کہ حافظہ اب تک ان سے لطف اٹھاتا ہے۔ گاندھی جی جنھیں فرقہ وارانہ اتحاد سے عشق تھا۔ بادشاہ خاں کو ساری مسلم جماعت کا نمونہ سمجھتے تھے۔ بادشاہ خاں سے بڑھ کر سچا مسلمان اس سے زیادہ متقی، دین دار، صاف دل، مخلص اور وفادار آدمی کہاں مل سکتا تھا۔ اور بادشاہ خاں کو جو چیز گاندھی جی کی طرف کھینچتی تھی وہ ان کی شہرت یا ان کی سیاسی خدمات نہ تھیں۔ اس محبت اور عقیدت کا راز جو انھیں گاندھی جی سے تھی یہ تھا کہ وہ ان کے روحانی ہم مشرب تھے۔ خدا پرست اور عبادت گذار، پاک باز

اور مرتاض، سدا حق سے لو لگانے والے اور چھوٹے سے چھوٹے کام میں اس کی مرضی پر چلنے والے۔

ایک بار بادشاہ خان نے کہا "اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایک مسلمان یا پٹھان میری طرح عدم تشدد کا قائل ہو۔ یہ کوئی نیا عقیدہ نہیں ہے۔ اب سے چودہ سو سال پہلے پیغمبر اسلام نے اپنی ساری مکی زندگی میں اس پر عمل کیا اور ان کے بعد سب لوگ جو کسی ظالم کے ظلم سے نجات پانا چاہتے تھے اس پر عمل کرتے تھے لیکن ہم اسے ایسے بھولے کہ جب گاندھی جی نے ہمارے سامنے پیش کیا تو ہم یہ سمجھے کہ وہ کسی انوکھے عقیدے کی تلقین کر رہے ہیں......

ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے ہمیں یہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور اسے قوم کے سامنے رکھا کہ وہ اسے اپنی شکایتوں کی چارہ جوئی کے لئے استعمال کرے۔"

انھوں نے فرمایا "جب گاندھی جی کی زندگی میں کوئی معرکے کا وقت آتا ہے اور وہ کوئی اہم فیصلہ کرتے ہیں، تو میں اپنے دل میں کہتا ہوں۔ یہ اس شخص کا فیصلہ ہے جس نے اپنے آپ کو خدا کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ اور خدا کبھی کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔"

ایک اور موقع پر کہا "میرے لئے یہ آسان نہیں کہ ان کے فیصلے میں چون و چرا کروں، اس لئے کہ وہ ہر معاملے میں خدا سے ہدایت چاہتے ہیں۔ اور ہمیشہ اس کے حکم پر چلتے ہیں۔ میرے پاس

تو ایک ہی پیمانہ ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان نے اپنے آپ کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیا ہے"۔

۱۹۳۷ء میں کانگریس نے یہ فیصلہ کیا کہ ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے ماتحت ان وعدوں کی بنا پر جو وائسرائے نے کئے تھے صوبوں میں وزارتیں قبول کرے۔ خان بھائی اپنے ہاں کے انتخابات میں حصہ نہیں لے سکے اس لیے وہ حکم جس کی رو سے انھیں صوبہ سرحد میں داخل ہونے کی ممانعت تھی اب تک نافذ تھا پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی انتخابات کی مہم کے سلسلے میں اس صوبے میں قدم رکھنے دیا گیا حالانکہ مسلم لیگ والوں کو جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے آئے تھے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ سرکاری افسروں نے کھلم کھلا خان بھائیوں اور کانگریس کے خلاف کام کیا۔ اس کے باوجود ڈاکٹر خان صاحب کو بڑی اکثریت حاصل ہوئی اور وہ اپنی عدم موجودگی میں صوبے کی کونسل کے ممبر منتخب ہو گئے۔ ستمبر ۱۹۳۷ء میں انھوں نے وزیر اعظم کی حیثیت سے صوبہ سرحد میں کانگریسی وزارت بنائی اور وہ لوگ جو کل تک راندۂ قانون تھے، اپنے وطن کے حاکم بن گئے۔

فقیر منش بادشاہ خاں نہ تو الکشن کے لئے کھڑے ہوئے اور نہ اپنے بھائی کی وزارت میں شریک ہوئے۔ اس کے بجائے انھوں نے خدمت کی کٹھن راہ اختیار کی۔ ان کو یہ یقین ہو گیا

تھا کہ سوا اس عدم تشدد کے جس کی گاندھی جی نے تعلیم دی ہے اور کسی چیز کے ذریعے سے ان کی قوم پوری اخلاقی ترقی نہیں کر سکتی۔ اس میں خدمت کا جذبہ اور عدم تشدد کا عقیدہ کتنا گہرا تھا۔ اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے ہوگا جو ینگ انڈیا میں شائع ہوا تھا۔

"عدم تشدد قریب قریب میرا عقیدہ بن گیا ہے۔ میں مہاتما گاندھی کی اہنسا کو پہلے ہی مانتا تھا۔ لیکن میرے صوبے میں جو بے نظیر کامیابی اس تجربے میں ہوئی اس کی وجہ سے میں عدم تشدد کا دل سے قائل ہو گیا ہوں۔

"مجھے یقین ہے کہ انشاءاللہ میرا صوبہ پھر کبھی تشدد کی راہ پر نہیں چلے گا۔ ہم اس کے خونی بیر کی وجہ سے جس کے لئے ہم بدنام ہیں، عدم تشدد کے تلخ نتائج اچھی طرح جانتے ہیں ہماری طبیعت میں بڑا تشدد ہے۔ عدم تشدد کی تربیت حاصل کرنے میں خود ہمارا ہی فائدہ ہے۔ اس کے علاوہ پٹھان صرف محبت سے اور معقول بات سے خوش ہوتا ہے۔ اگر آپ اس کا دل ہاتھ میں لے لیں تو وہ آپ کے ساتھ جہنم میں چلا جائے گا۔ لیکن زبردستی آپ اُسے جنت میں بھی نہیں لے جا سکتے۔ محبت سے پٹھان قابو میں آجاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پٹھان دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کریں جو وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے ان کے ساتھ کریں۔ ممکن ہے
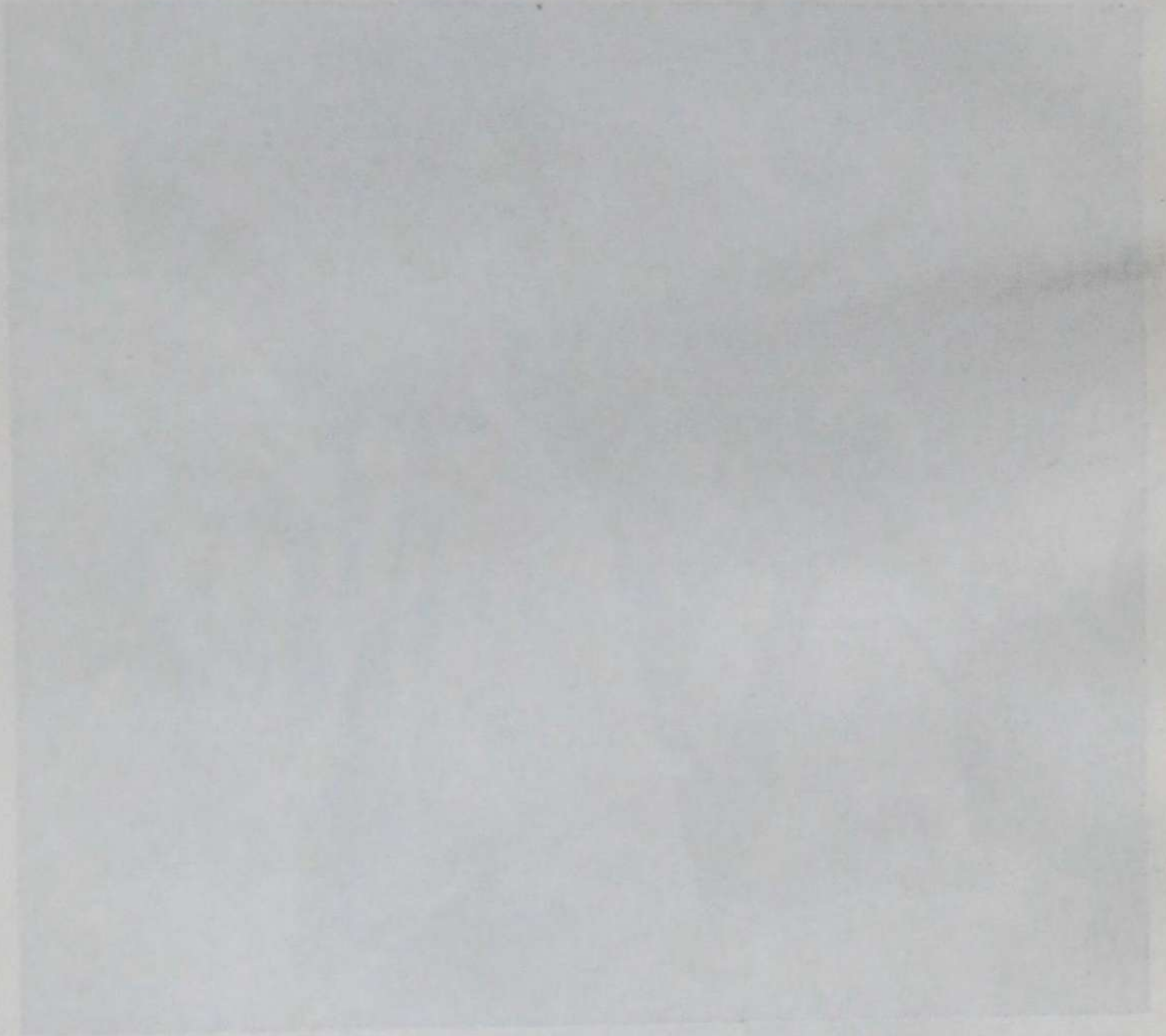
کہ میں ناکام رہوں اور میرے صوبے میں تشدّد کی ایک لہر دوڑ جائے میں قسمت کے فیصلے کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہوں، لیکن اس سے میرے عدم تشدد کے عقیدے میں ذرا بھی تزلزل نہیں ہوگا۔ اس چیز کی میری قوم کو اور سب لوگوں سے زیادہ ضرورت ہے"۔

پندرہ برس تک بادشاہ خاں انگریزوں سے لڑتے رہے تھے۔ اس پر بھی ان کے دل میں تلخی کا شائبہ تک نہ تھا۔ انھوں نے ۱۹۳۱ء کی صلح کے دوران میں رابرٹ برنیز سے ایک انٹرویو کے دوران میں کہا تھا "اگرچہ انگریزوں نے مجھے قید کیا تھا لیکن میں اُن سے نفرت نہیں کرتا۔ میری تحریک صرف سیاسی نہیں بلکہ سماجی بھی ہے۔ میں سُرخ پوشوں کو یہ تعلیم دیتا ہوں کہ اپنے ہمسایوں سے محبت کریں اور سچ بولیں۔ مسلمان ایک جنگ جو قوم ہے وہ عدم تشدد کے عقیدے کو آسانی سے ماننے والے نہیں ہیں میں انھیں اس کے سکھانے کی اپنی سی کوشش کر رہا ہوں"۔

اس رات کو "ننگے فقیر" کے مصنف نے اپنی ڈائری میں عبدالغفار خاں کے متعلق یہ رائے لکھی تھی :-

"عبدالغفار خاں ایک نیک دل، حلیم اور قابلِ محبت آدمی ہیں۔ ان کو ایک خطرناک انقلابی سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے بوڑھے جارج لینس بری کو"۔

اگلے سال ۱۹۳۸ء میں بادشاہ خاں نے گاندھی جی کو دعوت دی کہ وہ اُن کے صوبے کا دورہ کریں اور خدائی خدمت گار تحریک کی رہنمائی فرمائیں۔ کانگریس وزارت کے قائم ہونے سے صوبہ سرحد میں ایک عجیب صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ اس صوبے میں برطانوی افسروں خصوصاً پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کو کانگریسی حکومت کا قائم ہونا بہت ناگوار تھا۔ وہ قبائلیوں کے ذریعے سے کانگریسی وزارت پر دباؤ ڈالنا چاہتے تھے۔ اس میں انھیں اس دوعملی کی وجہ سے جو صوبہ سرحد میں تھی بہت مدد ملی مثلاً گورنر بحیثیت صوبائی حکومت کے صدر کے تو آئین کی رو سے اس کا پابند تھا کہ وزیروں کے مشورے کے مطابق کام کرے لیکن قبائلی علاقوں کے معاملے میں وہ صرف وائسرائے کے ماتحت تھا، اور اس سے براہ راست تعلق رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ضلع کے کاموں میں تو وزارت کے ماتحت تھے لیکن قبائلی علاقے کے منتظم کی حیثیت سے براہِ راست پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے سامنے ذمہ دار تھے۔ اور بغیر مجلس قانون ساز یا وزارت کی منظوری اور علم کے بالا بالا جو چاہیں کر سکتے تھے۔ وزارت کے تعلقات پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ اور فوج سے بگڑے ہوئے تھے اور اس کی وجہ سے سرکاری ملازموں کے کام میں اور ضبط میں ڈھیل پائی جاتی تھی، اور جرائم بڑھ گئے تھے۔ ۱۹۳۹ء کے

آخر میں جب برطانوی کیبنٹ کے ۱۵ مئی کے اعلان کے مطابق مرکز میں عارضی حکومت قائم ہوئی اور پنڈت جواہر لال نہرو اس کے وائس پریسیڈنٹ کی حیثیت سے صوبہ سرحد میں ملاکنڈ ایجنسی کے دورے کے لئے گئے تو ان کی موٹر کار پر قبائلیوں نے کمین گاہ سے جو حملہ کیا اس کے بارے میں یہ شبہہ تھا کہ اس میں سرکاری افسروں کا ہاتھ ہے اور متعلقہ پولیٹیکل افسر کو اپنے فرض میں غفلت کرنے کی بنا پر سزا دی گئی۔ اس مخالفت کی ایک مخصوص علامت بنوں کا چھاپہ اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں کا فساد تھا۔ سنہ ۲۰-۱۹۱۹ء سے ۳۷-۱۹۳۶ء تک کی سرکاری انتظامی رپورٹوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صوبے کے افسر سیاسی شورش کا علاج فرقہ وارانہ فساد کو سمجھتے تھے مثلاً سنہ ۱۹۱۹ء کی صوبہ سرحد کی رپورٹ کو لیجئے:-

"ستمبر کے ابتدائی دنوں میں صوبہ سرحد کی سیاسی جدوجہد سرد پڑ گئی جس کی بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ عبدالغفار خاں یہاں موجود نہ تھے۔ وہ مسٹر گاندھی سے ملنے شملے گئے تھے، اور کچھ دن پنجاب میں ٹھیرنے کے بعد سیدھے ڈیرہ اسمٰعیل خاں پہنچے جہاں انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں صلح کرانے کی ناکام کوشش میں ایک ہفتہ صرف کیا" اور آگے چل کر یہ عبارت ہے:-

"اس عرصے میں ضلع میں سیاسی حیثیت سے بہت سکون رہا"

اس وقت کی وزارت کے اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ اور فوج کے آپس کے تعلقات بگڑ جانے کا یہ اثر ظاہر ہو رہا تھا کہ سرکاری ملازم احکام کی تعمیل نہیں کرتے تھے اور بدامنی بڑھ گئی تھی بو۱۹۴۶ء کی تیسری سہ ماہی میں پنڈت نہرو اس عارضی حکومت کے نائب صدر کی حیثیت سے جو ۱۵ مئی کے اعلان کے مطابق قائم ہوئی تھی، صوبہ سرحد میں تشریف لائے) اس موقع پر خدائی خدمت گاروں نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ دس میل لمبے راستے کے دونوں طرف تھوڑی تھوڑی دور کے فاصلے پر ان کی قطار اس سرے سے اس سرے تک چلی گئی تھی۔ لیکن ملاکنڈ ایجنسی میں بعض قبائلیوں نے ان کی کار پر کمین گاہ سے حملہ کیا۔ شبہہ یہ تھا کہ اس معاملے میں سرکاری ملازموں کا ہاتھ ہے، اور متعلقہ پولیٹیکل افسر کے خلاف ادائے فرض میں غفلت کا الزام لگا کر اسے سزا دی گئی۔ اب سوال یہ تھا کہ کانگریس کی عوامی حکومت ایسی صورت میں کیا کرے؟ قبائلیوں کو زبردستی دبانے کی کوشش پہلے کئی بار ہو چکی تھی اور ناکام رہی تھی۔ برطانوی حکومت نے ان پر گولہ باری بھی کی تھی جس سے ساری مہذب دنیا کو سخت دھچکا لگا، لیکن اس سے بھی قبائلیوں کو دبانے میں کامیابی نہیں ہوئی۔

جینوا میں ۱۹۳۳ء میں جو کانفرنس ہوائی ترک اسلحہ کے لئے ہوئی تھی۔ اس میں مسٹر انتھنی ایڈن نے برطانیہ کی طرف سے یہ

درخواست کی تھی کہ "بعض دور دراز علاقوں میں قیام امن کے لئے جو بم باری کی جاتی ہے ، اس کو ممانعت سے مستثنیٰ کردیا جائے" ان کی دلیل یہ تھی کہ اس کے سوا اور کوئی صورت ہے تو صرف یہی کہ خشکی کی فوج سے کام لیا جائے جس میں زیادہ خون ریزی کا اندیشہ ہے۔ "فوجی مہم کے بھیجنے سے جان کا اور صحت کا بڑا نقصان ہوتا ہے ؛" اور ہوائی بم باری میں عام طور پر محض دھمکی کافی ہوتی ہے اور اس کا امکان ہے کہ کسی کے مرنے یا زخمی ہونے کی نوبت نہ آئے ؛" امریکہ کے نمایندے مسٹر ولسن نے اس کی مخالفت کی اور اس بات پر اصرار کیا کہ ہوائی بم باری کا ترک "قطعی غیر مشروط اور عالم گیر" ہونا چاہیئے۔

لفٹنٹ جنرل میک من نے صوبہ سرحد پر جو کتاب لکھی ہے اس کے صفحہ ۲۷۳ ، ۲۷۴ میں ہوائی بم باری کے مقابلتہً غیر موثر ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" عہد جدید کی مایوسیوں میں سے ایک یہ ہے کہ ہوائی فوج اس مسئلے سے نبٹنے میں ناکام رہی۔ اُمید تھی کہ شاید اس سے مسئلہ حل ہو جائے گا۔ مگر بہت جلد معلوم ہو گیا کہ قبائلی حملہ آوروں اور گل چلوں پر ہوائی بم باری کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا..... تعزیری بم باری بھی بے کار ثابت ہوئی۔ بغیر پہلے سے آگاہ کئے ہوئے بم باری کی جائے تو خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں اور جو

پہلے سے آگاہ کر دیا جائے تو بم باری کرنے کے کوئی معنی نہیں۔

اب رہا یہ عذر کہ قبائلی بم باری سے ہلاک نہیں ہوتے، اس لیے کہ انھیں پہلے سے آگاہ کر دیا جاتا ہے تو اس خدا ترس انگریز چارلی اینڈریوز کا قول سنئے:-

"پہلی آگاہی انھیں پہلے بم سے ہوتی ہے جو ہوائی جہاز سے اُن پر گرایا جاتا ہے"

(صوبہ سرحد کا چیلنج ص ۹۴)

ایک تجربہ کوئٹہ کے مشہور افسر رابرٹ سین ڈیمن نے کیا تھا کہ قبائلی علاقے میں پر امن طریقے سے داخل ہو کر قبائل کے سرداروں کی ہمت افزائی کی جائے اور اخلاقی اور مادی فائدے پہنچا کر انھیں اندر سے قابو میں لایا جائے" مگر یہ بھی کوئی اچھی بات نہ تھی۔ قطع نظر اس سے کہ اس کی وجہ سے فرسودہ جاگیر داری نظام کو تقویت پہنچی تھی۔ یہ بجائے خود سامراج کا ایک پہلو تھا آخر یہی طریقہ تو تھا جس سے برطانوی حکومت نے آہستہ آہستہ اور غیر محسوس طور پر اس سارے علاقے کا الحاق کر لیا جو اب بلوچستان کا صوبہ کہلاتا ہے اور درۂ گومل تک راستہ صاف کر دیا حالانکہ پنجاب کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ والے مدت سے وزیرستان کے پہاڑوں کے سامنے پڑے ہوئے تھے اور آگے نہیں بڑھ سکے تھے۔ ڈلہوزی کے وقت سے ہر مصنف نے پٹھان قبائلیوں کے

جمہوری طریق زندگی اور اُن کے آزادی کے جذبے کا اعتراف کیا تھا۔ تو پھر کیا تعجب ہے کہ وہ سینڈیمن کی پالیسی کو اپنی آزادی کے لئے جو انھیں دل سے عزیز تھی، خطرناک سمجھتے تھے۔

بنوں مشن کے ڈاکٹر پینل نے کچھ اور ہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ پٹھانوں کے درمیان جا کر بس گئے اور محبت اور بے نفسی کے ساتھ ان کی خدمت کر کے انھیں عیسائیت کی طرف راغب کرتے تھے۔ وہ ان کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے، ان کا سا لباس پہنتے تھے، اُن کی زبان بڑی بے تکلفی سے بولتے تھے اور آخر انھوں نے اُن ہی لوگوں کی خدمت کرتے کرتے جان دی۔ وہ ہمیشہ بڑے سے بڑے سرکش پہاڑوں کے درمیان تنہا پھرتے تھے۔ اور ایک بار جب ایک فوجی افسر نے اس پر اصرار کیا کہ وہ اپنے ساتھ ایک محافظ دستہ لے جائیں تو انھوں نے کہا کہ اس طرح تو لوگ یقیناً کمین گاہ سے گولی چلا کر مجھے مار ڈالیں گے اُن کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ اکیلے پینل "دو فوجی رجمنٹوں کے برابر ہیں"۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ امن کے اس علم بردار کا کتنا زیادہ اثر تھا۔

لیکن ڈاکٹر پینل کی یہ مہم محض ایک انفرادی کوشش تھی اور اس میں بھی ان کو عیسائی بنانے کی غرض پوشیدہ تھی۔ اس سے بھی اس اہم ترین سوال کا، جو اس دلی صفت انگریز اینڈریوز نے

کہا تھا، جواب نہیں ملتا" کیا ان تشدد کے طریقوں کے مقابلے میں جو آج تہذیب کو تباہ کر رہے ہیں، اخلاقی مزاحمت کی کوئی گنجائش ہے؟ کیا چینیوں کے لئے کوریا، منچوریا شمالی چین میں اس طریقے سے جاپان کے تسلط کو روکنا ممکن تھا؟ کیا اس سے اطالوی کی جارحانہ پیش قدمی روکی جا سکتی تھی؟ کیا اسپین سے کام لیا جا سکتا تھا؟ وہ کون سا طریقہ ہے جس سے دنیا کے ضمیر کو جارحانہ اقدام کرنے والے کے خلاف اس طرح اُبھارا جائے کہ اس کی کامیابی اخلاقی شکست بن جائے۔ کیا اخلاقی دنیا میں کوئی ایسی تدبیر ہے جس کی تاثیر جسمانی قوت پر منحصر نہ ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ اس اخلاقی تدبیر سے کام لے کر ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر قبائلیوں میں امن قائم کیا جا سکے"۔

بادشاہ خاں اور ان کی خدائی خدمت گار تحریک نے اس سوال کا جواب ایک حد تک دے دیا تھا۔ اب گاندھی جی وہاں جا کر یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ سرے سے یہ سوال ہی باقی نہ رہے۔

پانچواں باب

دہلی سے ایک خط

کشمکش

اپنے ہونے والے میزبان خان عبدالغفار خاں صاحب سے ایک عرصے تک خط و کتابت کرنے کے بعد آخر ستمبر ۱۹۳۸ء میں گاندھی جی سیوا گرام سے اس ارادے سے روانہ ہوئے کہ صوبہ سرحد کے خدائی خدمت گاروں کے درمیان ایک مہینہ گزاریں۔ یہ اس وعدے کا ایفا تھا جو گاندھی جی نے خاں صاحب سے کیا تھا۔

اس اُمید پر کہ گاندھی جی راستے میں دہلی ٹھیریں گے، وہاں کانگریس ورکنگ کمیٹی اور دو اور کمیٹیوں یعنی آل انڈیا چرخا سنگھ اور جلیانوالا باغ یادگار کمیٹی کے جلسوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ گاندھی جی کے دوستوں کو بڑی فکر تھی کہ کہیں ان جلسوں میں شریک ہونے سے اُن کی صحت پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ ورکنگ کمیٹی کا یہ جلسہ ایسے وقت میں ہو رہا تھا جب یورپ کے آسمان

ایک یادگار موقع پر انھوں نے لکھا تھا" اگر ہندوستان نے تلوار اُٹھالی تو یہ وہ ہندوستان نہیں رہے گا جس کا میں خواب دیکھتا ہوں اور مجھے یہی کرنا پڑے گا کہ اپنے دکھے ہوئے دل کو سکون دینے کے لئے ہمالیہ کی راہ لوں "۔ دہلی میں کچھ دوست گاندھی جی سے ملنے کے لئے آئے۔ اُن سے گفتگو کے دوران میں انھوں نے فرمایا" کچھ بھی ہو جائے ہم حکومت کے آگے جھکنے کے نہیں۔ اگر حکومت سارے اختیارات کانگریس کے سپرد کردے تب بھی میں تو لڑائی سے الگ ہی رہوں گا، چاہے اور کوئی میرا ساتھ نہ دے "۔ ایک اور دوست نے یہ شبہہ ظاہر کیا کہ خطرے کے وقت آپ کی خالص اہنسا کی پکار پر شاید ہی کوئی کان دھرے۔ اُن کے جواب میں گاندھی جی نے فرمایا" پچاس سال پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ ہوائی جہاز سچ مچ اُڑنے لگیں گے؟ بیس سال پہلے اس ملک میں کون کہہ سکتا تھا کہ ہزار ہا بے گناہ مرد عورت اور بچے ہنستے کھیلتے جیل جانے پر تیار ہو جائیں گے؟ اہنسا سے ہتھیار کا کام لینے کے لئے فوق البشر ہستیوں کی ضرورت نہیں یہی معمولی مٹی کے پتلے اس ہتھیار کو چلا سکتے ہیں اور چلا چکے ہیں، بہر حال ورکنگ کمیٹی کے پندرہ ممبر اہنسا کا امتحان دینے کو تیار ہیں۔ مجھے تو اس کی بھی اُمید نہ تھی "۔ فی الحال یہ نازک وقت ٹل گیا ہے۔ مگر اس نے گاندھی جی کو چونکا دیا ہے۔ وہ اب اس

پر جنگ کی گھٹا چھائی ہوئی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب برسا ہی چاہتی ہے اس اہم ترین مسئلے پر بڑے زور شور سے بحث ہوتی رہی۔ لیکن ابھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہونے پایا تھا کہ دم بھر میں بادل چھٹ گیا اور مطلع صاف ہوگیا۔ کانگریس میں بعض لوگ اس خیال کے بھی تھے کہ انگلستان کی مشکلات سے فائدہ اُٹھاکر اچھے سے اچھا سودا کرلینا چاہیئے۔ مدتوں کے انتظار کے بعد ایسا موقع آیا ہے۔ لیکن گاندھی جی کے لیے یہ سخت روحانی کشمکش کا وقت تھا۔ خود اُن کے لیئے اور ہندوستان کے لیئے آزمائش کی گھڑی تھی۔ اگر اس سودے میں ہندوستان سب کچھ پا جائے مگر اپنا ضمیر کھو بیٹھے تو کیا فائدہ؟ کوئی چوتھائی صدی سے گاندھی جی ملک کو اہنسا کا سبق پڑھا رہے تھے۔ اب ان کی عمر بھر کی تعلیم کا نتیجہ نکلنے والا تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ کانگریس اس نازک وقت میں کیا کرتی ہے؟ آیا اس میں اتنی ہمت اور طاقت ہے کہ جنگ یورپ کے پر آشوب دور میں اپنے خالص اہنسا کے عقیدے پر عمل کرکے دکھادے؟ گاندھی جی نے ایک دوست سے کہا: "اگر کانگریس اس موقع پر اپنے اہنسا کے عقیدے پر پورا پورا عمل کرے تو ہندوستان کا نام امر ہو جائے گا۔ اس کا یہ کارنامہ دنیا کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ ابھی تک یہ محض میرا ایک خواب ہے"!

مسئلے پر گہرا غور کر رہے ہیں ۔ انھوں نے اہنسا کا سبق یورپ کو بھی دینا شروع کر دیا ہے ۔ چنانچہ وہ ایک مضمون میں فرماتے ہیں :-

" اگر میں چیکوسلواکیہ کا رہنے والا ہوتا تو ان دونوں قوموں دفرانسیسوں اور انگریزوں) کو اپنے ملک کی حفاظت کی ذمہ داری سے آزاد کر دیتا ۔ مجھے کسی قوم یا جماعت کا دست نگر ہو کر رہنا گوارا نہ ہوتا ، میں تو کامل آزادی حاصل کرتا یا فنا ہو جاتا ۔ ہتھیاروں سے مقابلہ کر کے جیتنے کی کوشش کرنا تو محض اجڈپن ہے ۔ ہاں یہ ایک دوسری چیز ہے کہ جو لوگ میری آزادی چھیننا چاہتے ہیں ان کی طاقت کو خاطر میں نہ لا کر میں اُن کی مرضی کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دوں اور اس کشمکش میں نہتا مارا جاؤں ۔ اس طرح میں اپنا جسم قربان کر دوں گا لیکن اپنی روح یعنی اپنی عزت کو بچا لوں گا ۔ اب تک ہٹلر اور اس جیسے لوگوں کی اُمیدیں اس تجربے پر مبنی ہیں کہ لوگ ہمیشہ طاقت سے دب جاتے ہیں ۔ نہتے مردوں ، عورتوں اور بچوں کا بغیر تشدد اور بغیر نفرت کے مزاحمت کرنا اُن کے لئے ایک انوکھا تجربہ ہوگا ۔ کون یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے ؟ کہ بہتر اور پاکیزہ تر قوتوں سے متاثر ہونا ان کی فطرت ہی میں نہیں ہے آخر ان کے جسم میں بھی وہی روح ہے جو میرے جسم میں ہے ۔ (۸-۱۰-۳۸)

ایک اور مہربان فرماتے ہیں "تم جو کچھ کہتے ہو وہ تمھارے لئے تو ٹھیک ہے مگر تم یہ توقع کیسے کر سکتے ہو کہ تمھاری قوم اس انوکھی دعوت پر لبیک کہے گی۔ ان لوگوں نے تو لڑنے کی تربیت پائی ہے............

میں اس کا یہ جواب دیتا ہوں — "شاید ایسا ہی ہو مگر مجھے تو اس دعوت پر لبیک کہنا ہی ہے۔ جب میں نے جنوبی افریقہ میں پہلی بار ستیہ گرہ کی تحریک شروع کی تو میرا کوئی رفیق نہ تھا لیکن قوم کی عزت بچ گئی، جنوبی افریقہ کی ستیہ گرہ نے تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اس سے زیادہ موزوں مثال عبدالغفار خاں صاحب کی ہے، جو اپنے آپ کو خدائی خدمت گار کہتے ہیں۔ اور جنھیں پٹھان فخرِ افغان کہہ کر خوش ہوتے ہیں۔ اس وقت جب میں یہ لکھ رہا ہوں، وہ میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے کہنے سے ہزاروں پٹھانوں نے اپنے ہتھیار پھینک دئے۔ خان صاحب کا خیال ہے کہ انھوں نے عدم تشدد کے نظریئے کو جذب کر لیا ہے، مگر اپنے ساتھیوں کے بارے میں انھیں ابھی تک یقین نہیں۔ یہاں اس حلف کے الفاظ نقل کرتا ہوں جو یہ امن کے سپاہی اٹھاتے ہیں:۔

(۱) میں یہ حلف اٹھا کر خلوص اور دیانت داری سے اپنے آپ کو خدائی خدمت گاروں میں بھرتی ہونے کے لئے پیش کرتا ہوں۔

(۲) میں ہمیشہ قوم کی خدمت، اور ملک کی آزادی کی خاطر تن من دھن قربان کر دینے کو تیار رہوں گا۔

(۳) میں کسی فرقہ بندی میں شریک نہ ہوں گا۔ نہ کسی سے جھگڑا کروں گا، اور نہ دشمنی رکھوں گا۔ میں ہمیشہ مظلوم کو ظالم کے جور و ستم سے بچاؤں گا۔

(۴) میں کسی دوسری جماعت میں شریک نہیں ہوں گا اور عدم تشدد کی لڑائی کے دوران میں نہ کبھی ضمانت داخل کروں گا، نہ معافی مانگوں گا۔

(۵) میں ہمیشہ اپنے افسروں کے ہر جائز حکم کی تعمیل کروں گا۔

(۶) میں ہمیشہ عدم تشدد کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کروں گا۔

(۷) میں ساری نوع انسانی کی یکساں خدمت کروں گا۔ میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوگا کہ ملک کو کامل خود مختاری اور سب کو مذہبی آزادی حاصل ہو۔

(۸) میں اپنے ہر عمل میں سچائی اور پاک بازی کو ملحوظ رکھوں گا۔

(۹) میں اپنی خدمات کے لئے کسی صلے کی توقع نہیں رکھوں گا۔

(۱۰) میری ساری خدمات خدا کی راہ میں ہوں گی۔ ان کا مقصد جاہ و منصب یا نمود و نمائش نہیں ہوگا۔

میں صوبہ سرحد میں اس لئے آیا ہوں بلکہ یوں کہنا چاہیئے

کہ خان عبدالغفار خاں صاحب مجھے اس لئے یہاں لائے ہیں کہ جو
کچھ اُن کے آدمی کر رہے ہیں اُسے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں،
اتنا تو میں ابھی سے کہہ سکتا ہوں کہ ان لوگوں میں عدم تشدّد
بس واجبی ہی واجبی ہے، اُن کے پاس تو لے دے کے ایک
ہی دولت ہے یعنی وہ عقیدہ جو اپنے رہنما پر رکھتے ہیں۔ یہ نہ
سمجھئے گا کہ میں امن کے ان سپاہیوں کو مکمل مثال کے طور پر
پیش کر رہا ہوں۔ میں ان کا ذکر اس سلسلے میں کر رہا ہوں کہ ایک
سپاہی دوسرے سپاہیوں کو امن کی راہ دکھانے کی سچے دل
سے کوشش کر رہا ہے۔ اس کی میں تصدیق کر سکتا ہوں کہ یہ ایک
پر خلوص کوشش ہے اور خواہ اس میں کامیابی ہو یا ناکامی
اس سے آنے والے زمانے کے ستیہ گرہی سبق لیں گے۔ اس
وقت تو میرا مقصد صرف یہ ہے اُن کے دل میں یہ بات اُتر جائے
کہ اگر عدم تشدد ان کے اندر اس سے زیادہ بہادری کا احساس
نہ پیدا کر سکے جتنا ہتھیاروں اور ان کے استعمال کی طاقت رکھنے
سے ہوتا ہے تو انھیں اپنے عدم تشدد کو خیرباد کہہ دینا چاہئے
اس لئے کہ پھر وہ عدم تشدد نہیں بلکہ بزدلی ہے، پھر تو انھیں
اپنے ہتھیار دوبارہ سنبھال لینا چاہیئے .... اور
ظاہر ہے کہ اس سے ان کو خود ان کے ارادے کے سوا اور
کوئی اور چیز روکنے والی نہیں .... سب سے بڑی

بہادری یہ ہے کہ انسان دنیا کی ہر طاقت کے سامنے خواہ وہ کتنی ہی زبردست کیوں نہ ہو، جھکنے سے انکار کر دے۔ اور اس انکار میں تلخی نہ ہو، بلکہ وہ اس عقیدے میں ڈوبا ہوا ہو کہ زندگی صرف روح کو حاصل ہے، اور کسی چیز کو نہیں۔

چھٹا باب

سرحدی گاندھی
کے
گاؤں میں

خان عبدالغفار خان اور اُن کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب
کی مہمان نوازی کا کرشمہ ہے کہ گاندھی جی کی صحت کے بارے میں
جو اندیشے تھے ان کے برعکس انھیں صوبہ سرحد کی آب و ہوا سے
بہت فائدہ پہنچ رہا ہے۔ ابھی تک سردی بہت زیادہ نہیں ہے،
ہوا میں خوش گوار خنکی ہے۔ ان کے میزبان اُنھیں زیادہ سے زیادہ
آرام لینے کا موقع دے رہے ہیں۔ ان سے زیادہ ہمدرد اور
دلسوز "جیلر" گاندھی جی کو آج تک نصیب نہیں ہوا تھا۔ اُنھوں
نے گاندھی جی کو پوری آزادی دے رکھی تھی۔ کہ اپنا مسلسل خاموشی
کا نسخہ استعمال کریں، جس طرح جی چاہے اپنا وقت گزاریں
نہ کوئی عام جلسے ہوتے ہیں اور نہ ملاقاتیں، گفتگو بھی قریب قریب

بند ہے یہاں تک کہ پرچے لکھ کر بھی اظہار خیال نہیں کرتے ۔ ایمرسن کی بابت کہا جاتا ہے کہ جب وہ انگلستان میں چیلسی کے حکیم کارلائل سے ملنے کو گیا تو دونوں میں سے کسی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اس خاموش ملاقات کے بعد ایمرسن نے چلتے وقت کہا "جناب ہماری گفتگو خوب رہی" اس کے جواب میں کارلائل نے جو خاموشی کی برکتوں کا دل سے قائل تھا، صرف اتنا کہا "جی ہاں اور کتنی فصیح و بلیغ" مجھے یقین ہے کہ اگر گاندھی جی چاہتے تو بادشاہ خاں اس کے لیئے تیار ہو جاتے کہ انھیں ایسا "دورہ" کرائیں جس میں ذرا بھی نقل و حرکت نہ ہو۔ ان کا ایسا پروگرام بنائیں جس میں کوئی مصروفیت نہ ہو، اور آخر میں اُن سے یہ کہلائیں "جناب ہمارا دورہ خوب رہا"

جب تک بادشاہ خاں کے چاروں طرف اُن کے وطن کے جانے پہچانے مناظر نہ ہوں، اور نہ اپنے علاقے کی تازہ ہوا اور آزاد فضا میں سانس نہ لے سکیں۔ ان کی طبیعت شگفتہ نہیں ہوتی۔ صرف بادشاہ خاں ہی کی نہیں، ہر پٹھان کی یہی فطرت ہے بڑے شہروں کی آبادی، جذبات پرست، ریاکار اور خود غرض ہوتی ہے، اور بادشاہ خاں کو ان چیزوں سے چڑ ہے۔ اسے لیئے وہ گاندھی جی کو چار روز کے قیام کے بعد ۹ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کو پشاور سے اپنے اتمان زئی کے مکان میں لے آئے۔

نہایت خوش نما مرغزار کے درمیان دریائے سوات کے کنارے

اتمان زئی کا چھوٹا سا گاؤں خاص دل کشی رکھتا ہے۔ آس پاس میلوں تک مکئی، گنے، دال کی پھلیوں اور کپاس کے ہرے بھرے کھیت چلے گئے ہیں۔ اور ان کے بیچ میں پھل دار درختوں کے باغ ہیں جن میں طرح طرح کے بہترین پھل۔ سُرخ ملٹے، آڑو، آلوچے، انگور، خوبانی اور سیب پھلتے ہیں۔ زمین زرخیز ہے اور پانی افراط سے ہے اس لئے کہ دریائے سوات سارے علاقے کو سیراب کرتا ہے اور اس کے بے شمار چھوٹے چھوٹے آبشاروں کی سُریلی آواز دن رات فضا میں گونجتی رہتی ہے۔ گاؤں کے ایک سرے پر ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد بنی ہے۔ یہاں قدامت کی ایک عجیب فضا نظر آتی ہے جس پر زمانے کی بدلی کا کوئی اثر نہیں۔ گاؤں کے غریبوں، امیروں۔ سب کے مکانات عام طور پر کچے ہیں۔ اُن کی دیواریں چوڑی اور چھتیں موٹی موٹی لکڑیوں سے پٹی ہوئی ہیں جس کی وجہ سے وہ گرمی میں ٹھنڈے اور جاڑوں میں گرم رہتے ہیں۔ بعض مکان اب بھی پرانے پٹھان طرز کے بنائے جاتے ہیں جن میں آگے ایک حجرہ اس کے بعد ایک اصطبل اور سب سے پیچھے رہنے کا مکان ہوتا ہے۔ حجرے میں آج کل نوکر رہتے ہیں لیکن پرانے زمانے میں یہ گاؤں کے کلب کا کام دیتا تھا جہاں مرد جمع ہو کر گپ شپ کرتے تھے اور حقہ پیتے تھے کنوارے نوجوان اپنے گھر کے بجائے یہاں سونا زیادہ پسند

کرتے تھے مجھے بتایا گیا کہ پرانے زمانے میں جب بدامنی کا دور دورہ تھا۔ اصطبل میں دن رات گھوڑے کسے کسائے تیار رہتے تھے۔ تاکہ ضرورت کے وقت خان دم بھر میں سوار ہو کر روانہ ہو جائے۔ آج کل اعلیٰ درجے کی پکی سڑکوں کی وجہ سے جن کا صوبہ سرحد میں جال بچھا ہوا ہے اور آمدورفت کی روز افزوں آسانیوں کی بدولت قریب قریب سب اصطبل خالی نظر آتے ہیں۔ ہاں کہیں کہیں کوئی گھوڑوں کا شائق اب بھی پرانی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ سڑکیں صوبہ سرحد پر برطانوی سامراج کی فوجی مصلحتوں کی وجہ سے بطور تحفے کے نازل ہوئی ہیں اور اُن کا خرچ مفت میں غریب ہندوستانی رعایا کے سر پر آن پڑا ہے۔ سول نافرمانی کے زمانے میں پکی سڑکیں جرم بغاوت کے انعام اور سزا دونوں کا کام دیتی تھیں۔ جو گاؤں عدم تشدد کی جنگ میں زیادہ سرگرمی دکھاتا وہاں تک ایک پکی سڑک بنا دی جاتی تاکہ گاؤں والوں کی آسانی سے گوشمالی کی جا سکے۔ گاؤں میں نہ باقاعدہ نالیاں ہیں، نہ بدرو اور نہ ہی میونسپلٹی کی طرف سے گندے پانی کے نکالنے کا کوئی بندوبست۔ گلیوں کے بیچ میں ایک چوڑا سا نالہ آہستہ آہستہ بہتا چلا جاتا ہے بیچ میں کہیں کہیں اس کا پانی پھیل جاتا ہے اور سیاہ بدبودار

کیچڑ کے چھڑے لگ جاتے ہیں۔ تھوڑی دور جا کر وہ بالکل رک جاتا ہے اور ہوا کو معطر کرتا ہے۔ لوگ ابھی تک صفائی کی قدر وقیمت سے واقف نہیں۔ ان سب باتوں کا گاندھی جی کے دل پر بہت اثر ہوا اور آگے چل کر انھوں نے پشاور میں خدائی خدمت گاروں سے جو گفتگو کی وہ اس موضوع پر تھی۔

گاندھی جی کے قیام میں اتمان زئی کے بارے میں ایک چھوٹی سی بات غلط مشہور ہو گئی ہے اور اس نے کئی دوستوں کو پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ یہاں اس کو صاف کر دینا ضروری ہے۔ چونکہ بادشاہ خاں کو گاندھی جی کی حفاظت کی بہت زیادہ فکر تھی اس لئے اُن کے قیام اُتمان زئی کے دوران میں بادشاہ خاں اپنے مکان کی چھت پر راتوں کو خدمت گاروں کا پہرہ لگا دیتے تھے۔ اس سے پہلے بادشاہ خاں نے گاندھی جی سے اس کے متعلق گفتگو کی تھی، مگر اپنی تجویز انھیں نہیں بتائی تھی۔ انھوں نے صرف یہ پوچھا تھا کہ کیا آپ کو پہرہ لگانے پر کچھ اعتراض ہے۔ گاندھی کا خاموشی کا دن تھا۔ انھوں نے بغیر یہ جانے ہوئے کہ ان پر کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہونے والی ہے اشارے سے کہا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بادشاہ خاں نے اس کے معنی یہ سمجھے کہ وہ اس پر راضی ہیں کہ رات کو مسلح پہرہ لگا دیا جائے مگر جب گاندھی جی کو معلوم ہوا

کہ مسلح گارڈ تعینات کیا گیا ہے تو انھوں نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ میں دوسروں کے لئے چوکی پہرے کے خلاف نہیں ہوں مگر یہ گوارا نہیں کرسکتا کہ میری حفاظت کے لئے مسلح گارڈ سے کام لیا جائے۔ یہ تو میرے عمر بھر کے معمول کے خلاف ہوگا۔ بادشاہ خان نے یہ سوال سوچا تھا کہ چونکہ ہتھیار صرف ان لوگوں کو دھمکانے کے لئے ہیں جن سے نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے اور اُن سے کام لینا مقصود نہیں ہے اس لئے غالباً گاندھی جی کو ان کے رکھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اس مسئلے پر دونوں میں بڑی دلچسپ گفتگو ہوئی۔

گاندھی جی نے کہا "خان صاحب یہ بات جو آپ نے کی اس پر مجھے ایک حکایت یاد آتی ہے۔ ایک دفعہ سانپ اللہ میاں کے پاس گیا۔ اللہ میاں نے کہا میں تیرا زہر نکال لیتا ہوں۔ سانپ نے کہا۔ چاہے زہر نکال لے، مگر پھنکار میرے پاس رہنے دے۔ اللہ میاں نے کہا۔ اگر پھنکار رکھنی ہے تو زہر بھی رکھ مگر آدم کی اولاد تجھے مار ڈالے گی۔ سو آپ نے بھی پھنکار باقی رکھی تو پھر بات ہی کیا ہوئی۔ پہرہ اگر رکھنا پڑے تو بے شک رکھو مگر بندوق کو تو چھوڑنا ہی پڑے گا۔ کچھ دن ہوئے سیواگرام میں بھی ایک ایسا ہی قصہ ہوگیا تھا مگر میں نے کہہ دیا تھا کہ مجھے پولس کی حفاظت کی ضرورت نہیں، مرنا تو ایک روز ہے ہی

تو پھر چاہے کوئی ہاتھ سے مار ڈالے یا بیماری سے مر جائے اس میں فرق کون سا ہوا؟"

بادشاہ خاں :- "ہم صرف ایک آپ کی ذات کی حفاظت تھوڑا ہی کرتے ہیں ۔ آپ کی حفاظت میں تو ہندوستان کی حفاظت آجاتی ہے ۔ ہمارے صوبے کی آبرو کی حفاظت آجاتی ہے ۔ اگر آپ کو کچھ نقصان پہنچا تو ہمارے صوبے کو ہمیشہ کے لئے بٹہ لگ جائے گا ۔

گاندھی جی کے نزدیک یہ چھوٹا سا واقعہ ایک اندر بڑے مسئلے پر روشنی ڈالتا ہے جو ہمیں درپیش ہے ۔ جس طرح سے ایک ستیہ گرہی اپنی ذات کی حفاظت میں ہتھیار سے کام نہیں لیتا ۔ اسی طرح ہندوستان تشدد سے پاک سوراج حاصل کرنے کے لئے اس قابل ہونا چاہیئے کہ سرحد پار کے قبائل کے حملوں سے اپنے آپ کو بغیر پولیس اور فوج کی مدد کے محفوظ رکھ سکے ۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں صوبہ سرحد میں ایک لاکھ خدائی خدمت گار ہیں جنھوں نے عدم تشدد کا حلف اُٹھایا ہے ۔ گاندھی جی نے کہا کہ اگر ان لوگوں کا عدم تشدد محض وقتی مصلحت یا زبانی جمع خرچ نہیں ہے بلکہ بہادروں کا سچا عدم تشدد ہے تو ان کو اس قابل ہونا چاہیئے کہ سرحد پار کے حملہ آوروں کو محبت اور خدمت کے ذریعے اپنا دوست بنا لیں اور ان کی غارت گری کی عادت چھڑا دیں ۔ اگر ایسا ہوا تو وہ ہندوستان کو آزاد کرا لیں گے اور ساری دنیا کے لیئے نمونہ بن جائیں گے ۔

چھ مہینے بھی صرف ہو جائیں تو مجھے اس کی پروا نہیں کیوں کہ میں چاہتا ہوں کہ جس راستے پر مجھے چلنا ہے وہ صاف نظر آجائے میں جو کچھ بھی کر سکتا ہوں اسی صورت میں۔ جنوبی افریقہ میں مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ کون میرا ساتھ دے گا اور کیا نتیجہ ہوگا مگر مجھے اس کی کچھ پروا ہی نہ تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ کام مجھے کرنا ہے اور اگر اس میں میری جان بھی جائے تو کچھ حرج نہیں۔ کیونکہ مجھے راستہ صاف نظر آرہا تھا۔ بس میں اللہ کا نام لے کر میدان میں آگیا۔ اور اس کا نتیجہ بھی اچھا نکلا۔ اس سے پہلے چینی وہاں سے نکالے جا چکے تھے۔ ہماری تعداد چینیوں سے کہیں کم تھی اور ہم گولی سے اڑائے جا سکتے تھے۔ اور جنرل سمٹس نے جدوجہد کے شروع میں اعلان بھی کیا تھا کہ میں ان لوگوں کو یہاں سے نکالے بغیر نہ رہوں گا۔ مگر آخرکار اسی جنرل سمٹس کو کہنا پڑا کہ "ان لوگوں پر کتنا بھی تشدد کروں یہ عداوت کا جواب عداوت سے نہیں دیتے مارنے پر بھی جواب میں ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ اگر وہ گالی کا جواب گالی سے دیں تو میری تشدد کرنے کی طاقت بڑھتی ہے مگر یہاں تو مجھے سمجھوتا کئے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔"

یہاں تو بادشاہ خاں جیسی ایمان دار اور خدا پرست ہستی ہمارے ساتھ ہے۔ انھوں نے ہزاروں پٹھانوں سے ہتھیار چھڑا دیئے۔ آگے چل کر کیا ہوگا، یہ میں نہیں جانتا، ہو سکتا ہے کہ ان

گاندھی جی نے بادشاہ خاں سے گفتگو کے دوران میں اپنے دل کی بات بتائی۔ انھوں نے کہا کہ "اگر کانگریس کی وزارت بغیر پولس اور فوج کی مدد کے ان حملوں کی روک تھام نہ کر سکے تو ڈاکٹر خان صاحب کو وزارت سے استعفیٰ دے دینا چاہیے۔ اگر ہمارا یہی رویہ رہا تو ہم دن بدن کمزور ہوتے جائیں گے اور آخر میں شکست کھائیں گے۔ عقل مند آدمی شکست کا انتظار نہیں کرتا۔ اس سے پہلے ہی سمجھ جاتا ہے کہ یہاں میری دال نہیں گلے گی۔ اور رخصت ہو جاتا ہے برسوں سے جب کہ میری آپ سے جان پہچان بھی نہ تھی، میری یہ آرزو تھی کہ قبائلی علاقے میں جاؤں، کابل تک پہنچوں اور ان ڈاکوؤں کے ساتھ جا کر رہوں اور ان سے پوچھوں کہ کیوں آپ لوگ ایسے کام کرتے ہیں۔ یہ میرا ایک پرانا خواب ہے۔ آئیے ہم اور آپ یہ کیوں نہ کریں کہ اُن کے پاس چلیں، اُن کی ذہنیت کو سمجھیں اپنا نقطۂ نظر اُن کے سامنے پیش کریں اور اُن سے دوستی اور ہمدردی کا زندہ رشتہ قائم کریں۔ امن قائم کرنے کی اصلی تدبیر یہی ہے اگر ہم ایسا کر سکیں، تبھی سُرخ پوشوں کا جو یہ اتنا بڑا لشکر ہم نے بنا رکھا ہے کسی کام کا ہے ورنہ بے کار ہے" پھر سُرخ پوشوں کے سالاروں کو مخاطب کر کے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے گاندھی جی نے کہا "میرے یہاں آنے کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ میں یہ سمجھنے کی کوشش کروں کہ خدائی خدمت گار کیا ہیں۔ اگر اس میں

خدائی خدمت گاروں میں سب کے سب خدا کی خدمت کرنے والے نہ ہوں گا۔ پھر بھی جتنا کچھ ہے وہی بہت ہے۔ کیا اگر ان میں سے کسی کو ابلتے ہوئے تیل کے کڑھاؤ میں جھونک دیا جائے تو وہ خدا کا نام لیتا ہوا بغیر کسی قسم کے ڈر کے یا بدلہ لینے کے خیال کے جان دے دے گا؟ یہ تو بڑا اونچا درجہ ہے۔ تلوار سے لڑنے میں بھی بے شک بہادری ہے۔ مگر مارنے سے زیادہ بہادری مر جانے میں ہے جو بغیر ڈر کے دشمن کو ایذا پہنچائے بغیر مرتا ہے، وہی سچا بہادر ہے اور وہی میرے نزدیک سچا شہید ہے۔ مار کر مرنے والا نہیں۔ اگر ہمارا گرا ہوا ملک اتنا کر دکھائے تو یورپ کی تو بات ہی کیا ہے۔ ان کے پاس تو اتنا ساز و سامان ہے۔ اگر وہ لوگ اس بات کو سمجھ لیں کہ تھوڑی تعداد میں ہوتے ہوئے ہتھیار لے کر نکلنے میں تو بہادری ہے ہی۔ مگر اس سے کہیں زیادہ بہادری بغیر ہتھیار کے نکلنے میں ہے تو وہ لوگ خود بھی بچ سکتے ہیں اور دنیا کو بھی ایک بڑا سبق سکھا سکتے ہیں۔

انھوں نے خان صاحب سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں خدائی خدمت گاروں سے دل کھول کر بات چیت کروں تاکہ میں ان سے اور وہ مجھ سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ چنانچہ وہ اتمان زئی کی چارسدہ تحصیل میں تیرہ سالاروں سے، گیارہ اور بارہ تاریخ کو ملے اور پشاور میں پندرہ تاریخ کو

ایک اور جماعت سے۔ دونوں جگہ ان لوگوں نے گاندھی جی کے سوالات
کے جواب میں انھیں یقین دلایا کہ وہ عدم تشدد کے اصول کو دل سے
مانتے ہیں اور پوری طرح سے مانتے ہیں یہاں تک کہ جب گاندھی
جی نے اُن سے پوچھا کہ بہ فرض محال اگر بادشاہ خاں عدم تشدد
کی راہ سے قدم ہٹالیں تو تم کیا کروگے ؟ تو انھوں نے صاف
کہہ دیا کہ ہم کسی حال میں عدم تشدد کو نہیں چھوڑیں گے۔

خدائی خدمت گاروں کے افسروں کے ساتھ تبادلۂ خیالات
کرتے ہوئے گاندھی جی نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ ہے :-

میں یہاں آپ سے ملنے کے لئے اور یہ دیکھنے کے لئے آیا ہوں
کہ آپ عدم تشدد میں کہاں تک پکے ہیں۔ بادشاہ خاں سے آپ
کو عقیدت ہے۔ اُن کے کہنے سے آپ نے لاٹھی بندوق چھوڑ دی
ہے۔ خدا ان کو بہت دنوں تک سلامت رکھے۔ لیکن آخر کار ہم سب
کو ایک نہ ایک دن اس دنیا سے جانا ہوگا اور بادشاہ خاں کو بھی
یہ دن پیش آئے گا۔ سوال یہ ہے کہ ان کے بعد آپ کیا کریں گے۔

ابھی سے اخباروں میں لوگ بادشاہ خاں کو گالیاں دینے
لگے ہیں مجھے ان سے بھی زیادہ گالیاں دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں
کہ میں یہاں آپ لوگوں کی طاقت چھیننے کے لئے آیا ہوں۔ صوبہ سرحد
ہی ایک ایسا صوبہ ہے جسے ہندوستان میں اسلام کی حفاظت
کی دیوار کہا جاسکتا ہے۔ یہاں کے لوگ بہادر ہیں، لاٹھی اور بندوق

رکھتے ہیں۔ میں ہتھیار چھین کر انھیں بزدل بنادوں گا، نکما بنادوں گا اور اسلام کی اس دیوار کو گرادوں گا۔ ایک حد تک میں ان کی بات تسلیم کرنے کو تیار ہوں، لیکن اگر آپ عدم تشدد کی طاقت کو سمجھ گئے ہیں تو بندوق اور لاٹھی چھوڑنے پر آپ اپنے اندر پہلے سے بھی کچھ زیادہ طاقت محسوس کریں گے۔ یہ طاقت روحانی ہوگی اس کے ذریعے سے آپ صرف اسلام ہی کو نہیں بلکہ باقی سب مذہبوں کی بھی حفاظت کرسکیں گے لیکن اگر آپ اس کو پوری طرح نہیں سمجھے اور ہتھیار چھوڑ کر اپنے کو پہلے سے زیادہ طاقت ور نہیں بلکہ کمزور محسوس کرتے ہیں تو آپ اس اصول کو چھوڑ دیں۔ میرے اثر میں اگر ایک بھی پٹھان بزدل یا نکما بنے۔ اس کو میں کبھی گوارا نہیں کروں گا۔ اس سے تو مجھے یہ اچھا لگے گا کہ آپ ایک کے بجائے دو بندوق رکھیں آج سکھ کہتے ہیں کہ اگر ہماری کرپان چھن گئی تو ہمارا سب کچھ چھن گیا وہ سمجھتے ہیں کہ کرپان ہی ان کا مذہب ہے۔ کرپان چھوڑ دیں گے تو بزدل بن جائیں گے۔ میں اُن سے کہتا ہوں کہ ان کا یہ خیال غلط ہے اور یہی بات میں مسلمانوں سے بھی کہتا ہوں۔ آپ نے قرآن شریف پڑھا ہے، اور میں نے بھی پڑھا ہے، اتنی ہی عقیدت کے ساتھ جیسی عقیدت سے گیتا پڑھتا ہوں۔ اس کے علاوہ انگریزی اردو زبان میں اسلام پر اور بھی اچھی اچھی کتابیں ہیں، وہ بھی پڑھی ہیں میرے دل میں اسلام کی اور دوسرے مذہبوں کی اتنی ہی عزت

ہے جتنی اپنے مذہب کی۔ میں آپ سے پھر دوسرے الفاظ میں یہ کہنا
چاہتا ہوں کہ گو اسلام میں خون ریزی تو بہت ہوئی ہے اور
دین کے نام پر ہوئی ہے۔ مگر اسلام نہ تو تلوار کے ذریعے آیا ہے
نہ تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ اسی طرح عیسائیت کے لئے بھی بہت
تلوار چلی ہے، لیکن عیسائی مذہب تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔ ہاں
تلوار ہاتھ میں لے کر ان لوگوں نے مذہب کے نام کو بٹہ ضرور لگایا
ہے۔ آج یورپ میں کروڑوں آدمی اپنے آپ کو عیسائی کہنے اور
حضرت عیسیٰ کی محبت کا دم بھرنے کے باوجود آپس میں لڑتے اور ایک
دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں یہ حضرت عیسیٰ کا بتایا ہوا راستہ نہیں
بلکہ ان کی تعلیم کا مضحکہ ہے۔ جو چیزیں میں نے بتائیں اگر آپ اسے
سمجھ گئے ہیں تو آپ یورپ کو بھی راستہ دکھا سکتے ہیں وہاں کے
لوگوں پر بھی اپنا اثر ڈال سکتے ہیں۔ آج سترہ ہزار انگریزوں کا
لشکر ہمارے اوپر حکمراں ہے، کیونکہ ان کے پیچھے انگریزی سلطنت
کی طاقت ہے۔ اگر ہمارے سرخ پوش پکے خدائی خدمت گار
ہیں، تلوار، بندوق کو چھوڑ کر ان میں جو روحانی طاقت آگئی ہے
اسے محسوس کرنے لگے ہیں اسے پہچان گئے ہیں۔ تو ایسے صرف
دس ہزار سپاہی ہماری آزادی کے لئے کافی ہیں، کیونکہ ان کی پیٹھ
پر خدا کی طاقت ہوگی۔ لیکن اگر ایک لاکھ کیا دس لاکھ بھی زبان سے
عدم تشدد کا دعویٰ کریں، اور دل میں تشدد موجود ہو تو وہ نکمے

ثابت ہوں گے۔ ہمیں اگر تلوار چھوڑنی ہے تو اس لئے کہ وہ ہمیں بزدل بناتی ہے، سچا بہادر نہیں بناتی۔ لیکن اگر تلوار چھوڑنے کے بعد بھی جو چھوڑنے کی چیز تھی وہ ہم نے نہ چھوڑی اور ہمارے دل میں تشدد ہی بھرا رہا تو اس صورت میں صرف ہاتھ سے تلوار چھوڑ دینا نہ صرف بے سود بلکہ خطرناک بھی ہے۔

دل سے تشدد نکال دینے کے آخر کیا معنی ہیں؟ اگر دل میں ڈاکو کی طرف سے غصہ اور ڈر موجود ہے تو سمجھو کہ ابھی دل سے تشدد دور نہیں ہوا۔ عدم تشدد کو پہچاننے کے معنی ہیں کہ ہم اس کی طاقت کو پہچانیں۔ روحانی قوت کو پہچانیں، اور خدا کو پہچانیں۔ خدا کو پہچاننے والے کے دل میں غصہ آ ہی نہیں سکتا۔ ڈر رہ ہی نہیں سکتا۔ خواہ اشتعال اور ڈر کا سبب کتنا ہی بڑا ہو۔ آپ میری لڑکی کو چھیننا چاہتے ہیں تو میں کیا کروں؟ بندوق سے مقابلہ تو کر سکتا ہوں، مگر دل میں یہ سوچوں گا کہ میری یا کسی اور انسان کی طاقت کیا۔ اصل طاقت تو خدائی ہے اور آخر میں وہی بچاتا ہے میں لڑوں گا نہیں بلکہ میں ڈاکو سے کہوں گا کہ میں نے تیرا کچھ نہیں بگاڑا، اور نہ میری لڑکی نے کچھ بگاڑا ہے۔ اگر اس کے باوجود بھی تو اسے چھین کر لے جانا چاہتا ہے تو میرے جیتے جی ایسا نہیں کر سکتا پہلے مجھے مار ڈال پیچھے شاید لے جا سکے۔ میں سوچوں گا کہ اگر میں لڑا اور دو ایک کو مار بھی ڈالا تو بھی آخر میں جو باقی رہیں گے وہ

مجھے مار ڈالیں گے اور لڑکی کو اٹھا کر لے جائیں گے۔ اس کے برعکس میں نہیں لڑوں۔ کسی پر غصہ نہ کروں بلکہ صرف خدا سے دعا کرتا رہوں کہ انھیں سیدھا راستہ دکھائے، اور اسی طرح دعا کرتے کرتے مر جاؤں تو ممکن ہے کہ ڈاکوؤں کا دل پگھلے یا میری مثال سے میری لڑکی میں بھی اتنی ہمت اور طاقت آجائے کہ وہ اپنی حفاظت کے لئے جان دینے کو تیار ہو جائے۔ لڑنے سے زیادہ بہادرانہ اور پُر اثر یہ راستہ ہے، لڑکر بھی میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا۔ جو آدمی تلوار چھوڑے اُسے بے کار نہ رہنا چاہئے۔ بے کار رہنے سے دماغ میں طرح طرح کے فاسد خیالات آتے ہیں جس سے انسان کا اخلاق بگڑتا ہے دماغ بھی جس نے تشدد کو چھوڑا ہے وہ تو چوبیس گھنٹے خدا کا نام لے گا اور خدا کا کام کرے گا۔ بے کار یا برے خیالات اس کے دل میں کبھی نہیں آسکتے۔ آج سرحد پار کے رہنے والے بعض لوگوں کا پیشہ ڈاکہ زنی ہے۔ چونکہ ان کے ہاں کھانے کو نہیں ہے۔ اسی لئے وہ ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ پھر دشمنی اور بعض دوسری باتیں اس میں شامل ہو جاتی ہیں۔ اگر ہمارے پاس ایک لاکھ خدائی خدمت گار ہیں اور وہ سچے خدائی خدمت گار ہیں تو وہ ضرور ان لوگوں پر اپنا اثر ڈالیں گے۔ جیسا کہ رسول ناغربائی کے زمانے میں ہوا تھا، وہی اب بھی ہوگا۔ اور ڈاکہ زنی وغیرہ سب ختم ہو جائے گی۔

جیسے بندوق کی لڑائی کے لئے تیاری کی ضرورت ہوتی ہے اور بہت کچھ سیکھنا پڑتا ہے۔ ویسے ہی عدم تشدد کے لئے تیاری اور تعلیم کی ضرورت ہے۔ مگر وہ تعلیم فوجی تعلیم سے مختلف ہوگی اور وہ تعلیم ہوگی تعمیری کام کی اور خلق خدا کی خدمت کی۔ ہمیں لکھنا پڑھنا آنا چاہیئے۔ تاکہ ہم ملک کے دوسرے حصوں میں رہنے والے ہم وطنوں کے خیالات، ضروریات، دقتوں اور مصائب سے واقف ہو سکیں۔

میرے نزدیک آج کل کی صورتِ حالات میں خدمت خلق کا بہترین ذریعہ چرخہ ہے جسے میں نے ۱۹۰۸ء میں دریافت کیا تھا مجھے یقین ہے کہ چرخے کو کھو کر میں نے اپنی طاقت کھو دی ہے۔ اسے اختیار کر کے ہم اپنی کھوئی ہوئی طاقت حاصل کر سکیں گے خدائی خدمت گار کا مطلب صرف سرخ پوش ہونا اور قطار میں کھڑا ہونا ہی نہیں بلکہ اس خدائی طاقت کو محسوس کرنا ہے جو تلوار کی طاقت کی ضد اور اس سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ ابھی جب کہ آپ صرف عدم تشدد کے دروازے ہی پر ہیں اور اتنا کچھ کر سکتے ہیں تو جب عدم تشدد کی عمارت کے اندر داخل ہوں گے تو کتنا کچھ کر سکیں گے مگر جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اس کے لئے تعلیم اور تیاری کی ضرورت ہے۔ اگر آپ نے یہ نہیں کی، اور یہ بات آپ کے ذہن میں نہیں بیٹھی تو آپ اس چیز سے ہاتھ دھو ڈالیں۔ آپ کو سمجھنا چاہیئے کہ جیسے

فن جنگ کا ایک علم ہے ویسے ہی عدم تشدد کا بھی علم ہے۔ جیسے یورپ نے فن جنگ کو درجۂ تکمیل تک پہنچایا ہے ویسے ہی ہمیں عدم تشدد کو بھی کرنا ہوگا۔ اس کے لئے مطالعے کی ضرورت ہے، فکر کی ضرورت ہے۔ غور و خوض کی ضرورت ہے۔ چھان بین کی ضرورت ہے۔ اگر اس علم کو بھی ہم پوری طرح حاصل کرنا چاہتے ہیں، یورپ پر اپنا اثر ڈالنا چاہتے ہیں اور حیوانیت کے درجے سے آگے بڑھ کر انسانیت کا درجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے صرف عدم تشدد ہی کا راستہ ہے۔

بادشاہ خاں — یہاں کچھ پٹھان ہیں جو ہمارے خدائی خدمت گاروں کو بہت تکلیف دیتے ہیں۔ انھیں مارتے ہیں۔ ان کی زمینیں چھین لیتے ہیں۔ اس صورت میں یہ لوگ کیا کریں۔؟

گاندھی جی — انھیں یہ سب باتیں صبر اور تحمل سے برداشت کرنی ہوں گی۔ جو سختیاں پہلے انگریز کیا کرتے تھے وہی اب یہ لوگ کرتے ہیں۔ اس لئے ہمارا رویہ ان لوگوں کے ساتھ بھی وہی ہونا چاہیے جو سرکارِ انگریزی کے ساتھ تھا۔ ہمیں تشدد کا جواب تشدد سے اور گالی کا جواب گالی سے نہیں دینا چاہیئے۔ ہمیں دل میں غصہ بھی نہیں لانا چاہیئے۔ اس طرح مخالف لوگ ضرور ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔ نہیں تو ہم اُن کے ساتھ عدم تعاون کریں گے۔ اگر ہم ان کی زمینوں پر کام کرتے ہیں تو انھیں چھوڑ دیں گے اور اُن سے

کہیں گے کہ اچھا جتنی سختی ہو کرلو مگر ہم اب تمھاری زمینوں میں کام نہیں کریں گے۔ اپنی آن کو نہیں چھوڑیں گے، اور محنت مزدوری کرکے پیٹ بھریں گے۔ اگر فاقہ کشی کی نوبت آئے گی تو اسے بھی برداشت کریں گے۔ مگر آپ کی تابعداری نہیں کریں گے۔ اپنے ضمیر کا خون نہیں ہونے دیں گے۔

بادشاہ خاں —— مقدمہ کرکے پولس کی مدد سے انھیں سزا دلوانا ہمارے لئے جائز ہے؟

گاندھی جی —— سچے خدائی خدمت گار کو عدالت میں نہیں جانا چاہئے۔ عدالت میں جانے کا تو یہی مطلب ہوا نا کہ ہم ایک طرح سے نہیں تو دوسری طرح سے اُن سے لڑ رہے ہیں پولس سے سزا دلوانا بھی تو ایک قسم کا انتقام ہے؟ سچے خدائی خدمتگار کو یہ نہیں کرنا چاہئے۔ میں حال کا ایک واقعہ بتاتا ہوں۔

سیواگرام میں کچھ ہریجن لوگ میرے پاس آئے اور کہا کہ ایک ہریجن ذریعہ کو سی۔پی کی وزارت میں داخل کرادو، نہیں تو ہم تمھارے دروازے پر چھ کر ستیہ گرہ کریں گے۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک شریر شخص کی سازش ہے۔ پولس سپرنٹنڈنٹ نے میری مدد کے لئے پولیس بھیجنی چاہی کیوں کہ اس کو غنڈوں کی طرف سے خدشہ تھا۔ مگر میں نے انکار کردیا۔ اور ان لوگوں سے کہہ دیا کہ یہاں جس کمرے پر چاہو قبضہ کرسکتے ہو۔ کھانے کی ضرورت ہوگی تو وہ بھی کھلاؤں گا لیکن

تم مجھے میرے اصول کے خلاف کوئی کام کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ تمھاری ہٹ دھرمی کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ انھوں نے میری بیوی کا برآمدہ اور غسل خانہ پسند کیا۔ وہ ہم نے اُنھیں دے دیا۔ ہم ان کی دیکھ بھال کرتے تھے، ان کی ضرورتیں پوری کرتے کوئی بیمار ہوتا تو تیمارداری بھی کرتے تھے۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہمارے دوست بن گئے

تشدد کا برداشت کرنا عدم تشدد کا پہلا قدم ہے۔ آخری نہیں۔ خدائی خدمت گاروں کا نظام فوجی طرز پر بنا ہے۔ مگر اُن کے اور ملٹری کے کام میں بہت فرق ہے۔ فوج میں جو جگہ قواعد کی ہے وہی عدم تشدد میں خدمت خلق اور اس کی تیاری مثلاً فرسٹ ایڈ دیہاتوں کی صفائی، ہندوستانی زبان وغیرہ کی تعلیم کی ہے۔ خدائی خدمت گار کے پاس روزی پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ ہونا چاہیے جو چھن نہ سکے۔ جیسے کتائی، بنائی یا کوئی اور دستکاری۔ بغیر سزا کا طریقہ اختیار کئے ہوئے جرائم پیشہ لوگوں کو سدھارنے کا یہ واحد ہتھیار ہے

خدائی خدمت گاروں کے افسروں کے ساتھ گاندھی جی کی بات چیت:-

"میں یہاں اس لئے آیا ہوں کہ آپ لوگوں سے ملوں۔ آپ لوگ جو کہیں وہ سنوں، اور لوگ آپ کے بارے میں جو کہتے ہیں وہ بھی

گیا جن کی پیدائش ہندوستان کی تھی۔ واپس بھیج دیا گیا۔ وہ
لوگ خاموشی سے چلے آئے، اور سب کچھ شانتی سے برداشت کیا
گولی بھی کھانی پڑی تو اُسے ہنس کر برداشت کر لینے۔ یہاں ہم
کروڑوں کی تعداد میں ہیں اور محض ستر ہزار انگریز ہم پر حکومت
کر رہے ہیں۔ یہ کیوں؟ یہ صرف اس لئے کہ ہم لوگوں نے عدم تشدد
کی طاقت کو منظم نہیں کیا۔

آپ نے مجھے یقین دلایا ہے، اور میں آپ کا یقین کرتا ہوں
کہ آپ عدم تشدد کو سمجھتے ہیں اور اس پر قائم رہیں گے۔ اگر سچ مچ
آپ کی ایک لاکھ کی تعداد ایسے ہی لوگوں کی ہے تو ان کے ذریعے
کیا نہیں کیا جا سکتا؟ کانگریس میں تو آج کل کچھ مطلبی لوگ بھی گھس
آئے ہیں۔ مگر آپ ایک لاکھ آدمی صرف خدمت ہی کے لئے آئے
ہیں۔ اس میں آپ کی کوئی ذاتی غرض نہیں ہے۔ پیسہ آپ کو نہیں
ملتا۔ کپڑے تک بھی اپنے پاس سے بنوانے پڑتے ہیں۔ روٹی بھی اپنی
جیب سے خرچ کر کے کھاتے ہیں۔ ایسی فوج کے ذریعے سے تو سارے
ہندوستان کی آزادی حاصل کی جا سکتی ہے۔ آپ اس حد تک تو
پہنچ گئے ہیں۔ وقت پڑنے پر سرکار کے تشدد کو برداشت کر لیا
مار پیٹ سہہ لی۔ آج جیسا کوئی خاص موقع آیا تو کام بھی کر لیا۔ یہ
سب بہت اچھا ہے مگر کافی نہیں۔ یہ پہلا قدم ہے آخری نہیں
اس سے آزادی نہیں مل سکتی۔ آزادی کے لئے ہمیشہ کام کرنا

سنوں — آج اسل صوبے ہیں، آپ کے دفتر میں ایک لاکھ خدائی
خدمت گاروں کے نام ہیں کسی دوسرے صوبے میں شاید اتنے
والنٹیر نہیں ملیں گے۔ اگر ہیں بھی تو ان میں اتنی تنظیم نہیں ہے۔ آپ
سب ایک آدمی کے ماتحت ہیں، جو وہ کہے آپ کرنے کو تیار رہیں
یہی آپ کی طاقت کا راز ہے۔ آپ لوگوں نے اپنا سارا نظام فوجی
طرز پر بنایا ہے۔ جرنیل اور کرنیل کے خطاب بھی دیتے ہیں۔ مگر آپ
کے کام میں اور ملٹری کے کام میں بہت فرق ہے۔ آپ نے جان بوجھ کر
لاٹھی اور بندوق چھوڑ دی ہے۔ آپ نے اپنے ایڈریس میں مجھے بتایا ہے
کہ عدم تشدد کی طاقت بہت بڑی طاقت ہے اور تلوار کی طاقت
سے بڑھ کر ہے اور خود میرا تو یہ تجربہ ہے ہی کہ اگر عدم تشدد کی طاقت
کو اچھی طرح منظم کیا جائے تو وہ بہت بڑا کام کر سکتی ہے۔ جنوبی افریقہ
میں ہماری تعداد تیرہ ہزار تھی اور گورے لاکھوں بھرے پڑے
تھے پھر بھی ہم ان سے لڑے اور کامیاب ہوئے۔ اگرچہ ہمارے
لوگ کچھ بہت لکھے پڑھے نہ تھے مگر ایک بڑی بات ان میں یہ تھی
کہ وہ سب میرے کہنے پر چلتے تھے، ان میں ڈسپلن تھا۔ ان
لوگوں نے سب مصیبتیں سہیں، گولی تو وہاں نہیں چلی مگر ہر طرح
کی تکلیف کا انھوں نے خوشی سے خیر مقدم کیا۔ وہاں قیدخانہ یہاں
کے قیدخانے سے بُرا تھا۔ خوراک بدتر تھی۔ مگر پھر بھی قیدخانوں
میں، بچے، بوڑھے، عورتیں سب گئے۔ کچھ لوگوں کو جلاوطن کیا

چاہیئے۔ آپ نے اپنے عہدے ملٹری والوں کے سے رکھے ہیں۔
جیسے کہ جرنیل اور کرنیل، سالار وغیرہ۔ ملٹری والے قواعد کرتے
ہیں۔ لڑنے کے وقت لڑتے ہیں فرصت میں کھیلتے ہیں۔ کھاتے
پیتے ہیں۔ بار جلدی بھی کر لیتے ہیں، مگر ہمیں تو دن رات خدمت کرنا
ہے۔ یا اس کی تیاری کرنا ہے۔ آدمی جو کچھ دن بھر کرتا اور سوچتا ہے
رات کو خواب بھی اُسی کے دیکھتا ہے۔ فوجی آدمی خواب دیکھے گا
تو یہ کہ اگر جرنیل فلاں جگہ لڑنے کو بھیج دے تو میں خوب بہادری
دکھاؤں۔ ترقی پاؤں۔ آپ لوگوں کو تو یہ خواب آنے چاہئیں کہ
اگر فلاں جگہ پر جھگڑا ہو اور بادشاہ خاں مجھے جھگڑا چکانے کے لئے
جان دینے کے لئے وہاں بھیج دیں تو میں وہاں دو فریقوں میں
صلح کرانے کی کوشش میں ختم ہو جاؤں اور دل میں غصہ تک نہ آئے
تو کیا اچھا ہو۔ آج لوگ بادشاہ خاں کو سرحد سے باہر بلاتے ہیں
تو میں روک دیتا ہوں۔ کیونکہ ابھی آپ کی تیاری مکمل نہیں۔ لیکن
جب آپ تیار ہو جائیں گے تو اگر کہیں جھگڑا ہو جائے جیسا آج کل
ملتان اور دہلی میں ہو رہا ہے تو وہاں امن قائم کرنے کے لئے ہم آپ
کو بھیج دیں گے۔ میں نے شانتی سینا قائم کرنے کی تجویز کی ہے۔ مگر
آپ تو پہلے ہی سے شانتی سینا میں ہیں اس لئے آپ کو چاہیئے جہاں
جھگڑا ہو، وہاں جائیں، لوگوں کو سمجھائیں کہ آپس میں لڑتے کیوں ہو؟
خواہ مخواہ ایک دوسرے کو مارتے ہو؟ اگر مارنا ہی ہے تو ہمیں مار دو۔

مگر اس کام کے لئے بہت تیاری چاہئے۔ تعلیم چاہئے ہمیں چوبیس گھنٹے اسی کا خیال کرنا اور اسی کے لئے کام کرنا ہوگا۔ ہم کو دیہاتوں کی صفائی کرنی ہوگی۔ ہم مریضوں کی دیکھ بھال کرنا سیکھیں گے۔ فرسٹ ایڈ سیکھیں گے۔ جہاں جس قسم کی مدد کی ضرورت ہوگی ویسی مدد دیں گے۔ یہاں تک کہ اس دیہات کا بچہ بچہ پہچاننے لگے گا۔ کہ یہ خدائی خدمت گار ہیں۔ ان کا کام ہی خدمت کرنا ہے۔ اسی طرح آپ کا نام ہوگا۔ اگرچہ ہمیں نام کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر ان کاموں سے جب لوگ ہمیں اچھی طرح سمجھ جائیں گے تو ہمارا خدمت کا کام آسان ہو جائے گا۔

پشتو کی تعلیم تو ہمیں حاصل کرنی ہی چاہئے۔ لیکن اس کے علاوہ دوسروں کی خدمت کے لئے ہمیں ہندوستانی بھی سیکھنی ہے۔

ہمارے پاس روٹی پیدا کرنے کا ذریعہ ضرور ہونا چاہئے آج آپ میں سے اکثر کے پاس زمین ہے۔ مگر کل وہ چھن سکتی ہے۔ جو خدا کی خدمت کرتے ہیں انھیں روٹی تو ضرور ملے گی مگر خدا بے ہاتھ پاؤں ہلائے روٹی نہیں دیتا۔ اس کے لئے کچھ نہ کچھ دھندا تو کرنا ہی ہوگا۔ دھندے ہی سے روٹی ملتی ہے۔ آپ لوگ سرخ پوش ہیں۔ میرا خیال تھا کہ آپ کھادی پوش بھی ہوں گے مگر میں دیکھتا ہوں کہ کھادی آپ میں سے بہت کم پہنتے ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو اپنی وردی اپنے خرچ سے بنانی

پڑتی ہے۔ اور کھادی خریدنے کے لئے آپ کے پاس پیسہ نہیں ہے اگر آپ لوگ کاتنا، دھننا سیکھ لیں تو کھادی مفت میں تیار ہو سکتی ہے۔ اور کچھ پیسے بھی مل سکتے ہیں۔

اب یہ سوال ہے کہ ایک لاکھ خدائی خدمت گاروں کے ہوتے یہاں ڈاکے کیسے پڑتے ہیں۔ دوسری جگہ آپس میں لڑیں جھگڑیں مگر یہاں تو ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر یہاں ایک بھی ڈاکو ہے تو ہمیں شرم آنی چاہیئے۔ مجھے تو آتی ہے۔ آج کل یہاں بعض لوگوں نے ڈاکہ زنی کو پیشہ بنا لیا ہے۔ کیونکہ ان کے پاس پیسہ کمانے اور روٹی پیدا کرنے کا دوسرا کوئی ذریعہ نہیں ہے ہم ان کے ساتھ دو طرح سے نپٹ سکتے ہیں۔ ایک تو جیسے سرکار کرتی ہے۔ یعنی جرائم پیشہ ایکٹ بنا کر دن میں اور رات میں ان کو تین تین چار چار بار تھانے میں بلا کر حاضری لیتی ہے اور اس طرح انھیں تنگ کرتی ہے۔ یا محبت سے سمجھا کر۔ میں یہ نہیں جانتا کہ جرائم پیشہ سب کے سب بدمعاش یا ڈاکو ہی ہوتے ہیں۔ ہم انھیں بھی سمجھا سکتے ہیں۔ کہ جو ہم کرتے ہیں وہ تم بھی کرو۔ اس سے تمھیں روٹی ملے گی اور تم گناہ اور اس کے نتائج سے بھی بچو گے۔ یہاں ڈاکہ وغیرہ اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ بچارے ڈاکٹر خاں صاحب پریشان ہیں کہ کیا کیا جائے۔ وہ یہ حالت ایک دن بھی دیکھنا نہیں چاہتے مگر لاچار ہیں، ایک تو ان کے پاس طاقت نہیں جو طاقت بھی دی

گئی ہے۔ وہ ایک کھلونا سا ہے۔ پولیس اور ملٹری ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ وہی پولیس جو ڈاکٹر صاحب کو سلام کرتی ہے اوپر سے حکم ملے تو انھیں ہتھکڑی لگا دے گی، مگر پھر بھی آج ہمارے پاس کچھ طاقت موجود ہے۔ ہم میں یہ صلاحیت ہونی چاہیئے کہ ہم یہ کھوج لگائیں کہ فلاں مجرم کہاں گیا ہے، وہاں جا کر اس سے ملیں اس کے ارد گرد کے لوگوں سے ملیں۔ انھیں سمجھائیں بجھائیں۔ ان میں رہ کر کام کریں، ان پہ اپنا اثر ڈالیں۔ ان کے طریقہ معاش کو سدھاریں۔ اگر یہ نہیں کر سکتے تو یہ وزارت آپ کے بادشاہ خاں کے، میرے، سب کے لیئے باعثِ شرم ہوگی۔ میں اس ندامت میں شریک نہیں ہونا چاہتا۔

ڈاکٹر خاں صاحب کو آج مجبوراً سزا کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ سزا نہ دیں تو جرم اور بڑھ جائیں۔ سرکار کے پاس دوسرا راستہ نہیں ہے۔ مگر ہمارے پاس تو ہے۔ ایک لاکھ آدمیوں کے لئے یہ معمولی بات ہے۔ یہ اتنی بڑی جماعت اگر چاہے تو کیا نہیں کر سکتی۔ خدا نے ہمارے سامنے دونوں راستے رکھے ہیں۔ امن کا راستہ اور تشدد کا راستہ۔ اگر ہم امن کا راستہ پسند کرتے ہیں تو دوسرے کو مارنے کے بدلے خود مرنا خدمت لینے کے بدلے خدمت کرنا ہوگا۔ اگر آپ یہ کرنے لگیں، اور چوبیس گھنٹے خدمت یا خدمت کے خیال میں لگے رہیں تو چند ہی سال میں آپ اس صوبے کی شکل بدل

سکتے ہیں۔

گاندھی جی نے کہا کہ اگرچہ بظاہر آپ لوگوں نے اس بات کے کہنے میں بے جا جرأت سے کام لیا ہے۔ مگر میں اپنی عادت کے مطابق مانے لیتا ہوں کہ یہ بالکل صحیح ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ان لوگوں کو تفصیل سے سمجھایا کہ ان کے نزدیک عدم تشدد کا کیا مفہوم ہے اور اس کے لوازم کیا ہیں۔ یہ بات تو آسان ہے کہ قوی اور مسلح حریف کے مقابلے میں ایک قسم کے انفعالی عدم تشدد سے کام لیا جائے لیکن سوال یہ ہے کہ جب باہر کی کوئی قوت آپ کو دبانے کے لئے نہیں ہوگی تو کیا تب بھی آپ آپس کے تعلقات میں عدم تشدد سے کام لیں گے؟ آپ کا عدم تشدد طاقتوروں کا عدم تشدد ہے یا کمزوروں کا؟ اگر طاقتوروں کا عدم تشدد ہے تو تلوار کو ترک کرنے سے آپ کو اور زیادہ طاقت کا احساس ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو آپ کے لئے یہی بہتر ہے کہ ہتھیاروں کا استعمال جو آپ نے اپنی خوشی سے چھوڑ دیا ہے پھر شروع کر دیجئے۔ اس لئے کہ بہادر اور مسلح سپاہی ہونا نہتے اور بزدل ہونے سے اچھا ہے۔

گاندھی جی نے اس الزام کی تردید کی جو کئی لوگوں کی طرف سے ان پر لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے پٹھانوں کو عدم تشدد کا سبق دے کر اسلام کو کمزور کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا آپ نے اسلام کی قابل قدر خدمت انجام دی۔

اسی سلسلے میں انھوں نے فرمایا کہ خدائی خدمت گار سے مراد وہ شخص ہے جو خدا کی یعنی خلقِ خدا کی خدمت کرتا ہو۔ اس کے لئے قول، عمل اور خیال کی پاکیزگی اور کسی مفید کام میں ہمیں مصروف رہنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ بے کاری میں نفس پاک نہیں رہ سکتا۔ آپ کو چاہیئے کہ کوئی ہاتھ کا کام سیکھ لیں جو اپنے گھر پر کر سکیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ روئی دھنکنا، کاتنا اور کپڑا بننا سیکھیں۔ اس لئے کہ یہ ایسے کام ہیں جو لاکھوں آدمی اپنے گھر پر کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کو ہندوستانی زبان سیکھنا چاہیئے تاکہ آپ کے خیال میں وسعت پیدا ہو اور آپ باہر کی دنیا سے روشناس ہوں۔ حفظانِ صحت کی ابتدائی باتیں اور فرسٹ ایڈ بھی سیکھنا ضروری ہے۔ آخری مگر نہایت ہی اہم چیز یہ ہے کہ آپ کو سب مذہبوں کا احترام کرنا چاہیئے اور ان سے رواداری برتنی چاہیئے۔

ساتواں باب

پٹھانوں کے درمیان

دنیا میں جتنی اچھی اچھی چیزیں ہیں۔ سب ایک نہ ایک دن ختم ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ بادشاہ خاں نے گاندھی جی کے لئے آرام کی جو مدت مقرر کی تھی وہ اس مہینے کی ۱۵ تاریخ کو سنیچر کے دن ختم ہو گئی۔ اس روز ہم اس ارادے سے چل کھڑے ہوئے کہ ضلع مردان کے مضافات اور ضلع پشاور کی بقیہ تحصیل نوشہرہ کا دورہ کریں۔ سفر مختصر تھا اور چھوٹی چھوٹی منزلوں میں بانٹ دیا گیا تھا اس لئے گاندھی جی کو ذرا بھی تھکن محسوس نہیں ہوئی۔ ہماری سواری کے لئے وہ موٹر بس لے لی گئی تھی جو پنڈت جواہر لال نہرو نے خدائی خدمت گاروں کو پروپیگنڈا کے لئے دی ہے۔ جب ہم اعلیٰ درجے کی پکی سڑک پر جاتے تھے تو دونوں طرف کے گاؤں کی پوری پوری آبادی گاندھی جی کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے امنڈ آتی تھی۔ یہ لوگ بالکل خاموش کھڑے رہتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں کتنا ڈسپلن ہے۔ ان لمبے تڑنگے پٹھانوں میں اس قدر

کشادہ دلی گرم جوشی متانت اور وقار ہے کہ انسان کا دل بے اختیار
اُن کی طرف کھنچتا ہے۔ بار بار خیال آتا ہے کہ کاش ہندوستان کے
اور حصوں میں بھی لوگوں کا مجمع اُن کی تقلید کرتا۔ ان میں ایک
ہی کمزوری ہے، اگر اُسے کمزوری کہا جائے، کہ ان کا مہمان داری
کا شوق حد سے بڑھا ہوا ہے۔ ممکن تھا کہ اس وجہ سے گاندھی جی کو
دقتیں پیش آتیں مگر بادشاہ خاں نے پیش بندی سے کام لے کر
لوگوں کو وقت پر سمجھا دیا تھا اس لیئے یہ مہمان داری اعتدال کی حد سے
نہیں بڑھنے پائی۔

البتہ ایک بار جب گاندھی جی اُتمان زئی کے باہر سیر کے لیئے
جا رہے تھے، اُن کو اپنی بس روک کر اُترنا پڑا تا کہ منت خاں کیلی
(جس کا نام بادشاہ خاں کے ایک چچا کے نام پر رکھا گیا ہے)، کے
باشندوں کا پھلوں اور گنّوں اور ترکاریوں کا تحفہ قبول کریں۔
انھوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ ہی رہ جائیں
اور اس صوبے میں بود و باش اختیار کرلیں۔ اُن کے سردار نے
کہا ہمارا آپ پر بڑا حق ہے، آپ نے ہمارے بادشاہ خاں صاحب
کو مصیبت کے زمانے میں چھ سال تک اپنے ہاں رکھا۔ اب ہم آپ
کو کم سے کم چھ مہینے تو مہمان رکھ سکتے ہیں۔ گاندھی جی اور سب لوگ
یہ سن کر ہنسنے لگے، کوئی بیس پچیس بچے بھی گاؤں سے آئے تھے
تا کہ گاندھی جی سے ملیں، اور اُن سے مصافحہ کریں۔ اپنی ٹوپیاں

(جو مہمند قبائل میں استعمال ہوتی ہیں۔) اپنے معصوم سُرخ سُرخ چہروں میں ڈھکے ہوئے ایک ایک کرکے گاندھی جی کے پاس آتے تھے اور اُن کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر پٹھانوں کی شان سے مصافحہ کرتے تھے اور "ترا ماشے" کہتے تھے اور پھر بڑے ٹھاٹھ سے "نکڑوں کوں" اکڑ کے ساتھ چلے جاتے تھے گویا اب اُن کی شان میں کئی انچ کا اضافہ ہوگیا ہے۔

پشاور سے نوشہرہ موٹر سے گھنٹے بھر کا راستہ ہے، جس وقت ہم روانہ ہوئے۔ نیلے آسمان پر سورج چمک رہا تھا اور ہوا میں بڑی خوش گوار خنکی اور تازگی تھی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ حسنِ فطرت کے اس منظر کا جو ہماری آنکھوں کے سامنے تھا، مفصل نقشہ کھینچوں مگر میں اپنے قلم کو روکنے پر مجبور ہوں۔ دور تک دھندلے ارغوانی رنگ کا پہاڑوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ پہاڑ درختوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ مگر اب بالکل ننگے اور اُجڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بدھ تہذیب اور یونانی باختری تہذیب کی بے شمار نشانیوں کو دیکھ کر جو دریائے سوات اور دریائے کابل کی وادیوں میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ چشمِ تصور کے سامنے ماضی کی تصویر پھر جاتی ہے۔ مگر گاندھی جی کی توجہ ان چیزوں کی طرف زیادہ نہ تھی۔ وہ خدائی خدمت گاروں کے خیال میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے سر ایک بہت بڑی ذمہ داری لی تھی۔ اُن کے

سامنے وہ لوگ تھے جو جنگ جو سپاہیوں کی حیثیت سے دنیا میں مشہور تھے۔ اب ایک شخص کے حکم سے اُنھوں نے ہتھیار رکھ دیے تھے۔ اور عدم تشدد کا اصول اختیار کر لیا تھا۔ گاندھی جی کو یہ فکر تھی کہ کس طرح اُن کو عدم تشدد میں کامل بنا لیں، تاکہ وہ ہندوستان کی جنگ آزادی کو سر کر سکیں۔ دیکھنا یہ تھا کہ ان کو اپنی کوشش میں کہاں تک کامیابی ہوتی ہے۔

ہم سولہ تاریخ کو سہ پہر کے وقت دریائے کابل کو پار کر کے نوشہرہ پہنچے۔ نوشہرہ ایک بہت بڑا فوجی مرکز ہے اور رسالپور کی چھاؤنی اور ہوائی اڈے کی طرح، پشاور کی حفاظت کرتا ہے کیونکہ پشاور سرحد سے اس قدر قریب ہے کہ اس پر درۂ خیبر کی طرف سے اچانک حملہ ہو سکتا ہے۔ نوشہرہ میں بھی اتمان زئی اور پشاور کی طرح گاندھی جی خدائی خدمت گاروں کے سالاروں سے ملے۔ اُنھوں نے ایک تحریری ایڈریس میں گاندھی جی کا شکریہ ادا کیا کہ آپ نے ہمارے ہاتھ میں عدم تشدد کے ہتھیار دیدئے ہیں جو فولاد اور پیتل کے ہتھیاروں سے کہیں زیادہ بہتر اور اُن سے کہیں زیادہ زبردست ہیں۔ انھوں نے گاندھی جی کو یقین دلایا کہ ہم لوگ عدم تشدد پر کامل عقیدہ رکھتے ہیں جس کا ثبوت سول نافرمانی کی تحریک میں ہمارے طرز عمل سے مل چکا ہے اور ہم اس عقیدے کو کبھی نہیں چھوڑیں گے

سپاسنامہ کا کچھ ضروری حصہ ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔

"آپ کا عدم تشدد کا سکھایا ہوا سبق جس طرح ہم صوبہ سرحد والوں نے پڑھا، اور اس پر عمل کیا ہے اگر اس کے متعلق ایک کلمہ فخر کا کہدیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اور اُمید ہے کہ آپ ناراض بھی نہ ہوں گے۔ کیوں کہ تشدد ہمارا پیشہ تھا جو "فخر افغان" نے ہم سے چھڑا دیا۔ ورنہ پیدائشی عدم تشدد والوں کا عدم تشدد بے معنی ہے۔ اس نسخے کے استعمال کا مریض اگر کوئی تھا تو وہ پٹھان تھا اور اس نسخے کو کسی نے سمجھا تو وہ بھی پٹھان نے۔ پٹھان اور مسلمان جس کے مذہب کا اصل اصول عدم تشدد تھا اور تشدد اس کی استثنیٰ۔ اصول کو بالکل بھول کر استثنیٰ کو مذہب بنا چکا تھا مگر پٹھان کے قائد نے اس کو اپنا بھولا ہوا اصول پھر یاد دلا دیا۔ ہم آپ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس صوبے کے باشندے جو سب "پٹھان" ہیں (کیا ہندو اور کیا مسلمان) قلیل ترین عرصے میں آزادیٔ وطن کی فوج کے بہترین سپاہی بن کر آپ کے دوسرے حکم پر میدان جنگ میں آجاویں گے۔ اور اُمید ہے کہ اس سیلاب کو پھر روکنا شاید دفتریوں کے لئے مشکل بھی ہو جائے۔

اس وقت سے لے کر کہ اس ملک کی غلامی کی تشخیص آپ نے کی۔ اور اس کے علاج کے لئے آپ نے نسخہ تجویز کیا۔ یہ صوبہ ہر زمانے میں آپ کی امداد کا خواہش مند رہا جو بالآخر اس کو ملی اور آپ کو

اپنے اندر لے اگر رہا۔ اور ممکن ہے کہ ہمیشہ کے لیئے آپ کو اپنا بنالے اس لئے کہ اصل حالت اس صوبے کی جس طرح باقی صوبجات سے قبل از اصلاحات جدا تھی اب بھی اسی طرح جُدا ہے پہلے اگر فدایانِ جشیانہ تھے تو اب ملازمینِ برطانیہ نافرمان ہیں۔ کانگریس وزارت تو ہے، مگر ملازمین ہماری وزارت سے تعاون نہیں کررہے ہیں۔ یہ بھی مرض ہے۔ اس کا بھی علاج آپ کو بلاتا ہے۔ آپ سے بہتر ڈاکٹر ہم کو مل نہیں سکتا۔ نسخہ تجویز کیجئے تشریف لے جاویں "

گاندھی جی نے ان کے اڈریس کے جواب میں کہا کہ میں آپ کی اس بات کو پوری طرح جانتا ہوں کہ آپ نے عدم تشدد کے اصول کو سمجھ لیا ہے اور اس پر ہمیشہ قائم رہیں گے۔ میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ نے اس اصول پر پورا پورا عمل کیا تو آپ دنیا کی تاریخ کو بدل دیں گے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک خدائی خدمت گار اور ایک معمولی سپاہی کی تربیت اور طرز عمل میں کیا فرق ہونا چاہیئے۔ انھوں نے کہا کہ معمولی سرخ پوشوں کے دل میں جب سچا عدم تشدد پیدا ہوگا تو سورج کی گرمی کی طرح ہر شخص اس کو خود بخود محسوس کرے گا۔ ہر مرد، عورت، بچہ، بوڑھا اُن کی نیکی کا معترف ہوگا اور جو حکومت کی پوری طاقت نہیں کرا سکتی اُن کا ایک اشارہ وہ کام کرا سکے گا خدائی خدمت گار جیل میں سرکار کو ستانے کے لیئے نہیں

اپنی معصومیت کا ثبوت دینے کے لیے جائے گا۔ اس کی قانون کی پابندی کی صلاحیت کم نہ ہوگی۔ وہ اخلاقی مجبوری سے قانون شکنی کرے گا۔ چور، ڈاکوؤں کے جیل جانے سے آزادی نہیں مل سکتی بے گناہ کی قربانی ہی نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ سول نافرمانی کرنے والے کو خدا کا فرماں بردار بننا پڑے گا۔

(مردان تحصیل کے خدائی خدمت گاروں کے افسروں سے بات چیت)

گاندھی جی:۔ آج کئی دنوں سے میں خدائی خدمت گاروں کے افسروں سے مل رہا ہوں۔ یوں تو میں آج کل خاموش رہتا ہوں۔ آپ یہ بھی دیکھتے ہیں گلا خراب ہو جانے کی وجہ سے میری آواز بھی نہیں نکلتی ہے۔ فقط آپ سے بات چیت کرنے کے لئے خاموشی کو چھوڑتا ہوں۔

کیا آپ لوگ عدم تشدد کی خوبیاں سمجھ گئے ہیں؟ اور موقع پڑا تو اس پر قائم بھی رہیں گے؟ مجھے سب جگہ سے اس کا جواب "ہاں" میں ملا ہے۔ اس سے مجھے بڑی خوشی اور تسلی ہوتی ہے۔ مگر جوں جوں میں آگے بڑھتا ہوں مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ کیا آپ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں، سوچ سمجھ کر کہہ رہے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ایک رواج سا بن گیا ہے۔ اس لئے آپ سب لوگ ہاں کہہ دیتے ہیں؟ اگر آپ سچے دل سے ہاں کہہ رہے ہیں تو

آپ کو اس پر قائم رہنا چاہیئے ۔ میں سوچتا ہوں کہ اور کچھ کہنے سے پہلے آپ سے پھر اتنا پوچھ لوں ، کیا واقعی یہ بات آپ کے دل پر جم گئی ہے ؟ کیا سچ مچ آپ اس پر قائم رہنا چاہتے ہیں ؟

سب نے مل کر جواب دیا "ہاں"

ایک آواز :- ہم اور تو سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں مگر جب لوگ ہمارے بزرگوں کو گالی دیتے ہیں تو وہ برداشت نہیں ہوتا ۔

گاندھی جی :- (ہنس کر) بس چلو چھٹی ہوئی ۔ اصلی امتحان تو یہی ہے ۔ ویسے تو سب لوگ ایک حد تک برداشت کر لیتے ہیں بات تب ہے کہ امتحان کا موقع آئے اور آپ برداشت کر لیں ۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی سردار کو برا بھلا کہے ، گالیاں دے تب بھی آپ برداشت کریں گے ۔ تحمل کا دامن نہ چھوڑیں گے ۔ اور دل میں بھی غصہ نہ آنے دیں گے ۔ اگر آپ اس حد تک عدم تشدد کو سمجھ گئے تو میں آپ کو اور بادشاہ خاں کو مبارک باد دیتا ہوں ۔ اس سے ضرور ہندوستان کا بھلا ہوگا ۔ مگر صرف زبانی ماننے سے عدم تشدد نہیں آجاتا ۔ اس کے عملی ثبوت کی ضرورت ہے ۔ سورج کا نکلنا چھپا نہیں رہ سکتا ۔ اندھے کو بھی اس کی گرمی محسوس ہوتی ہے ۔ اسی طرح ایک لاکھ خدائی خدمت گاروں کے دل میں سچا عدم تشدد پیدا ہوگا تو اس کا نور سورج کے نور سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر ہوگا ۔

جو لوگ جان بوجھ کر انجان بنتے ہیں انھیں بھی پتہ چل جائے گا۔ کہ آج صوبہ سرحد میں آپ جیسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں۔ اگر آپ اپنے دل سے غصہ نکال ڈالیں، بدزبانی چھوڑ دیں (لاٹھی چھری تو پہلے ہی چھوڑ چکے ہیں) تو آپ خود چاہیں تب بھی اس بڑی تبدیلی کو نہیں چھپا سکیں گے۔ اور آپ کے آس پاس کے لوگوں پر بھی اس کا اثر پڑے بغیر نہ رہے گا۔ آپ لوگوں کو جاننا چاہیے کہ جنوبی افریقہ میں کافی تعداد پٹھانوں کی بھی تھی اور وہ ستیہ گرہ کی لڑائی میں شامل بھی ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ایک کو میں پہچانتا تھا۔ کئی تو میرے موکل تھے۔ مگر میں صرف ان کا وکیل ہی نہ تھا ان کو سیاسی تعلیم دینا بھی میرا کام تھا۔ اگر کسی کے پیٹ میں درد ہوتا یا کسی کا سر دکھتا تو دوائی بھی دیتا تھا۔ اس طرح سے میں ان کا دوست تھا اور وہ میرے دوست تھے، اور میں جو کچھ بھی کہوں کرنے کو تیار ہو جاتے تھے اور خود چاہے کچھ بھی کریں مجھے آکر بتا دیتے تھے۔ یہاں تک کہ ذرا سی بات بھی نہیں چھپاتے تھے۔ میرا ان کے دل میں ایک طرح کا ڈر تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس آدمی سے کچھ نہ چھپا سکیں گے۔ اور اگر کوئی برا کام کر بیٹھے تو وہ سخت ڈانٹ پلائے گا۔ میری ڈانٹ سے وہ کیوں ڈرتے تھے؟ ویسے تو ان میں سے ہر ایک آسانی سے جیب میں رکھ سکتا تھا۔ میرا جسم دیکھنے میں جیسا آج کمزور سا ہے ویسا ہی اس وقت بھی تھا۔ انھیں ڈر تھا۔ تو میری محبت کا۔

وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس لئے مجھ سے ڈرتے بھی تھے
میں پٹھانوں کو خوب پہچانتا ہوں۔ انسانوں کو قتل کر ڈالنا اُن کے
نزدیک اتنی ہی معمولی بات ہے۔ جیسے کہ مرغی یا بکرے کو کاٹ
ڈالنا۔ وہ مارنے کو ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ لوگوں کو پٹھانوں کا
ڈر رہتا ہے۔ کیونکہ وہ لاٹھی چلانے میں ماہر ہیں۔ پتھر پھینکنا
بھی جانتے ہیں۔ شاید ہی کوئی پٹھان ہو جسے بندوق یا چھری
چلانی نہ آتی ہو۔ میں پٹھان کی لاٹھی کی طاقت کو خوب پہچانتا ہوں
اگر میر عالم کی لاٹھی سر کے بجائے پیٹھ پر نہ پڑی ہوتی تو میں آج یہاں
نہ ہوتا۔ لیکن آج میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ پٹھان جو بچپن ہی سے لاٹھی
بندوق چلانا جانتے ہیں...... اور جن کے لئے انسان کو مار ڈالنا
معمولی بات ہے۔ انھوں نے بادشاہ خاں کے کہنے سے لاٹھی اور
بندوق چھوڑ دی ہے اور وہ سمجھ گئے ہیں کہ جو چیز بادشاہ خاں ان
کو دینا چاہتے ہیں یعنی عدم تشدد وہ لاٹھی اور بندوق سے زیادہ
طاقت ور ہے۔ اگر سچ مچ آپ یہ بات سمجھ گئے ہیں۔ اور سب پرانی
باتیں بھول گئے ہیں۔ اپنے پرانے رسم ورواج کو اس طرح سے
اُتار پھینکا ہے۔ جیسے سانپ اپنی کینچلی کو۔ اگر ایک لاکھ خدائی خدمت
گاروں نے عدم تشدد کو اس طرح اپنا لیا ہے تو مجھے یہ ایک معجزہ
سا لگتا ہے۔ بادشاہ خاں کی کیا طاقت تھی کہ وہ سب آپ سے
کروا سکتے۔ یہ طاقت تو انھیں خدا ہی نے دی ہے۔ کہ وہ اس طرح

آپ کا دل بدل سکے۔ اس میں صوبہ سرحد کی بھلائی ہے۔ ہندوستان کی بھلائی ہے اور اس سے ہمارے دین اور دنیا دونوں سدھر جاتے ہیں۔

آپ نے مجھے یقین دلایا ہے کہ آپ عدم تشدد کے پابند رہیں گے۔ اگر آپ جو کہتے ہیں۔ وہ ٹھیک ہے۔ (مجھے "اگر" کہنا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ کوئی معمولی بات نہیں، بڑی بھاری بات ہے۔ بہادری کی بات ہے) تو آپ بڑا کام کر سکتے ہیں۔ آپ بہادر ہیں۔ مرنا مارنا جانتے ہیں۔ مگر میں اس سے بڑھ کر بہادری کی توقع آپ سے رکھتا ہوں۔ وہ بہادری کیا ہے؟ وہ طاقت کون سی ہے؟ اس کی کیا نشانی ہے؟ جو نشانی میں دیکھنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے۔ جب میں یہاں بچے بچے سے پوچھوں کہ کیا آپ خدائی خدمت گاروں کو پہچانتے ہیں۔ عورتوں سے پوچھوں۔ تانگے والوں سے پوچھوں۔ تو مجھے جواب ملے کہ ہاں پہچانتے ہیں۔ اگر وہ لوگ آپ سے ڈرتے ہیں تو آپ سچے خدائی خدمت گار نہیں۔ آپ کی زبان میں ایسی مٹھاس ہونی چاہیئے۔ آنکھ میں وہ نور ہونا چاہیئے کہ ہر کوئی سمجھ جائے کہ یہ خدائی خدمت گار ہے۔ اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اور وہ لوگ خوشی سے وہی کام کریں جو آپ ان سے کروانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کو کہیں بھی اکیلی اور بے یار و مددگار عورت ملے تو بجائے ڈرنے کے وہ یہ محسوس کرے کہ میں اس شخص کے سائے میں پوری طرح سے محفوظ

ہوں ۔ آج سرکار شارع عام پر تھوکنے سے روکنے کے لئے یا دوسری کسی غلاظت کو بند کرنے کے لئے قانون بناتی ہے ۔ تب بھی کام نہیں چلتا ۔ خدائی خدمت گار کو لوگوں کے دلوں میں اس طرح سے گھر کر لینا چاہئے کہ اس کا لفظ بھی ان باتوں کو روکنے کے لئے کافی ہو ۔

آج ہٹلر کی آواز سے لاکھوں دل کانپ جاتے ہیں ابھی مسٹر چیمبرلین اور فرانس کے ایلچی ولادیمیر اپنی بات منوانے کو خود اس کے پاس گئے سلطنت فرانس اور برطانیہ کی ساری طاقت اُن کے پشت پر تھی ۔ پھر بھی اپنا سامنہ لے کر آنا پڑا ۔ یہ ایک قسم کی طاقت کی مثال ہے ۔ یہ طاقت ہے لاٹھی کی ۔ ہٹلر اور مسولینی دنیا کو کوئی نئی چیز نہیں دے رہے ہیں ۔ مگر جس طاقت کا ذکر آج میں خدائی خدمت گاروں کے سامنے کر رہا ہوں ۔ وہ بالکل ایک نئی قسم کی اور جدا چیز ہے ۔ مثال کے طور پر اگر خدائی خدمت گاروں کا ایک اشارہ ہندوستان کی سب رعایا سے وہ کام کرا سکے جو کہ سرکار اپنے قواعد اور قوانین کے زور سے بھی نہیں کرا سکتی تو ان کو کون سی طاقت کی ضرورت ہوگی ؟ کیا ان کی طاقت مسولینی یا ہٹلر کی طاقت سے کہیں بڑھ چڑھ کر نہ ہوگی ۔

وہ طاقت ہے ۔ محبت کی ، عام تشددگی ، اگر میں ہر طرف سے جیسا کہ میں ابھی ذکر کر چکا ہوں ۔ اس قسم کی نشانیاں دیکھوں تب ہی آپ کو سچا خدائی خدمت گار سمجھوں گا ۔ اور میں یہ سمجھوں گا کہ ہندوستان کی آزادی سچ مچ قریب ہے ۔ خدائی خدمت گار

کو کیسی زندگی بسر کرنی چاہیے ؟ ان کو کیا تعلیم ملنی چاہیے ؟ آج کل میں چوبیس گھنٹے یہی سمجھا رہا ہوں ۔ انھیں دن رات خدمت ہی کا خیال رہنا چاہیے ۔ عدم تشدد کے ذریعے سے لڑائی کرنے کے لئے انھیں ہر وقت تیار رہنا چاہیے ۔ عدم تشدد کی لڑائی میں آزادی کے لئے سلطنت کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان قربان کرنے کی طاقت تو ان میں ہونی ہی چاہیے ۔ چاہے مقابلہ سلطنت سے ہو یا اپنے بھائیوں سے ۔ وہ امن کے واحد ہتھیار کو کبھی نہ چھوڑیں ۔ ان کا ہمیشہ وہی ایک طریقہ رہے یعنی امن کا ۔ عدم تشدد کا ، مگر اپنے بھائیوں سے ہمیں لڑنا ہی کیوں پڑے ؟ اگر وہ ہماری مخالفت کرتے ہیں تو ہم برا کیوں مانیں ؟ ان پر غصہ کیوں کریں ؟ میں یہ نہیں مانتا کہ وہ سب برے آدمی ہیں ۔ اگر آپ دیکھیں تو معلوم ہو کہ ان میں کچھ بھلے آدمی بھی ہیں مگر آج ان کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا ہے کہ کانگریس بدمعاش لوگوں کی جماعت ہے ۔ اس کا ساتھ دینے والے یا تو خود بدمعاش ہیں یا بدمعاش لوگوں کے زیر اثر ہیں ۔ ان کے پنجے سے ملک کو چھڑانا چاہیے ۔ ہمیں اپنے مخالفین کا نقطۂ نگاہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے ۔ تبھی ہم اس کا علاج بھی کر سکیں گے ۔ غصے سے یہ علاج نہیں ہو سکتا ۔ ہمیں اپنے عمل سے بتا دینا چاہیے کہ ہم بدمعاش نہیں ۔ بے ایمان نہیں ، خود غرض

نہیں ہیں ۔ ہمیں پیسہ نہیں چاہیئے ۔ طاقت نہیں چاہیئے ۔ صرف اپنے ملک کی آزادی چاہیئے ۔ اگر ہم سچے ہیں ۔ سچ مچ ہمارے دل میں آزادی کی لگن ہے ۔ اس کے لئے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہیں تو ہمارے مخالفین ضرور آخر میں غلطی کو محسوس کریں گے اور جیسے موم آگ کے پاس آ کر پگھل جاتا ہے ۔ ہماری محبت اور ایثار ان کے دلوں کو پگھلا دے گا ۔ اب فرض کرو کہ اس طرح کرتے کرتے ہم جیل چلے گئے اور وہاں ہمیں کسی نے گالیاں بھی دیں تو ہمارے دل میں غصہ نہیں آئے گا ۔ آنکھ لال نہیں ہونے پائے گی ۔ اگر غصہ آگیا تو ہمارا جیل جانا بے کار ہوا ۔ بادشاہ خان ہی کو لیجیئے ۔ آپ نے انھیں بادشاہ خاں ، فخر افغان وغیرہ کے محبت بھرے نام دئے ہیں ۔ جیل میں اگر وہاں کے سپاہی انھیں گالی دیں ۔ اور انھیں یا آپ کو غصہ آئے کہ اس دو ٹکے کے آدمی کی یہ کیا مجال کہ انھیں گالی دے ! تو بادشاہ خاں اور آپ جیل جانے کے لائق نہیں ۔ ہمیں یہ سب باتیں شانتی سے برداشت کرنی چاہیئے ۔ ہم جیل میں جاتے ہیں تو سرکار کو ستانے کی غرض سے نہیں بلکہ اپنی بے گناہی کا اپنے عدم تشدد کا جیتا جاگتا ثبوت دینے کے لئے ۔ میں جانتا ہوں کہ ایسے کم آدمی جیل گئے ہیں ۔ عام لوگوں نے یہ سمجھا کہ صرف جیل جانے ہی سے آزادی مل جائے گی حالانکہ انھیں سرکار کو دکھانا تھا کہ اگر سرکاری لوگ سختی بھی کریں

زیادتی بھی کریں تو بھی ہمیں غصہ نہیں آتا۔ ہم میں قانون کی پابندی کی صلاحیت کچھ کم نہیں مگر صرف اخلاقی مجبوری سے ہم اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اگر ایسے سچے آدمی ہزاروں کی تعداد میں جیل گئے ہوتے تو آزادی مل گئی ہوتی۔ مگر میرے ساتھیوں ہی نے میرے سامنے قبول کیا کہ تم جو کہتے ہو وہ ہے تو ٹھیک مگر ہمارے گلے نہیں اترتا۔ ہمارے دل میں تو بندوق بھری ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ اس سے اس وقت کام نہیں چل سکتا۔ اس لئے تمھاری بات اس وقت مانے لیتے ہیں۔ تب جیل جانے سے کچھ نتیجہ نکلا مگر جتنا ہم چاہتے تھے اتنا نہ نکلا۔

جب پٹنہ میں میں نے لڑائی موقوف کی تو میں نے اعلان کیا تھا کہ یہ ہم اس لئے نہیں کرتے کہ ہم کمزور ہو گئے ہیں۔ یا لوگ جیل جانے کو تیار نہیں بلکہ اس لئے کہ تشدد بھرے دل سے جیل جانے سے فائدہ نہیں ہو سکتا۔ قربانی کے لئے اہلیت چاہیئے۔ اب سوال یہ ہے کہ قربانی کا حق کسے ہے؟ اس کے لیے کیسی اہلیت ہونی چاہیئے۔ کیسی تیاری چاہیئے؟ یوں تو چور ڈاکو بھی جیل جاتے ہیں۔ مار کھاتے ہیں۔ مگر ان کا یہ کام قربانی تھوڑا ہی ہوگا۔ وہ تو اپنے گناہوں کی سزا پاتے ہیں جسے قربانی دینا ہے اُسے بے گناہ ہونا چاہیئے۔ صاف دل پاک دامن ہونا چاہیئے۔ تبھی اس کی قربانی کی کوئی قیمت ہوگی۔ تبھی اس کی قربانی کا کوئی نتیجہ بھی ہوگا۔ جس کے

لئے ہمیں قربانی دینی ہے۔ پہلے ہمیں اس کی خدمت کرنی سیکھنا چاہیئے۔ بس خدائی خدمت گار کو سب سے پہلے خلق خدا کا خادم ہونا چاہیئے۔ آج ہندوستان کے کروڑوں بھوکوں کی خدمت کا بہترین طریقہ چرخہ اور کھدر ہی ہے۔ بھوکے کو بھکاری بنانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ چرخہ کسی کو بھکاری بنائے بغیر امداد دیتا ہے۔ آج لاکھوں روپے اس کے ذریعے ہندو مسلمان عورتوں کے گھروں میں پہنچتے ہیں۔ اسی طرح آپ تھوڑا سا بیماریوں کا علاج اور فرسٹ ایڈ کا کام سیکھ لیں تو غریبوں کی خاصی خدمت کر سکیں گے۔ اپنے صوبے سے باہر کے لوگوں کی خدمت کرنی ہو، وہاں کے حالات سے واقف ہونا ہو تو پشتو کے علاوہ ہندوستانی بھی آنی چاہیئے ہیں یہ سب باتیں آپ سے اس لئے کہتا ہوں کہ میری آنکھوں کے سامنے اُس دن کا نقشہ ہے۔ جب آپ کو اپنے صوبے سے باہر سارے ہندوستان میں خدمت اور آزادی کے لئے نکلنا پڑے گا۔ اس وقت ہندوستانی آپ کے کام آئے گی۔

آج کے زمانے میں جیل جانا بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ جیل جانے کی صلاحیت ہونی چاہیئے۔ سرکار کو خود احساس ہونا چاہیئے کہ بے گناہوں کو جیل میں ڈال کر حکومت نہیں چل سکتی روحانی طاقت خدا کی دین ہے۔ اگر دل میں خدا نہیں تو کلمہ یا گائتری پڑھنا محض طوطے کی رٹ ہے۔

صوابی تحصیل کے خدائی خدمت گاروں کے افسروں سے گاندھی جی نے بات چیت کرتے ہوئے کہا۔ "میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ اگرچہ میں بعض دوسرے کام بھی کرتا ہوں۔ مگر میرا دل دن رات آپ ہی میں پڑا رہتا ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے آپ کی صورت آنکھ کے آگے رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے آپ لوگوں سے بڑی بڑی اُمیدیں باندھ رکھی ہیں اور وہ اب سے نہیں برسوں سے ہیں۔ لاہور کانگریس کے موقع پر آپ لوگ ایک بڑی تعداد میں آئے تھے۔ اس سے پہلے میری ملاقات بادشاہ خاں سے نہیں ہوئی تھی۔ وہیں پہلی دفعہ جان پہچان ہوئی۔ اس کے بعد وہ جیل بھیج دئیے گئے۔ رہا ہوتے ہی نہ میرے پاس آئے۔ اور میرے ساتھ ہی رہے۔ تب سے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ آپ لوگوں کے ذریعے بڑا کام کیا جا سکتا ہے۔ اگر میری یہ اُمید بر آتی ہے تو میرے جیسا آدمی یوں ہی نہیں بیٹھا رہ سکتا۔ بعد میں مجھے یہ کہنا پڑے کہ میں نے تو ان لوگوں کا اعتماد کر لیا تھا مگر ان لوگوں نے اپنے عہد کے مطابق عدم تشدد کو نہیں نبھایا۔ تو خدا کے دربار میں بھی میں ذمہ داری سے بری نہ ہوں گا۔

اگر میں آپ لوگوں سے پوچھوں تو آپ بھی ضرور وہی جواب دیں گے جو دوسری جگہ خدائی خدمت گاروں نے دیا ہے یعنی آپ عدم تشدد کو سمجھتے ہیں، اور لڑائی کے وقت اس پر قائم رہیں گے؟

لڑائی تو آج بھی جاری ہے صرف صورت بدلی ہوئی ہے۔ بجائے
جیل خانے کے ہم اسمبلی میں جاکر حکومت سے بھڑتے ہیں۔ ۱۹۳۱ء
اور اس کے بعد کی لڑائی میں جیل جانے، لاٹھیاں کھانے اور
سختیاں سہنے کے امتحان میں آپ پاس ہو چکے ہیں۔ مگر میری نظر
میں یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اس کی زیادہ اہمیت اس زمانے
میں تھی جب جیل جانا شرم کی بات سمجھی جاتی تھی مگر اب تو ہم نے جیل
جانے کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے، جیل کو گھر بنا لیا ہے۔ اب جیل جانا
کوئی شرم کی بات نہیں۔ اس لئے اب جیل جانے کی اتنی اہمیت
نہیں رہی۔ میری نظر میں تو جیل جانے کی بجائے خود کبھی قدر تھی ہی
نہیں۔ اصل قدر جیل جانے کی قابلیت ہو سکتی ہے۔ جب میں پہلی
بار جنوبی افریقہ میں جیل گیا تو میں نے خدا سے دعا کرنے کے بعد
اپنے دل سے پوچھا کہ کیا میں واقعی اس کے قابل ہوں! کیا میرا دل
صاف ہے! یا میں محض لوگوں کو دھوکہ دے رہا ہوں۔ جب ہم
بغیر کسی قصور کے جیل جاتے ہیں تو ہمیں موقع ملتا ہے کہ سرکاری
آدمیوں پر بھی اپنی بے گناہی ثابت کر دیں۔ ایسے شخص کی بے گناہی
سرکار کو چبھتی ہے، اور وہ سوچنے لگتی ہے کہ اسی طرح سب لوگوں
کو بے گناہ جیل میں ڈال دیا تو حکومت کیسے چلے گی جیل جانے کا اصل
مقصد یہی ہے۔

آج میرا جسم کمزور ہو گیا ہے، مگر دل نہیں۔ ابھی مجھ میں حکومت سے

لڑنے کی کافی طاقت موجود ہے۔ پھر میں کیوں ملک کو لڑائی کے لئے نہیں بلاتا؟ اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ کانگریس کے نظام میں ابھی تک تشدد موجود ہے، جھوٹ، خود غرضی، بد دیانتی، گندگی یہ سب تشدد ہی کی مختلف صورتیں ہیں، اس لئے میں آج کانگریس والوں سے کہتا ہوں کہ اگر آپ اپنے نظام میں سے یہ سب برائیاں نہیں نکال سکتے، اگر آپ کے دل میں تشدد چھپا ہوا ہے تو محض منہ سے عدم تشدد کا دعوے کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ آپ اسے چھوڑ دیں۔ آپ سے بھی آج میں یہی کہتا ہوں کہ اگر آپ کے دل میں جس طرح ایک چھوٹے بچے کے لئے اسی طرح ایک ظالم سے ظالم شخص کے لئے بھی رحم موجود ہے تب ہی آپ عدم تشدد کو اختیار کریں۔ اگر یہ بات نہیں۔ آپ ایسے نہیں بن سکتے یا نہیں بننا چاہتے اگر آپ کا یہ خیال ہے، ظالم پر غصہ تو آئے ہی گا تو آپ اس راستے کو چھوڑ دیں۔ یہ بھی آپ کے لئے ایک طرح کی بہادری ہوگی۔ آخر آپ پٹھان ہیں۔ بہادری آپ کا جوہر ہے۔ تو یہ بہادری بھی آپ میں آنی چاہئے۔ یہ ہندوستان کے لئے بُرا نہیں کچھ اچھا ہی ہوگا، اور اگر عدم تشدد آپ میں نہیں ہے اور اس کا دعوے کرتے ہیں تو اس میں ملک کی برائی ہوگی۔ لیکن اگر آپ کو دل سے یہ یقین ہو گیا ہے کہ عدم تشدد یعنی روحانی طاقت ہی اصل طاقت ہے تو ہمیں سمجھنا چاہئے کہ یہ طاقت خدا سے ملتی ہے۔

خدا دل میں نہیں تو آپ کتنا ہی کلمہ پڑھتے رہیں اور ہیں گائتری اس سے کچھ فائدہ نہیں۔ یہ تو ایک طوطے کو بھی سکھایا جاسکتا ہے۔ بلکہ طوطا تو گائتری اور کلمہ دونوں پڑھ سکتا ہے۔ مگر رہتا طوطے کا طوطا ہی۔ یہ بنیادی چیزیں ہیں نے کچھ تفصیل سے آج آپ کے سامنے رکھی ہیں۔ کیونکہ باقی سب چیزیں اسی میں سے نکلتی ہیں۔"

آٹھواں باب

گاندھی جی اور بادشاہ خاں کی گفتگو

گاندھی جی کی صوبہ سرحد کی مہم کا ایک نازک مرحلہ وہ تھا جب کہ پشاور اور مردان کے ضلعوں میں خدائی خدمت گاروں کا معائنہ کرنے کے بعد انھوں نے ۱۹ر اور ۲۰ر اکتوبر کو اتمان زئی کی پرسکون قیام گاہ میں بادشاہ خاں سے تبادلۂ خیالات کیا۔ انھوں نے پوچھا آپ کے خیال میں خدائی خدمت گاروں کا رویہ عدم تشدد کے بارے میں کیا ہے۔ بادشاہ خاں نے جواب دیا "مہاتما جی میرا خیال یہ ہے کہ جیسا خود انھوں نے ہمارے سامنے اعتراف کیا تھا وہ اناڑی رنگروٹ ہیں، اور ابھی تک معیار سے بہت پیچھے ہیں۔ اُن کے دلوں میں تشدد موجود ہے اور وہ اُسے دور کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ ان کے مزاج میں خرابیاں ضرور ہیں مگر اُن کے خلوص میں شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر موقع ملے تو اُن کو ٹھیک

کیا جا سکتا ہے، اور میرے خیال میں اس کی کوشش ضرور کرنی چاہیئے۔"

بات یہ ہے کہ بادشاہ خاں کو خود اس معاملے میں بہت فکر ہے۔ انھیں یقین ہے کہ تشدد اُن کی قوم کے لئے ایک لعنت ثابت ہوا ہے۔ یہ ایک ناسور کی طرح اُنھیں کھائے جاتا ہے اور اُن کے زوال کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ ایک اور موقع پر گاندھی جی سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے اس مسئلے کو چھیڑا۔ وہ اپنے ملک کے قدرتی مناظر کی حسن و دلکشی کا ذکر کر رہے تھے اور ان پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری تھی جو ایسے موقعوں پر ہمیشہ ہو جاتی ہے۔ لیکن جب وہ قدرت کا ذکر کرتے کرتے انسان پر آئے تو اُن کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ انھوں نے کہا:۔

"مہاتما جی! یہ ملک جہاں میوے اور غلّے کی اس قدر افراط ہے، دنیا میں جنت کا نمونہ ہوتا مگر آج یہ ایک عذاب میں مبتلا ہے۔ مجھے روز بروز زیادہ یقین ہوتا جاتا ہے کہ تشدد اس صوبے میں ہم پٹھانوں کے لئے سب سے بڑی لعنت ثابت ہوا ہے۔ اس نے ہمارے ایکے کو توڑ دیا اور ہم میں خانہ جنگیاں پیدا کر دی ہیں۔ آج کل پٹھان کی ساری طاقت کا مصرف یہی ہے کہ اپنے بھائی کا گلا کاٹ ڈالے۔ اگر ہمیں اس لعنت سے چھٹکارا مل جائے تو پٹھانوں کی اس قوت سے کیسے کیسے مفید کام لئے جا سکتے ہیں۔"

اور صوبوں میں چاہے جو کچھ بھی ہو مگر یہ مجھے پورا الیقین ہے کہ صوبہ سرحد کے لئے عدم تشدد کی تحریک خدا کی بڑی رحمت ہے۔ پٹھانوں کے لئے عدم تشدد کے سوا نجات کی کوئی اور راہ نہیں۔ میں یہ بات اپنے اس تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ کہ عدم تشدد پر تھوڑا سا عمل کرنے سے ہم میں ایک حیرت انگیز انقلاب ہو گیا ہے۔ مہاتما جی! ہم پہلے بزدل اور کاہل تھے۔ انگریز کو دیکھ کر ڈر جاتے تھے۔ ہمارا وقت بیکار گذرتا تھا۔ آپ کی تحریک نے سارا نقشہ بدل دیا ہے۔ اس نے ہم میں ایک نئی روح پھونک دی ہے، اور ہمیں اس قدر محنتی بنا دیا ہے کہ جس کھیت میں پہلے دس روپے کی فصل پیدا ہوتی تھی، اب بیس روپے کی ہوتی ہے۔ ہم نے خوف کو دل سے دور کر دیا ہے۔ اور اب ہم انگریز سے کیا دنیا میں کسی سے بھی نہیں ڈرتے۔"

انھوں نے مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کیا۔ سول نافرمانی کے زمانے میں ایک انگریز افسر نے جس کے ساتھ سپاہیوں کا ایک دستہ تھا، سرخ پوشوں کے جلوس کو منتشر ہونے کا حکم دیا۔ دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت حکم امتناعی اس کی جیب میں تھا مگر وہ اسے دکھاتا نہیں تھا کیونکہ وہ اپنا دبنگ پن ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ اس نے چاہا کہ ایک سرخ پوش کے ہاتھ سے جو جلوس کے آگے آگے تھا، قومی جھنڈا چھین لے۔ لیکن اس شخص نے جھنڈا نہیں

دیا۔ اس پر وہ آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے سپاہیوں کو گولی چلانے کا حکم دیا۔ مگر یہ دیکھ کر اس کے چھکے چھوٹ گئے کہ سُرخ پوش نہایت اطمینان سے سینے پر گولیاں کھانے کو تیار کھڑے ہیں۔ اس لئے اُسے کچھ اور کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ بادشاہ خاں نے کہا۔ "مہاتما جی اس کی حالت اس وقت دیکھنے کے قابل تھی۔ اس کے منہ سے بات تک نہیں نکلتی تھی۔ میں نے اسے اطمینان دلانے کے لئے کہا کہ ہم لوگ نہتے ہیں، آپ کو ہم سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر آپ اس قدر غرور اور تحکم سے کام لینے اور گولی چلانے کا حکم دینے کے بجائے پہلے ہی حکم امتناعی دکھا دیتے تو ہم چپ چاپ منتشر ہو جاتے۔ اس لئے کہ ہم احکام کی خلاف ورزی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ انگریز ہمارے عدم تشدد سے ڈرتے ہیں کہتے ہیں کہ ایک غیر متشدد پٹھان تشدد کرنے والے پٹھان سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

اگر ہم عدم تشدد کے اصول کو جس کی آپ نے ہم کو تعلیم دی ہے پوری طرح سمجھ سکتے اور اس پر عمل کرتے تو پھر ہماری طاقت اور کامیابی کا کیا پوچھنا تھا۔ ہم تباہی کے گڑھے میں گرنے ہی کو تھے لیکن خدا نے اپنے فضل و کرم سے عدم تشدد کی تحریک کے ذریعے سے ہمیں بچا لیا۔ میں اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کرتا ہوں کہ سورا ج کے نعرے لگانے سے کیا فائدہ۔ اگر تم خوف کو دل سے دور کر دو

اور اپنی قوت بازو سے حلال کی روزی پیدا کرو۔ تو تم کو وہی تمہارا سوراج ہے۔"

گاندھی جی نے بادشاہ خان کو رائے دی کہ اگر اُن کو عدم تشدد کے اصول کی سچی آزمائش کرنی ہے تو خدائی خدمت گاروں کو اس کے لئے تیار رہنا چاہیے کہ وہ عملی عدم تشدد کی تربیت حاصل کریں۔ بادشاہ خان پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اتمان زئی کے قریب ساروبندی کے گاؤں میں خدائی خدمت گاروں کے لئے ایک ٹریننگ سنٹر قائم کریں۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے ہوا تھا کہ خود اتمان زئی میں کتائی اور بنائی کا ایک مرکز کھولا جائے گا اور یہاں خدائی خدمت گاروں کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی کتائی اور بنائی وغیرہ کے مہذب اور پرامن فن سکھائے جائیں گے۔ بادشاہ خان نے کہا "مہاتما جی میرا خیال یہ ہے کہ اتمان زئی کو ایک نمونے کا گاؤں بنایا جائے۔ کتائی اور بنائی کا مرکز گاؤں والوں کی تعلیم کے لئے ایک مستقل نمائش کا کام دے گا۔ خدائی خدمت گاروں کے مرکز میں ہم یہ کوشش کریں گے کہ اپنی سب ضرورتوں کو خود ہی پورا کریں۔ ہم صرف اپنے بنائے ہوئے کپڑے پہنیں گے۔ اپنی بوئی ہوئی ترکاریاں اور پھل کھائیں گے اور ایک چھوٹی سی ڈیری کھول لیں گے جس سے دودھ ملتا ہے جو چیز ہم خود پیدا نہیں کر سکتے اسے ترک کر دیں گے۔ گاندھی جی نے کہا "بہت اچھا خیال ہے بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں

کہ خدائی خدمت گاروں کو اپنے رہنے کے لئے جھونپڑیاں بنانے میں
بھی حصہ لینا چاہیئے"۔ بادشاہ خان نے جواب دیا کہ ہمارا
بھی یہی ارادہ ہے"۔

کارکنوں کے پہلے جتھے کی ٹریننگ کے لئے گاندھی جی نے یہ
رائے دی کہ بادشاہ خان کچھ خدائی خدمت گاروں کو منتخب کر کے
وردھا بھیج دیں جہاں وہ کھادی کے فن میں مہارت حاصل کرنے کے
علاوہ فرسٹ ایڈ (حادثوں کا فوری علاج)، حفظانِ صحت، صفائی
گاؤں سدھار کے دوسرے کام، اور ہندوستانی زبان سیکھ لیں گے
اس کے ساتھ ساتھ وہ بنیادی تعلیمی اسکیم سے بھی واقف ہو جائیں
گے اور وہاں سے آکر عام تعلیم کا کام کر سکیں گے۔ گاندھی جی نے
یہ بھی کہا کہ" خان صاحب آپ کا کام اس کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا
آپ آگے آگے چلیں اور خود ان سب چیزوں میں مہارت حاصل کریں
بادشاہ خان نے اس سے اتفاق کیا۔ آخر میں گاندھی جی نے فرمایا
" اگر آپ نے اپنے اس ادارے میں وقت کی پابندی سختی سے نہ
کرائی تو سارا کام بگڑ جائے گا۔ دن بھر کے کام کا ایک دستور العمل
ہونا چاہیے۔ صبح اُٹھنے، رات کو سونے، کھانے، کام اور آرام
کے اوقات مقرر ہونے چاہئیں اور ان کی سختی سے پابندی ہونی
چاہیئے، میں اپنے پروگرام کو وقت کی پابندی پر سب سے زیادہ
زور دیتا ہوں۔ اس لئے کہ یہ بھی عدم تشدد کا لازمہ ہے"۔

اس کے بعد ان دونوں نے اس مسئلے پر گفتگو کرنی شروع کی کہ جب خدائی خدمت گار عدم تشدد میں پکے ہو جائیں گے تو وہ سرحد پار کے قبائل کے چھاپوں سے نبٹنے کا کیا طریقہ اختیار کریں گے۔ بادشاہ خاں کا یہ خیال تھا کہ یہ کام پولس اور فوج کی موجودگی کی وجہ سے، جن پر عوام کو پوری طرح اختیار نہیں ہے، بہت مشکل ہو گیا ہے۔ یا تو حکام کو ہمارے ساتھ پوری طرح اتحاد عمل کرنا چاہیئے یا پہلے آزمائش کے طور پر ایک ضلع سے پولس اور فوج کو ہٹا لینا چاہیئے۔ اس وقت ہم خدائی خدمت گاروں کے ذریعے امن قائم کرنے کی ذمہ داری لے سکتے ہیں۔ انھوں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ بغیر اس کے امن قائم کرنے کی ساری کوششیں بے کار ثابت ہوں گی۔

لیکن گاندھی جی کا خیال اس سے مختلف تھا۔ انھوں نے کہا "صاف بات تو یہ ہے کہ مجھے حکام سے یہ اُمید نہیں کہ وہ ہمارے ساتھ پوری طرح اتحاد عمل کریں۔ انھیں اگر ہماری نیت پر نہیں تو ہماری طاقت پر ضرور شبہہ ہوگا۔ یہ توقع بہت زیادہ ہے کہ وہ ہمارے بھروسے پر پولس کو ہٹا لیں۔ عدم تشدد ایک عالم گیر اصول ہے اور اس کے عمل میں ناسازگار ماحول سے خلل نہیں پڑ سکتا، بلکہ دراصل اس کی قوت کا اسی وقت امتحان ہو سکتا ہے جب وہ مخالفت کی فضا میں کام کرے۔ اگر ہمارا عدم تشدد اپنی کامیابی کے لئے حکام

کی مرضی کا پابند ہو تو وہ بالکل کھوکھلی اور نکمی چیز ہو گا۔ اگر ہم لوگوں
پر پورا اثر قائم کر سکیں تو فوج اور پولس کچھ نقصان نہ پہنچا سکے
گی۔" انھوں نے بادشاہ خاں کو بتایا کہ پرنس آف ویلز کے آنے
کے موقع پر بمبئی میں جو فسادات ہوئے تھے، ان میں کانگریس نے
فوراً حالات پر قابو پا کر امن قائم کر دیا اور پولس اور فوج کھڑی تماشا
دیکھتی رہی۔

بادشاہ خاں "مگر مشکل یہ ہے کہ چھاپہ مارنے والے اکثر وہ
بدمعاش ہیں جو برطانوی ہندوستان سے بھاگ کر گئے ہیں، ہم کو
ان سے ملنے کا موقع نہیں مل سکتا اس لئے کہ حکام ہمیں قبائلی
علاقے میں جانے کی اجازت نہیں دیتے"

گاندھی جی "انھیں ضرور اجازت دینی چاہیئے، اور میں آپ
سے یہ کہتا ہوں کہ جب ہم پوری طرح تیار ہو جائیں گے تو وہ ضرور
اجازت دیدیں گے لیکن اس کے لئے ہمیں سچے معنی میں خدا کی خدمت گار
بننا پڑے گا اور عدم تشدد کو ایک زندہ اصول بنانا پڑے گا
عدم تشدد ایک اعلیٰ درجے کی عملی قوت ہے۔ یہ روحانی یا خدائی
قوت ہے جو ہمارے اندر موجود ہے۔ ناقص انسان اس جوہر کامل
کا مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ اس کی آنکھیں اس کے نور سے خیرہ ہو جاتی ہیں
لیکن اگر اس کا ایک ذرہ بھی ہمارے اندر قوت سے فعل میں آجائے
تو ایسے ایسے کام کر سکتا ہے جس سے لوگوں کی عقل دنگ رہ جائے۔

سورج کی جاں بخش حرارت سے ساری کائنات کو فیض پہنچتا ہے، لیکن اگر کوئی اس سے زیادہ قریب پہنچ جائے تو جل کر راکھ ہو جائے یہی حال ذات الٰہی کا ہے ہم جتنا عدم تشدد پر عمل کرتے ہیں اتنا ہی خدا سے قریب ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ ہم خدا بن جائیں۔ عدم تشدد کا عمل ریڈیم کی طرح ہے۔ اس کی ایک خفیف سی مقدار اگر کسی زہریلے پھوڑے وغیرہ کے اندر موجود ہو تو برابر خاموشی سے اپنا کام کرتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ سارے خراب گوشت کو ٹھیک کر دیتی ہے۔ اسی طرح سے سچے عدم تشدد کی تھوڑی سی مقدار بھی ہماری نظروں سے پوشیدہ خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتی رہتی ہے، اور سارے سماج کو بدل دیتی ہے۔

اس کا عمل بغیر کسی خارجی محرک کے آپ ہی آپ ہوتا ہے روح مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ اس کا وجود جسم پر منحصر نہیں ہے۔ اس طرح عدم تشدد یا روحانی قوت کو اپنا اثر ڈالنے کے لیے جسمانی وسائل کی ضرورت نہیں۔ وہ بغیر ان کے کام کرتی ہے وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر عدم تشدد ایک جگہ کامیابی کے ساتھ قدم جما لے تو اس کا اثر سب کہیں پھیل جائے گا۔ جب تک اُتمان زئی میں ایک ڈاکہ بھی پڑے گا، میں یہی کہوں گا ہمارا عدم تشدد صحیح نہیں ہے۔

وہ بنیادی اصول جس پر عدم تشدد کا عمل مبنی ہے یہ ہے کہ جو بات ایک کے لئے صحیح ہے، وہ ساری دنیا کے لئے صحیح ہے۔ سب انسان حقیقت میں ایک ہیں۔ اس لئے جو میرے لئے ممکن ہے وہ سب کے لئے ممکن ہے۔ اس دلیل سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر میں ان مسائل کو جو کسی ایک گاؤں میں پیدا ہوتے ہیں عدم تشدد کے ذریعے سے حل کر سکوں تو جو سبق اس سے ملے گا اس کی بدولت میں سارے ہندوستان کے اس قسم کے مسائل حل کر لوں گا۔

اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ سیوا گرام میں بس جاؤں۔ یہاں کا قیام میرے لئے ایک درس عمل ثابت ہوا۔ ہریجنوں کے ساتھ تعلقے سے جو تجربہ مجھے ہوا اس سے ہندو مسلم اتحاد کا بہترین حل ہاتھ آگیا۔ جو معاہدوں وغیرہ سے بے نیاز ہے۔ اسی طرح اگر آپ انسانی زندگی میں سب معاملات کو ٹھیک کرلیں تو سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ ہمارے تعلقات انگریزوں کے ساتھ بھی بہتر ہو جائیں گے۔ اگر ہم انھیں یہ دکھا دیں کہ ہم کو اس حفاظت کی ضرورت نہیں جس کے لئے ان کی پولس اور فوج بظاہر رکھی گئی ہے!!

لیکن بادشاہ خان نے ایک شبہہ ظاہر کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہر گاؤں میں ایسے خود غرض اور لٹیرے موجود ہیں جن کو اپنی ذاتی غرض کے لئے کسی بات میں تامل نہیں۔ کیا یہ بہتر ہوگا کہ ہم ان لوگوں کو بالکل چھوڑ دیں یا ان کو بھی درست کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

گاندھی جی نے کہا "شاید آخر میں ہمیں ان میں سے بعض کو چھوڑنا پڑے لیکن ہمیں یہ حق نہیں کہ کسی کو بھی ناقابلِ اصلاح سمجھیں ہم کو ظالم کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اکثر وہ حالات کے ہاتھوں مجبور رہو جاتا ہے صبر اور ہمدردی کے ذریعے سے ہم کم سے کم ان میں سے بعض کو انصاف کی طرف لا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ برائی بھی اس وقت تک نہیں چل سکتی جب تک بھلائی سے مدد نہ لے۔ صرف حق ایسی چیز ہے جس کو کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کچھ نہ ہو سکے تو آخر میں ہم ان کی بدی کی قوت کو اس طرح کر سکتے ہیں کہ ان سے اتحادِ عمل نہ کریں اور ان کو بالکل تنہا چھوڑ دیں۔

یہ بے تشدد عدم تعاون کے اصول کا نچوڑ ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ عدم تعاون کی جڑ محبت پر قائم ہونی چاہیے۔ اس کی غرض مخالف کو سزا دینا یا نقصان پہنچانا نہ ہونی چاہیے۔ اس کے ساتھ عدم تعاون کرتے ہوئے بھی ہمیں اسے یہ محسوس کرانا چاہیے کہ ہم اس کے دوست ہیں اور جہاں تک ممکن ہو ہمدردی اور خدمت کے ذریعے اس کے دل پر اثر ڈالنا چاہیے۔ سچ پوچھئے تو عدم تشدد کا سب سے بڑا معیار یہی ہے کہ بے تشدد جنگ کے بعد دل میں بغض نہیں رہتا، اور آخر میں دشمن دوست بن جاتے ہیں اس کا تجربہ مجھے جنوبی افریقہ میں جنرل اسمٹس کے ساتھ ہوا۔ شروع میں وہ میرے سخت دشمن

اور نقاد تھے۔ آج وہ میرے پکے دوست ہیں۔ آٹھ سال تک ہم ایک دوسرے کے حریف تھے لیکن دوسری گول میز کانفرنس کے زمانے میں وہی تھے جنھوں نے جلوت اور خلوت میں میرا ساتھ دیا اور میری پوری پوری مدد کی۔ یہ بہت سی مثالوں میں سے ایک مثال ہے۔ زمانہ بدل جاتا ہے اور تہذیبیں مٹ جاتی ہیں لیکن میرا یہ عقیدہ ہے کہ آخر میں صرف عدم تشدد یا وہ چیزیں جو اس پر مبنی ہیں باقی رہ جائیں گی۔ انیس سو سال ہوئے عیسائیت ظہور میں آئی۔ حضرت عیسیٰ کی پیمبری کا زمانہ صرف تین سال تک رہا۔ ان کی تعلیم کو خود ان کے زمانے میں بھی لوگوں نے غلط سمجھا اور آج تو عیسائیت اُن کی مرکزی تعلیم "اپنے دشمن سے محبت کرو" کی بالکل ضد ہے لیکن ایک بڑے اصول کے پھیلنے کے لئے انیس سو سال کی مدت کیا چیز ہے۔

چھ سو سال گذرنے کے بعد اسلام کا دور دورہ ہوا۔ بہت سے مسلمان مجھے یہ تک نہیں کہنے دیتے کہ اسلام جیسا اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے خالص امن ہے۔ میں نے قرآن کے جو معنی سمجھے ہیں اس سے مجھے یقین ہوگیا ہے کہ اسلام کی بنیاد تشدد پر نہیں ہے مگر یہاں بھی تیرہ سو سال زمانے کے لوح پر ایک نقطے سے زیادہ نہیں۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ یہ دونوں مذہب اسی حد تک زندہ رہیں گے جس حد تک کہ ان کے پیرو عدم تشدد کے مرکزی اصول کو اختیار کریں گے۔ مگر یہ چیز صرف دماغ سے نہیں سمجھی جاسکتی بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ قلب میں اُتر جائے۔

نواں باب

"رمضان میں"

کچھ دن تک گاندھی جی اتمان زئی میں آرام کرتے رہے اور اسی عرصے میں بادشاہ خاں کے ساتھ مل کر یہ سوچتے رہے کہ عدم تشدد کے اس نظریے کے مطابق جس کی انھوں نے تلقین کی تھی خدائی خدمت گاروں کی تحریک کی تنظیم از سر نو کس طرح کی جائے اس کے بعد ۲۱ اکتوبر کو انھوں نے صوبۂ سرحد کا دورہ پھر شروع کر دیا۔

اگلے ہفتے گاندھی جی کو کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خاں کے اضلاع کا دورہ کرنا پڑا اور بہت سخت مصروف رہے۔ جوں جوں ہم پشاور اور مردان کے پشتو بولنے والے اضلاع سے (یہ سُرخ پوش کہلاتا ہے، اس لئے کہ یہاں خدائی خدمت گاروں کی تحریک کا زور زیادہ ہے) جنوب کی طرف بڑھتے گئے ہمارا روزانہ سفر لمبا ہوتا گیا۔ موٹر کی سواری زیادہ تکلیف دہ ہوتی گئی۔ مجبوراً

کا شور و غل بڑھتا گیا، اور ضبط و نظم کم ہوتا گیا۔ جلسوں میں شرکت کی زحمت اس کے علاوہ تھی۔

اس خیال سے کہ بادشاہ خان اور خدائی خدمت گاروں کو رمضان کے زمانے میں دورے کا انتظام کرنے کی زحمت نہ اُٹھانی پڑے گاندھی جی نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ یا تو ان کے دورے کا پروگرام کم کر دیا جائے یا دورے کی رفتار تیز کر دی جائے لیکن بادشاہ خان نے ایک نہ سنی وہ اور ان کے خدائی خدمت گار باوجود رمضان کے اپنے کٹھن فرائض کو ان تھک محنت سے انجام دے رہے تھے۔ اتمان زئی میں اُنھوں نے گاندھی جی کے آرام کے خیال سے اپنے سارے خاندان کو تتر بتر کر دیا۔ اپنے بیٹے کو اُنھوں نے نوکروں کی کوٹھری میں بھیج دیا، اور خود کہیں اور جا کر سوئے۔ وہ گاندھی جی کی طرف سے دم بھر بھی غافل نہیں ہوتے تھے اور دن رات اُن کی حفاظت اس طرح کرتے تھے جس طرح شیرنی اپنے بچے کی کرتی ہے۔ جب گاندھی جی سو جاتے تھے تو ان کا اُٹھ کر دبے پاؤں چلنا اور ہر چیز کی دیکھ بھال کرنا دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا کبھی وہ اپنے رومال سے فرش کے دھبے جو نوکروں کے پاؤں سے پڑ گئے تھے، جھاڑ دیتے۔ کبھی آہستہ سے گاندھی جی کی چادر کو جو ہٹ گئی تھی ٹھیک کرتے یا جب کوئی دوسرا موجود نہ ہوتا تو مکھیاں اُڑاتے رہتے اور جیسے ہی کوئی اُن کے بجائے کام کرنے

کو پہنچ جاتا۔ چپکے سے کمرے سے چلے جاتے۔ گاندھی جی کے لیے بہترین پھل مہیا کرنے کی خاطر انھوں نے اپنے دوستوں، اور ہمسایوں کے باغ کے باغ چھان ڈالے۔ ایک صبح یہ منظر دیکھنے کے قابل تھا کہ بادشاہ خاں چپکے سے گھر سے نکل گئے اور کئی گھنٹے کے بعد موسم کے پہلے انگوروں کا ایک بڑا سا خوشہ لیے ہوئے آئے اور آکر گاندھی جی کے سامنے رکھ دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اتمان زئی سے دو تین میل کے فاصلے پر خدائی خدمت گاروں کے سردار کے گھر گئے تھے۔ جہاں اُنھوں نے ایک خوشہ کو شاخوں کے اندر چھپا ہوا پہلے سے دیکھ رکھا تھا یہ محض اس کی ایک مثال ہے کہ وہ گاندھی جی کی خاطر مدارت میں کس قدر اہتمام کرتے تھے۔ کوہاٹ روانہ ہونے سے پہلے انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ دورے کے باقی حصے میں آزمودہ کار خدائی خدمت گاروں کی ایک لاری گاندھی جی کے ساتھ رہے گی۔

کوہاٹ کا ضلع شمالی مغربی سرحدی صوبہ کے وسط میں واقع ہے۔ کوہاٹ کا شہر اور چھاؤنی جو تحصیل کوہاٹ کے مغربی حصے میں واقع ہے۔ پشاور سے موٹر کے راستے چالیس میل ہے۔ سڑک کا کچھ حصہ درہ کوہاٹ کے آفریدیوں کے علاقے سے گزرتا ہے۔ کوہاٹ کا درہ لمبائی میں درۂ خیبر سے کم ہے خیبر کو لوگ "خونی شاہراہ" "مرگ مفاجات کی راہ" وغیرہ وغیرہ
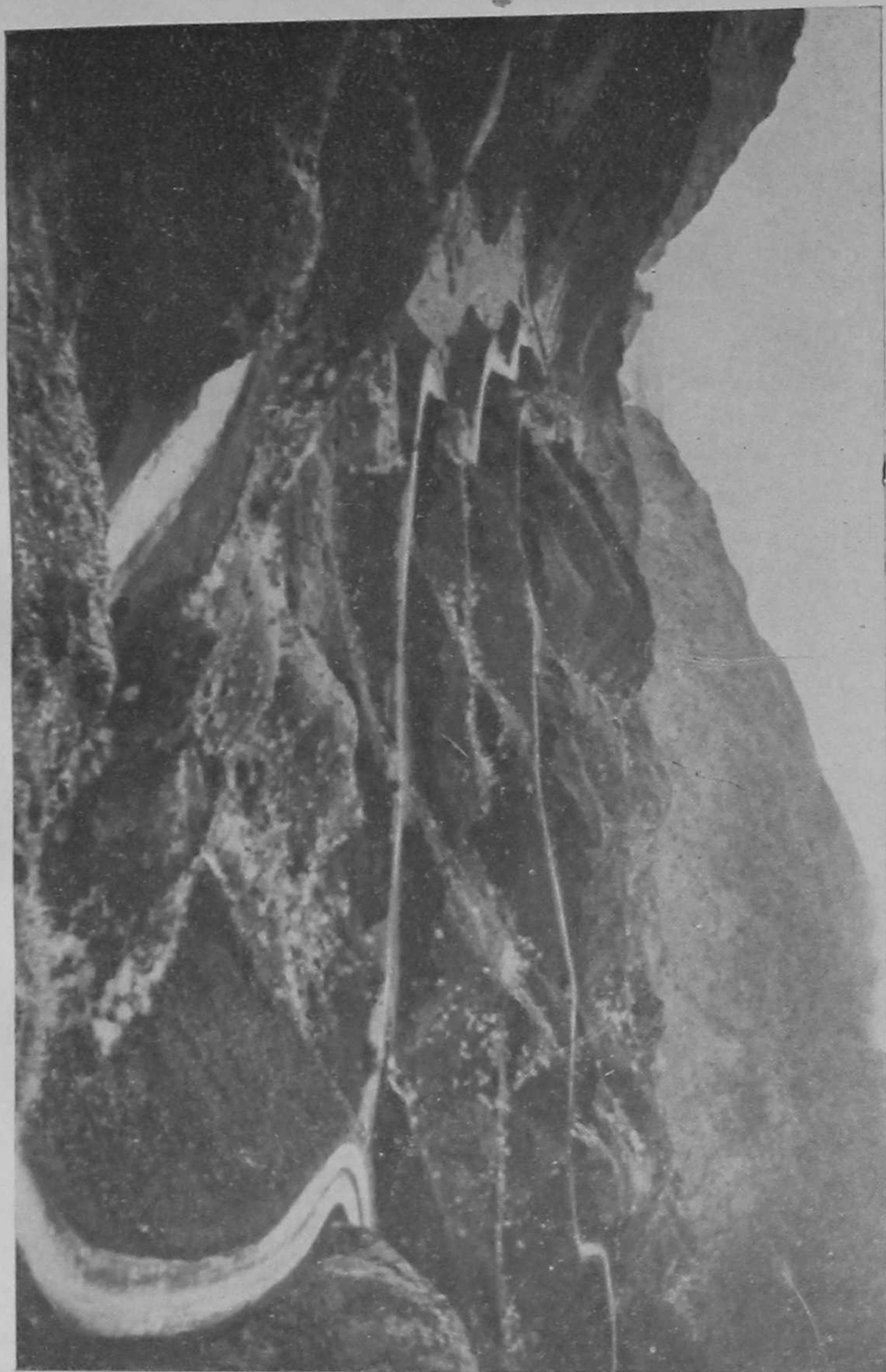
کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس کی تنگ گھاٹیوں کی بھیانک خاموشی سے دل پر ہیبت بیٹھ جاتی ہے۔ یہ ہمیشہ سے وہی خیبر ہے "جری خل خوار، ناقابل تسخیر اور پراسرار!" کوہاٹ کا درہ خیبر سے زیادہ سنگ لاخ ہے۔ اس کا وحشی حسن زیادہ دل کش ہے لیکن اتنا ہیبت ناک نہیں۔ اس کی چوٹیاں زیادہ اونچی ہیں اس کی سرخ سفید اور سیاہ چٹانیں دھوپ میں چمکتی ہوئی زیادہ حسین معلوم ہوتی ہیں، اور نیچے وادی میں زرخیز کھیتوں اور چھوٹی موٹی خوش نما جھونپڑیوں کا سلسلہ ایک تصویر کا منظر دکھاتا ہے، جس میں بنفشئی اور سنہری رنگوں کی قلم کاری عجب لطف دیتی ہے۔

بادشاہ خاں پہاڑ کی سرد ہوا کے جھونکوں سے اور ان مناظر کے دل فریب حسن سے باغ باغ تھے۔ انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ کوئی شخص قدرت کے ان شان دار نظاروں سے متاثر نہ ہو۔ دفعتہً وہ چلا اٹھے "وہ دیکھو عجب خاں کا گھر" اسی کے ساتھ انھوں نے ایک چھوٹی سی صاف ستھری کچی جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے یہ الفاظ جو میک من کی کتاب سے یاد رہ گئے تھے۔ دہرائے "عجب خاں مولی ایلس کا بھگانے جانے والا مشہور ڈاکو جس نے اپنے طول طویل سلسلۂ جرائم کی پاداش میں پھانسی کی سزا پائی۔"

بادشاہ خاں ہنسنے لگے "کیا کہا پھانسی پا لی؟ اجی وہ تو اب تک زندہ ہے اور ترکستان کی سرحد پر کسی جگہ رہتا ہے۔ کون کہتا ہے کہ وہ بدمعاش تھا۔" اس کے بعد انھوں نے اس ڈاکو کا سارا قصہ سنایا اور ایک شخص نے جو قصے کے سب افراد کو اچھی طرح جانتا تھا اور جس نے سب واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے تھے اس کی تصدیق کی۔ عجب خاں بغیر لائسنس کے ہتھیار بیچا کرتا تھا۔ برطانوی فوج کے میجر نے اس کے مکان پر چھاپا مارا اس نے کہا اور تم جو جی چاہے کرو لیکن اگر زنانے میں قدم رکھا تو اچھا نہ ہوگا افسر ہنسنے لگا اور اس نے زنانے میں عورتوں کے برقعے اتروانے شروع کیے۔ ڈاکو نے جو کہا تھا وہی کر دکھایا —— اُسے ایک ہی تدبیر آتی تھی اور وہی اُس نے اختیار کی۔ مجھے فوراً ایک مشہور مصنف کی کتاب کے، جو ابھی حال ہی میں پڑھی تھی، یہ الفاظ یاد آ گئے۔ "اس ملک میں اگر کسی مرد کو مارو یا کسی عورت کی توہین کرو تو اس کا ایک ہی نتیجہ ہے، اور وہ موت ہے۔ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ سزا ٹل جائے تو یہ ناممکن ہے .... دشمن جہاں ہاتھ آیا، چاہے وہ سو رہا ہو یا بیمار ہو کسی حالت میں بچ نہیں سکتا .... ان عداوتوں کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔" میں نے یہ الفاظ بادشاہ خاں کو سنائے۔ اُنھوں نے کہا "جانتے ہو کہ جب مس ایلس عجب خاں کی حراست میں تھی

تو اس کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا گیا؟ چاہے جس سے پوچھ لو، وہ خود یہ کہتی تھی کہ گوری قوم کا کوئی شخص اس کی عصمت کا اس قدر احترام نہ کرتا جس قدر عجب خاں نے کیا۔"

کوہاٹ میں بہت زیادہ کام تھا اور اتنا وقت نہ تھا کہ ہم گرم اور ٹھنڈے پانی کے مشہور چشموں کو جا کر دیکھتے، یا ان خوشنما پہاڑوں کی سیر کرتے جو شہر کے آس پاس واقع ہیں۔ دن بھر گاندھی جی کے پاس مختلف لوگوں کے وفد آتے رہے۔ ایک وفد کمیٹی معافی قرضہ کوہاٹ کا تھا جس نے یہ درخواست پیش کی کہ ۱۹۲۴ء کے فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں ان لوگوں کو جو لوٹے گئے تھے اور جن کے گھروں میں آگ لگا دی گئی تھی، حکومت کی طرف سے قرض دیا گیا تھا۔ اب ان وعدوں کے مطابق جو بار بار کئے جا چکے ہیں ہماری درخواست ہے کہ یہ قرض معاف ہو جائے۔ ایک اور وفد کسانوں کی طرف سے تھا جنھوں نے لگان کے متعلق اپنی شکایات پیش کیں۔ ان کے علاوہ ہریجنوں اور سکھوں کے وفد بھی آئے تھے۔ بہت سے لوگوں نے ایک بڑے کاغذ پر اپنی شکایتیں اور درخواستیں لکھ کر گاندھی جی کو دی تھیں تاکہ وزیر اعظم کو پہنچا دیں۔ گاندھی جی نے ان سب کو اپنی ہمدردی کا یقین دلایا۔ اور وعدہ کیا کہ جب پشاور واپس جائیں گے تو ان معاملات کے متعلق وزیر اعظم سے گفت گو کریں گے ——— ۲۲ کی شام کو شہر

کے باہر ایک خوش منظر میدان میں جس کے گرد پہاڑوں کا ایک قدرتی گول گھر سا تھا، ایک عام جلسہ کیا گیا۔ ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی نے کوہاٹ کے باشندوں کی طرف سے گاندھی جی کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کیا۔ گاندھی جی نے جواب میں ان سب درخواستوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو اس روز ان کے سامنے پیش کی گئی تھیں، کہا میں نے آج آپ کی مشکلوں اور تکلیفوں پر غور کرنے میں ایک گھنٹہ صرف کیا مگر میں آپ کے سامنے اعتراف کرتا ہوں کہ میں اب اس قسم کے معاملات کو طے کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ ایک طرف تو بڑھاپا مجھے رفتہ رفتہ کم زور کر رہا ہے اور دوسری طرف میری ذمہ داریاں بڑھتی جاتی ہیں۔ اور یہ اندیشہ ہے کہ اگر میں بہت سے متفرق کاموں میں پڑ جاؤں تو بڑے بڑے کام رہ جائیں گے۔ ان میں سے خدائی خدمت گاروں کی ذمہ داری جو میں نے لی ہے، بہت اہم ہے اور اگر میں اُسے بادشاہ خاں کے ساتھ مل کر خاطر خواہ پورا کر سکوں تو یہ سمجھوں گا کہ میرے آخری سال ضائع نہیں ہوئے۔

لوگ مجھ پر ہنستے ہیں اور اس خیال کا مضحکہ اُڑاتے ہیں کہ خدائی خدمت گار عدم تشدد کے پکے سپاہی بن سکتے ہیں۔ لیکن مجھ پر اس ہنسی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ عدم تشدد کو جسم سے تعلق نہیں بلکہ روح سے ہے۔ جب اس کے اصلی معنی ایک بار اچھی طرح دل میں بیٹھ جائیں

تو یہ باقی سب باتیں خود بخود ہو جاتی ہیں۔ خدائی خدمت گاروں میں بھی وہی انسانی فطرت ہے جو مجھ میں ہے، اور مجھے یقین ہے کہ اگر میں کسی حد تک عدم تشدد پر عمل کر سکتا ہوں تو وہ بھی کر سکتے ہیں اور انھیں پر کیا موقوف ہے ہر شخص کر سکتا ہے۔ اس لیے میں آپ لوگوں سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے ساتھ مل کر خداوند تعالیٰ سے دعا مانگیے کہ میں نے خدائی خدمت گاروں کے متعلق جو خواب دیکھا ہے اُسے سچا کر دے۔

خدائی خدمت گاروں کے افسروں کے ساتھ گاندھی جی نے بات چیت کے دوران میں کہا ہر جگہ میں نے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ بادشاہ خان نے بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لی ہے مگر میری اور آپ لوگوں کی ذمہ داری ان سے بھی زیادہ ہے۔ آپ لوگوں نے جو قدم اٹھایا ہے، وہ کوئی کھیل نہیں۔ آج تک جس ڈھنگ پر پٹھان لوگ چلتے آئے ہیں آپ کا ڈھنگ اس سے نرالا تو ہے ہی مگر اس سے الٹا بھی ہے۔ مارنے کی بجائے خود پٹ جانا ایک نئی چیز ہے، اور جو آپ ہمیشہ سے کرتے آئے تھے اس سے الٹی چیز ہے جو لوگ کئی پشتوں سے مار پیٹ ہی کرتے آئے ہیں ان کے لیے اسے بھول کر عدم تشدد پر چلنا آسان بات نہیں۔ اس لئے جب سے بادشاہ خان نے یہ نیا کام شروع کیا ہے۔ میرے دل میں دو طرح کے خیال اُٹھتے رہے ہیں۔ ایک طرف شک تھا دوسری

طرف خوشی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ خود آ کر بادشاہ خاں کے کام کو دیکھوں مگر ایسا نہ کر سکا۔ میں نے اپنے لڑکے کو بھیجا تھا اور اس کے علاوہ ویریئر ایلون[1] (VERRIAR ELVIN) بھی یہاں آ چکے ہیں۔ ان لوگوں نے میرا شک دور کیا اور مجھے بتلایا کہ سچ مچ یہ لوگ عدم تشدد پر چلتے ہیں۔ مگر پھر بھی تھوڑا بہت شک میرے دل میں باقی رہا کیونکہ مجھے عدم تشدد کے راستے کی مشکلات کا بخوبی تجربہ ہے اس لئے آج میں خود آپ لوگوں کے پاس اپنی آنکھوں سے آپ کا کام دیکھنے کے لئے آن پہنچا ہوں۔

جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں مجھے ایک طرف شک تھا تو دوسری طرف میری خوشی کی بھی کوئی حد نہیں تھی۔ جو لوگ لاٹھی اور تلوار کے ایسے ایسے جوہر دکھلاتے ہیں۔ اگر وہ ان کو چھوڑ کر عدم تشدد کو پکڑ لیں تو یہ ہندوستان کی بڑی خوش قسمتی ہے۔ آج تک اس ملک میں پٹھانوں کے بارے میں جو خیال چلا آیا ہے اس کی وجہ سے اور اُن کا جو تجربہ لوگوں کو ہوا ہے، اس سے بھی لوگوں کے دلوں میں پٹھانوں کا ایک ڈر پیدا ہو گیا ہے۔ گجرات (کاٹھیاواڑ) میں بچے پٹھان کا نام سُن کر کانپ جاتے ہیں۔ سابرمتی آشرم میں

---

[1] گاندھی جی کے ایک انگریز پادری دوست جو کہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔

ہم نڈریتا کی تعلیم دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن شرم کی بات ہے کہ اتنا کرنے پر بھی ہم پورے طور سے پٹھانوں کا ڈر اُن کے دل سے نہیں نکال سکے۔ میں آشرم کی لڑکیوں کو نہیں سمجھا سکا کہ انھیں کسی سے نہیں ڈرنا چاہیئے وہ بظاہر نڈر بنتی بھی تھیں۔ مگر جب کبھی ہندو مسلم فساد ہوتا اور کوئی پٹھان آ نکلتا تو ادھر وہ نہیں جاتی تھیں کہ کہیں اٹھا نہ لے جائے۔ میں اُنھیں سمجھاتا کہ اگر کوئی پٹھان اُٹھا بھی لے جائے تو پھر کیا ہے۔ تم اس کے گلے پڑنا کہ میں تو تیری بہن ہوں۔ تو مجھے کہے گا کیا؟ اور اگر خدا نہ کرے وہ کسی نامناسب بات پر بھی اُتر آئے تو دانتوں سے زبان کاٹ کر تم اپنی جان دے دینا۔ مگر اس کے بس میں نہ آنا۔ مرنا تو ایک روز ہے ہی۔ وہ کہتی تھیں "یہ ہے تو ٹھیک۔ لیکن ہمارے لئے یہ ایک نئی بات ہے معلوم نہیں یہ ہم سے ہو سکے گا یا نہیں۔ اس لئے ڈر لگتا ہے" جب ان کی یہ حالت ہے تو ایک معمولی لڑکی کتنا ڈرتی ہوگی۔ اس لئے جب میں سنتا ہوں کہ ان لوگوں میں ایک لاکھ خدائی خدمت گار ایسے پیدا ہو گئے ہیں جنھوں نے تشدد چھوڑ دیا ہے۔ اور اب کسی کو اُن سے ڈرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی تو میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ یہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی تاریخ میں ایک بہت بڑی بات ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ باوجود اتنی زیادہ خوشی کے میرے دل میں شک کیوں تھا۔

تشدد چھوڑنے کی کیا شرط ہے اور تشدد چھوڑنے والوں کو کیا کرنا چاہیئے۔ اس کا مجھے کچھ تجربہ ہے۔ میں نے بادشاہ خان سے اس بارے میں کچھ باتیں کی ہیں۔ صرف اپنے آپ کو خدائی خدمت گار کہنے ہی سے کوئی خدائی خدمت گار نہیں بن سکتا اور نہ سرخ کپڑے پہننے سے۔ اگر ہمیں اس امتحان میں پاس ہونا ہے تو ہمیں ایک مرکز بنانا ہوگا جہاں آپ کو عدم تشدد کی تعلیم مل سکے۔ آپ میں سے اکثر لوگوں کو سرحد سے باہر بھی جانا ہوگا۔ کاتنے بننے کا ایک مرکز ہمیں اتمان زئی میں قائم کرنا ہوگا۔ جہاں خدائی خدمت گاروں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اگر کام سیکھنا چاہیں تو سیکھ سکیں۔ یورپ میں لوگوں نے ایک دوسرے کا گلا کاٹنا اپنا دھرم بنا لیا ہے۔ وہ کروڑوں روپے اسی کام پر خرچ کر رہے ہیں۔ ان کے اچھے اچھے سائنس داں رات دن اسی کام میں لگے رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ عیش و عشرت کے سامان پیدا کرنے میں اپنی بے اندازہ طاقت اور روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت ہی ایسی ہوئی ہے اس کے برعکس خدا پرست آدمی کی کیا علامتیں ہوں گی؟ پرہیزگاری دستکاری خدا کی مخلوق کی دن رات خدمت اور خیال اس کا شعار ہوگا۔ یہ کام کرتے کرتے آپ کو پتہ لگ جائے گا کہ اس طرح آپ نے کتنی ترقی کی ہے اور عدم تشدد میں کس قدر طاقت ہے اس کا بھی آپ کو تجربہ ہوگا۔ اس طاقت کے سامنے تلوار کیا

چیز ہے۔ اس طاقت سے اکیلا آدمی ساری دنیا کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ تلوار والا نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا مرکز یہاں بن جائے تو تمام سال تو نہیں مگر سال کا کچھ حصہ میں یہاں آکر گذاروں گا۔

آج تک عدم تشدد کا ہم نے ایک ہی مطلب سمجھا ہے۔ یعنی سرکار کے قانون توڑنا اس کے لیے وہ سختی کرے تو اس کو برداشت کرنا اور تشدد کو بھول جانا۔ مگر میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگرچہ یہ سب چیزیں عدم تشدد کی لڑائی میں ناگزیر ہیں مگر اس کی قابلیت آپ ہی آپ پیدا نہیں ہو جاتی بلکہ تیاری سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ بعد کی چیز ہے۔ شروع کی نہیں۔ لوگوں کے دلوں میں سرکار کا ڈر پیدا ہو گیا تھا، اس کو نکالنے کا یہ علاج میں نے بتایا تھا۔ ایک اچھا حکیم مریض کو کوئی تیز دوا دے تو ٹھیک وقت پر اسے بند بھی کرنا جانتا ہے۔ ورنہ اس کو مریض سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ میں نے عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تیز دوائی تو دی تھی مگر وقت پر روک بھی لی۔ لوگوں نے گالیاں بھی دیں کہ میں چیز کو آخر تک نہیں لے جاتا میں ان پر ہنستا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ پٹنہ میں میں نے اعلان کیا کہ اب سول نافرمانی سوائے میرے کسی کو نہیں کرنی چاہیئے جب تک فضا نہ سدھرے وہ سب کے لئے بند رہے گی۔ اسی طرح میں چاہتا ہوں کہ اس وقت آپ سول نافرمانی بھول جائیں۔

میری عادت ہے کہ ہر چیز میں خدا کا ہاتھ دیکھنا چاہتا ہوں چاہے مجھے کوئی وہمی کہے۔ بادشاہ خاں نے جو آپ کا نام رکھا ہے اس میں بھی مجھے خدا کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ دیکھئے انھوں نے آپ کو ستیہ گرہی نہیں بلکہ خدائی خدمت گار کا نام دیا ہے یعنی دن رات خدا کی خدمت کرنے والا۔ مگر خدا کا جسم تو ہے نہیں تو پھر اس کی خدمت کیسے ہو؟ خدا کی خدمت تو اس کی مخلوق کی خدمت کرنے ہی سے ہو سکتی ہے۔

"آدم کو مت خدا کہو آدم خدا نہیں
لیکن خدا کے نور سے آدم جُدا نہیں"

اور ہمارا گاؤں ہی تو ہماری دنیا ہے نا؟ اس کی خدمت کرنے میں دنیا کی خدمت بھی آجاتی ہے۔ بے کار کی بے کاری دور کر کے اس کی پریشانی کو مٹانا۔ مریض کی تیمارداری کرنا۔ لوگوں سے گندی عادتیں چھوڑوانا، اور انھیں صفائی کی تعلیم دینا۔ خدائی خدمت گار کا شیوہ ہوگا، اور چونکہ اس کے سب کام خدا کے لئے ہوتے ہیں، اس لئے تنخواہ بے کر کام کرنے والوں سے اس کا کام اچھا ہونا چاہیئے۔

خدائی خدمت گار خود بے کار نہ بیٹھے۔ اگر اس پاس کہیں تھوڑی سی زمین بھی ہے اور وہ اپنے ہاتھ سے اس میں تھوڑی سی سبزی ہی پیدا کر لیتا ہے تو اس سے کسی غریب مسکین کی مدد ہو جاتی

ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھا رہے اور چونکہ خود اس کے پاس پیسہ ہے (یا اس کے ماں باپ پیسہ چھوڑ گئے ہیں) اس لئے وہ بازار سے سبزی خریدے تو وہ ایک حاجت مند کو اس کی ضرورت سے محروم رکھتا ہے جو ایک طرح خدا کی چوری ہے۔ وہ سچا خدائی خدمت گار نہیں۔ خدائی خدمت گار اگر کوئی چیز بھی لیتا ہے تو پہلے سوچتا ہے کہ کیا اس پر میرا حق ہے؟ اور اگر ہے تو کیا کسی اور کا حق مجھ سے زیادہ تو نہیں؟ اگر اس کے پاس ایک پلاؤ کا بھرا ہوا تھال ہے اور ایک کئی وقت کا بھوکا آ جاتا ہے، تو وہ سوچے گا کہ اگر اس پر اس کا مجھ سے زیادہ حق ہے تو میں چاہے آپ بھوکا رہ جاؤں مگر اس کا پیٹ بھر دوں۔ ہاں اگر پلاؤ زیادہ ہے تو اسے کھلا کر خود پیچھے کھاؤں گا۔

اسی طرح خدائی خدمت گار اپنے وقت کا منٹ بھی ضائع نہیں ہونے دے گا۔ اپنے ایک ایک منٹ کا وہ پورا پورا اور مناسب استعمال کرے گا۔ ہر گھڑی کچھ نہ کچھ پیدا کرتا ہی رہے گا۔ وقت ضائع کرنا یا اس کا فضول استعمال کرنا بھی خدا کی چوری ہے۔

کوہاٹ کے مغرب میں سڑک کے رستے چھبیس میل کے فاصلے پر ہنگو کا قصبہ ہے، جو تحصیل ہنگو کا صدر مقام ہے۔ دوسرے دن گاندھی جی وہاں گئے۔ موسم نہایت شاندار تھا اور دور دراز پہاڑوں کا سلسلہ شفاف ہوا میں بہت صاف نظر آ رہا تھا

آس پاس کی پہاڑیاں جو زیادہ تر سرخ کنکر کی تھیں چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھیں اور جہاں تک نظر کام کرتی تھی بکریوں اور دنبوں کے بے شمار گلے چرتے ہوئے نظر آرہے تھے اور ان کی معصومیت سے بھری ہوئی "میں میں" سے ہوا گونج رہی تھی۔ ہنگو میں ایک عام جلسہ ہوا اور ایڈریس پیش کیا گیا۔ اس ایڈریس میں ایک جملہ یہ تھا کہ صوبہ سرحد کے پاس ہندوستان کی آزادی کی کنجی ہے۔ گاندھی جی نے اپنی تقریر میں اس سے اتفاق کیا اور کہا کہ یہ کنجی اس صوبے کے خدائی خدمت گاروں کے ہاتھ میں ہے۔ "جس طرح گلاب کی دلفریب خوشبو آس پاس کی ہوا کو معطر کر دیتی ہے۔ اسی طرح جب ایک لاکھ خدائی خدمت گار سچے معنیٰ میں عدم تشدد کے پابند ہو جائیں گے تو ان کی خوشبو سارے ملک میں پھیل جائے گی اور غلامی کی لعنت کو جس میں ہم گرفتار ہیں، دور کر دے گی۔

کوہاٹ کی طرح ہنگو میں بھی گاندھی جی نے خدائی خدمت گاروں کے سالاروں سے اہم بات چیت کی انھوں نے کہا:-

"آپ لوگوں نے جس حلف نامے پر دستخط کرکے مجھے دئے ہیں وہ میں نے پڑھ لیا ہے اگر اسے سمجھ کر اس کے مطابق آپ چل سکیں تو میں سمجھ لوں گا کہ آپ نے بڑا بھاری کام کیا۔ آج جب نصرت خیل میں میں نے خدائی خدمت گاروں کے دفتر کی بنیاد ڈالی تھی تو وہاں مجھے ایک سپاس نامہ بھی پیش کیا گیا۔ اس میں سول نافرمانی

کی گذشتہ جنگ کا کچھ ذکر تھا۔ تو آپ سمجھیں کہ جنگ تو ہماری آج بھی جاری ہے۔ اور جب تک آزادی نہیں ملتی جاری رہے گی۔ صرف اس کی صورت بدل گئی ہے۔ دوسری بات اس ایڈریس میں یہ بھی کہ ہم نہ تو اس جنگ میں سختیوں سے ڈرتے تھے اور نہ اب ڈریں گے گورنمنٹ نے کافی تشدد سے کام لیا۔ ہم عدم تشدد پر قائم رہے۔ اور اب بھی ہم اس پر کار بند رہیں گے۔

میں جانتا ہوں کہ ننانوے فی صدی ہندوستانی عدم تشدد کا مطلب اتنا ہی سمجھے ہیں کہ ہم لاٹھی تلوار چھوڑ کر بندوق کا سینہ سپر ہو کر سامنا کریں گے۔ یہ بہت اچھی چیز ہے۔ اس میں بہادری ہے مگر آپ سب اور خاص کر افسر لوگ سمجھ لیں کہ عدم تشدد صرف اسی کا نام نہیں۔ مجھے اس سے بہت زیادہ چیز چاہیئے۔ اگر سچ مچ عدم تشدد کو سمجھ گئے ہیں تو آپ کو جاننا چاہیئے کہ عدم تشدد ایسی چیز نہیں کہ کسی خاص موقع پر صرف کسی ایک جماعت کے لئے کام میں لائی جائے۔ وہ تو چوبیس گھنٹے ہمارے دل میں رہنی چاہیئے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمارے دل کا ایک جزو بن جائے۔ غصہ ہمارے دل سے بالکل مٹ جانا چاہیئے۔ آخر تشدد غصے ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ غصے میں کوئی گولی چلاتا ہے تو کوئی گالی دیتا ہے اور کوئی لاٹھی چلاتا ہے سو اگر غصہ دل میں سے بالکل مٹا دیا جائے، تبھی ہم دعوے کر سکتے ہیں کہ ہم عدم تشدد کو پورا

سمجھتے ہیں۔ اس کے پابند ہیں اور ہمیشہ پابند رہیں گے۔ جب ہم نے سول نافرمانی کی تھی، وہ تو ایک لڑائی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ زندگی بھر چلنے والی چیز نہیں تھی۔ مگر آج جو لڑائی ہم لڑ رہے ہیں اصلی لڑائی تو یہی ہے۔ ہمیشہ سول نافرمانی کیسے ہو سکتی ہے۔ اگر آج ہمیں ہمیشہ کے لئے جیل میں بند کر دیا جائے تو کیا ہماری لڑائی بند ہو گئی؟ وہاں جاکر تو ہمیں بکری کی طرح معصوم بن کر رہنا چاہیئے، وہاں کے قانون توڑ کر انھیں پریشان نہیں کرنا چاہیئے۔ بے شک جیل میں بھی سول نافرمانی کی جا سکتی ہے۔ مگر اس کے خاص شرائط اور قواعد ہیں۔ ان کا ذکر میں ابھی نہیں کرتا۔ صرف اتنا کہوں گا کہ جیل میں جانے کے بعد بھی ہماری لڑائی بند نہیں ہو جاتی۔ جب میں جیل میں تھا تب بھی میری لڑائی جاری تھی۔ عدم تشدد ایک ایسی چیز ہے کہ چوبیس گھنٹے کام کرتی ہے۔ گولی ایسا نہیں کر سکتی۔ گولی دشمن کو مار کر صفحۂ ہستی سے اس کا نشان مٹا دیتی ہے۔ عدم تشدد دشمن کو دوست بنا کر اس کی طاقت کو بھی اپنا کر لیتا ہے۔ سول نافرمانی کر کے ہم نے دنیا کو بتلا دیا کہ ہم کسی کے ماتحت ہو کر نہیں رہنا چاہتے مگر ابھی ہمیں ایک اور قسم کی ہمت کا ثبوت دینا ہے۔ خلافت کے دنوں میں علی بھائیوں کے پاس بڑے۔ لمبے چوڑے پٹھان آتے تھے اور میرے پاس بھی۔ مگر وہ ڈرتے تھے کہ افسروں کو پتہ لگ گیا تو کہیں نکال نہ دیں اور ان سے وہ مجھ سے بھی زیادہ ڈرتے تھے

جسمانی طور پر وہ اتنے بہادر اور مضبوط تھے۔ مگر جب اُن کے مقابلے میں کوئی ان سے طاقت ور آدمی آیا تو وہ ان کے غلام بن کر بیٹھ گئے۔ مجھے تو ایسی طاقت چاہیئے کہ میں سوائے خدا کے جو میرا سردار ہے اور کسی کا غلام نہ بنوں۔ اگر میں یہ کر سکوں تبھی سمجھوں گا کہ عدم تشدد کو میں نے پالیا ہے۔

جیسے میں پہلے کہہ چکا ہوں عدم تشدد کا حربہ ہمیشہ کام کرتا ہے۔ ہم جیل میں گئے تو وہاں حکومت کے جو غلام بھرے ہیں یعنی وہاں کے عہدے دار، ان کے دلوں کو بدل لیں گے۔ انھیں بتادیا گے کہ ہم چور ڈاکو نہیں۔ ہم دشمن کو مارنا نہیں چاہتے۔ انھیں دوست بنانا چاہتے ہیں۔ مگر اُن کے سب اُلٹے سیدھے حکموں کو مان کر نہیں۔ یہ دوست بنانے کا طریقہ نہیں۔ دوست بنانے کا راستہ یہ ہے کہ ہم ان کو بتادیں کہ ان کے لئے ہمارے دل میں دشمنی نہیں برائی نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ خدا ان کا بھلا کرے۔ میں کئی جیلوں میں جا چکا ہوں۔ وہاں میں نے سب کو اپنا دوست بنا لیا۔

آج ہم قانونی طریقے سے لڑ رہے ہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب اور ہم پورے طور پر عدم تشدد کے ماننے والے ہیں تو یہ ہمارے لئے ایک ایسا موقع ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ اگر خود جیل والے یہ بات سمجھ لیں گے تو سرکار کو بھی بتا سکیں گے۔ کہ ہم ان کے دشمن نہیں دوست ہیں۔ اگر ہمارے سب وزیر حق اور عدم تشدد کو سمجھنے والے

ہوں تو ہندوستان کی آج شکل بدل جائے۔ مگر افسوس کہ سب
وزیر سچے عدم تشدد کو نہیں سمجھتے، اور سمجھتے بھی ہیں تو اس پر پورے
طور پر کاربند نہیں ہو سکتے۔

عدم تشدد کی ایک دوسری خوبی یہ ہے کہ اس کی تعلیم لینے کے
لئے نہ کسی مدرسے میں جانا پڑتا ہے، اور نہ کسی پیر یا گرو کے پاس!
یہ ایک سیدھی سادی بات ہے۔ اگر آپ اس کا پہلا سبق سمجھ گئے
ہیں یعنی یہ سمجھ گئے ہیں کہ یہ ایک روحانی طاقت ہے جو چوبیس گھنٹے
کام کرتی رہتی ہے تو وہ ہمارے گھر میں بھی کام کرے گی، محلے میں بھی،
دشمن کے ساتھ۔ دوست کے ساتھ اسے سب جگہ کام کرنا ہی ہے
تعلیم تو آج آپ اپنے گھر ہی سے شروع کر سکتے ہیں۔ اپنی تعلیم میں نے پائی
ہے کہ مجھے دشمن پر کبھی غصہ نہیں آتا۔ مگر دوستوں کے ساتھ بیٹھتا ہوں
تو کبھی کبھی غصہ آجاتا ہے۔ مجھے جو طاقت اور تعلیم عدم تشدد
کی ملی وہ میرے گھر سے ہی ملی۔ اپنی بیوی سے ملی ہیں ظالم تھا۔ گو یہ
میرا ظلم محبت کا ظلم تھا۔ میں اس بے چاری پر کافی غصہ کر لیتا تھا۔ مگر
وہ سب برداشت کر لیتی تھی مجھے یہ خیال ہو گیا تھا کہ میری بات ماننا
اس کا فرض ہے۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ کون سا قاعدہ ہے
اگر مجھے بات منوانی ہے تو دھیرج سے سمجھانا چاہیئے۔ اس طرح میں
نے اس سے عدم تشدد سیکھا۔ اور کسی نے میرا اتنا ساتھ نہیں دیا،
جتنا اس عورت نے۔ شاید ہی کسی بیوی نے خاوند کا اتنا ساتھ دیا

ہو گا۔ میں نے اس کا ناک میں دم کر دیا۔ آج ایک گھر بلا، کل دوسرا! آج ایک کپڑا پہننے کا حکم صادر کیا۔ کل دوسرے کا۔ وہ اس گھر میں پلی بڑھی تھی۔ جہاں چھوت چھات کے رسم و رواج ملنے جاتے تھے۔ میرے گھر میں مسلمان سے لے کر بھنگی تک سب آتے تھے۔ میں نے ان سب کی خدمت اس سے کروائی۔ یہ بات اُسے پسند نہ تھی۔ مگر اس نے کبھی چوں تک نہ کی۔ وہ کچھ بہت پڑھی لکھی تو ہے نہیں۔ بھولی بھالی سیدھی سادی ہے، مگر اس کے اس بھولے اور سیدھے پن نے مجھے مطیع کر لیا۔ آپ کے گھر میں بھی ماں بہن ہیں۔ بیوی ہے۔ لڑکیاں ہیں۔ ان سے آپ ہمیشہ عدم تشدد کی تعلیم لے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کو سچائی پر قائم رہنے کا حلف بھی اُٹھانا ہے۔ آپ اپنے دل سے پوچھیے کہ آپ کو سچائی سے کتنی محبت ہے۔ اور کیا آپ اس کا پورا پورا حق ادا کرتے ہیں؟ جو سچا نہیں وہ عدم تشدد کو کیا سمجھے گا۔ جھوٹ تو خود تشدد ہے۔

ابھی رمضان کا مہینہ شروع ہونے والا ہے۔ رمضان کا مطلب ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ محض روزہ رکھنا اور کھانا پینا چھوڑ دینا ہی کافی ہے۔ اور بات بات پر غصہ کرتے اور گالی دیتے ہیں۔ روزہ کھولنے کے وقت بے چاری بیوی سے تیاری میں اگر ایک منٹ کی دیر ہو جائے، تو اس کی شامت بلانے میں کوئی ہرج نہیں۔ لیکن یہ رمضان کا احترام نہ ہوا۔ اگر آپ عدم تشدد

کی تعلیم سچ مچ لینا چاہتے ہیں۔ تو اس رمضان کے موقع پر عہد کرلیں کہ کچھ بھی ہو کبھی کسی پر غصّہ نہ کریں گے۔ گھروالوں پر حکم نہ چلائیں گے۔ اپنی بادشاہت نہ جتائیں گے۔ اور اس طرح چھوٹی چھوٹی چیزوں میں آپ خود عدم تشدد کا سبق سیکھ سکتے ہیں۔ اپنے بچوں کو سکھا سکتے ہیں۔ فرض کیجئے کھیل میں آپ کے بچے کو کوئی پتھر مارے۔ عام طور پر تو پٹھان اپنے بچوں کو یہ سمجھاتے ہیں کہ مار کھاکر گھر نہ آنا۔ کوئی پتھر مارے تو جواب میں اسے اور بڑا پتھر مارنا۔ لیکن اگر آپ کو اور آپ کے بچے کو دوسرا طریقہ یعنی عدم تشدد کا طریقہ سیکھنا ہے۔ تو یہ نہیں ہوگا آپ اسے سمجھائیں گے کہ تمھیں پتھر کا جواب اس سے بڑا پتھر پھینک کر نہیں دینا ہے بلکہ تم جاکر اسے گلے سے لگالو۔ اپنا دوست بنالو۔ عدم تشدد کے ذریعے ہندوستان کو آزاد کرانے کا یہی طریقہ ہے کہ ہم غصّے کو بالکل دل سے نکال دیں اور سب کو دوست بنالیں یہ آزادی حاصل کرنے کا سیدھا سادہ اور آسان ترین راستہ ہے۔ اور میرا یہ دعوےٰ ہے کہ ہندوستان کی غریب رعایا کے لئے آزادی حاصل کرنے کا اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں۔

دسواں باب

بنّوں

اسی میل کا سفر موٹر سے طے کرنے کے بعد گاندھی جی بنوں پہنچے
وہاں گاندھی جی کو شہریوں کی طرف سے سپاسنامہ پیش کیا گیا۔
عام جلسے میں گاندھی جی نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔
"شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ قریب دو ماہ سے میں پورے چوبیں گھنٹے
خاموش رہتا ہوں، خاموشی سے مجھے بہت فائدہ ہی ہوا ہے، اور
میرا خیال ہے کہ اس سے ملک کو بھی فائدہ ہی ہوا ہے۔ جب پہلے میں
نے خاموشی اختیار کی تو اس کی وجہ میری ایک خاص پریشانی تھی۔
بعد میں میں نے دیکھا کہ خاموش رہ کر میں زیادہ کام کر سکتا ہوں۔ میں
ارادہ کر کے آیا تھا کہ اس صوبے میں صرف خدائی خدمت گاروں کے
ساتھ بات چیت کرنے کے لئے ہی خاموشی چھوڑ دوں گا مگر بادشاہ خان
نے مجھے مجبور کیا، اور مجھے اپنا ارادہ چھوڑنا پڑا۔
آپ نے اپنے ایڈریس میں میری تعریف کی ہے۔ میں اپنے

کو اس تعریف کے لائق نہیں سمجھتا۔ میں جانتا ہوں کہ میں آپ کی امیدوں کو بہت کم ہی پورا کر سکوں گا۔ میں نے تو اس دورے کو آخر تک ٹالنے کی کوشش کی۔ مجھے ایک جگہ بیٹھ کر جتنی ممکن ہو اتنی خدمت کرنا اچھا لگتا ہے۔ مگر میری یہ خواہش کہ خود خدائی خدمتگاروں سے مل کر میں دیکھوں کہ انھوں نے عدم تشدد کو کہاں تک سمجھا ہے مجھے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ میری بنوں میں آمد تو اتفاقیہ ہی سمجھنی چاہیے۔ آپ نے اپنے ایڈریس میں مجھے تھوڑا سا یہاں کا حال سنایا ہے۔ میں نے آج کئی گھنٹے مختلف وفدوں کے ساتھ بات چیت میں اور جو مسودے اور کاغذات میرے پاس پہنچے ہیں انھیں پڑھنے میں صرف کئے ہیں۔ میں آپ کی حالت سمجھ گیا ہوں، اور مجھے اس سے بہت قلق ہوا۔ سرحدی صوبہ دوسرے صوبوں سے کچھ مختلف ہے۔ اس کے قریب بہت سے چھوٹے چھوٹے قبیلے رہتے ہیں۔ ان میں ایسے لوگ ہیں جن کا پیشہ ہی ڈاکہ ڈالنا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس میں ہندو مسلمان کا کوئی سوال نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوؤں پر اکثر زیادتی ہو جاتی ہے۔ مگر فرقہ پرستی کی وجہ سے نہیں۔ ڈاکوؤں کا اصلی مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس طرح اپنی روزی کمائیں۔ مگر اوروں کی نسبت اکثر ہندو ہی ان کا شکار ہوتے ہیں، کیونکہ وہ زیادہ مالدار ہیں۔ عورتوں کو اٹھالے جانے کا سبب بھی زیادہ تر روپے کا لالچ ہوتا ہے۔

میری رائے میں ان ڈاکوؤں کی روک تھام نہ ہوسکنا اس بات کا نمایاں ثبوت ہے کہ ہندوستان کے اس حصے میں انگریزی حکومت ناکامیاب رہی ہے۔ میرے دل سے سرکار کی شکایت نکلتی ہے کہ اس نے کروڑوں روپے سرحدی پالیسی پر خرچ کر ڈالے ہیں اور ہزاروں جانیں قربان کر ڈالیں۔ سرکار نے سمجھا تھا کہ اس طرح طاقت کے استعمال سے سرحد پار کی دلاور قومیں ہمارے تابع ہوجائیں گی۔ مگر انھیں معلوم ہوا ہوگا کہ تلوار کے دھنی اس طرح قابو میں نہیں آتے۔ اگر جتنی اطلاعات میرے پاس پہنچی ہیں نہ صحیح ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ ضرور ہیں، تو ماننا پڑے گا کہ اس صوبے کے اکثر حصوں میں آج لوگوں کا جان و مال محفوظ نہیں ہے۔ آج کئی آدمی جن کے عزیز یا رشتے دار یا تو جان سے مارے گئے ہیں یا ان کو ڈاکو "رقم رہائی" حاصل کرنے کی لالچ سے اٹھا کر لے گئے ہیں وہ مجھ سے ملے۔ میں نے ان کی ساری دکھ بھری کہانی سنی۔ اس کا مجھ پر گہرا اثر ہوا ہے۔ مگر جو بھائی میرے پاس آئے تھے، مجھے ان سے افسوس کے ساتھ کہنا پڑا کہ میرے پاس کوئی ایسا جادو نہیں ہے کہ ڈاکو جن لوگوں کو اٹھا لے گئے ہیں میں ان کو واپس دلادوں اور نہ سرکار یا کانگرسی وزارت سے اس میں کچھ زیادہ مدد کی امید کی جاسکتی ہے۔ مجھے تو سرکار ان لوگوں کے پاس سرحد پار جانے بھی نہ دے گی۔ ورنہ میرا جی تو چاہتا ہے کہ ان کے پاس جاکر

قیام کروں اور جیسے میں ہمیشہ کرتا آیا ہوں۔ انھیں سمجھانے کی اور ان کا دل پگھلانے کی کوشش کروں۔ مگر میرے لئے یہ راستہ بند ہے اور سرکار اس کی قائل ہی نہیں۔ آپ یہ مت سمجھئے کہ کوئی حکومت بھی اپنی رعایا کے ایک ایک شخص کی حفاظت فوج کے ذریعے سے کرسکتی ہے۔ ایسی کوئی ریاست آج تک دنیا میں پیدا نہیں ہوئی۔ اور انگریز سرکار سے تو یہ اُمید رکھنا ہی فضول ہے۔ وہ اس کے لئے کسی طرح آمادہ نہیں۔ ہاں کسی انگریز مرد عورت کی جان جاتی رہے یا خطرے میں پڑ جائے تو دوسری بات ہے۔ تب وہ یقیناً اپنے دعوے کے مطابق ساری سلطنت کی قوت کے ساتھ پل پڑے گی۔ سب حالات جاننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کانگریس وزارت کے آنے کے بعد اس صوبے میں قبائلی ڈاکوؤں کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو گئی ہے۔ ہمارے وزیروں کو پولیس پر کامل اختیار نہیں کہ اس کی پوری پوری مدد انھیں مل سکے۔ اور محکمہ فوج پر تو بالکل ہی کوئی اختیار نہیں جتنا دوسرے صوبوں میں ہے اتنا بھی نہیں۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ اگر ڈاکٹر خاں صاحب ان ڈکیتیوں کی روک تھام نہیں کرسکتے تو ان کا وزارت سے استعفیٰ دے دینا بہتر ہوگا۔ کیونکہ اگر ڈکیتیاں اس طرح سے جاری رہیں اور زور پکڑتی گئیں تو کانگریس کا سارا وقار ختم ہو جائے گا۔ مگر سوال صرف میری رائے کا

نہیں۔ یہ تو آپ کے طے کرنے کی بات ہے۔ آپ جب چاہیں ان سے وزارت کو چھڑوا سکتے ہیں۔ آخر ڈاکٹر خاں صاحب آپ کے خدمتگار ہیں۔ ورکنگ کمیٹی۔ صوبہ کانگریس کمیٹی اور جن ورکروں کی ہدایت سے انھوں نے وزارت بنائی وہ ان کے ماتحت ہیں۔ بہرحال یہ فیصلہ آپ لوگوں کو کرنا ہے کہ میں نے جن دقتوں کا ذکر کیا ہے ان کے باوجود بھی کانگریس کی وزارت رہے یا کوئی دوسری وزارت اس کی جگہ پر آجائے۔

آج مجھے جو لوگ ملے، ان میں سے کئی نے پوچھا کہ ہم جان و مال کی سلامتی کی خاطر صوبہ سرحد سے ہجرت کر کے کہیں اور جا سکتے ہیں۔ میں نے اُن سے کہا ہے کہ اگر وہ کسی طرح سے بھی یہاں امن سے نہ رہ سکیں۔ یا اپنے ننگ و ناموس کی حفاظت نہ کر سکیں تو کسی دوسری جگہ چلے جانا ہی مناسب ہے اور اس کا انھیں پورا پورا حق ہے۔ میرے پاس ایک یہ شکایت بھی پہنچی ہے کہ جب سے صوبہ سرحد سے انسداد جرائم ایکٹ منسوخ ہوا ہے جن مقامات پر ڈاکے پڑتے ہیں وہاں کی مسلمان آبادی نے ڈاکوؤں کی روک تھام میں پہلے کی طرح مدد دینی چھوڑ دی ہے۔ ممکن ہے یہ سچ ہو۔ مگر میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر آپ اپنی حفاظت کا دارومدار کسی دوسروں کی مسلح طاقت پر رکھیں گے تو ایک دن آپ کو اسی مسلح طاقت کا محکوم ہو کر رہنا ہوگا۔ آپ خود اپنی

حفاظت کرنا سیکھیئے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو آپس میں تعاون کرنے کی مشق ہونی چاہیئے ۔ بہر حال آپ کسی صورت میں بھی بزدل نہ بنیں ۔ اپنی حفاظت ہر شخص کا پیدائشی حق ہے ۔ میں نہیں چاہتا کہ اس ملک میں ایک شخص بھی نامرد نظر آئے ۔

چوتھا اور آخری راستہ عدم تشدد کا ہے جو میں آج آپ کے سامنے پیش کرنے کو حاضر ہوا ہوں ۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ اپنی حفاظت کی اس سے بڑھ کر یقینی اور حکمی تدبیر اور کوئی نہیں ۔ اگر میرا بس چلے تو میں آج ہی سرحد پار کے قبیلے والوں کے پاس چلا جاؤں ان کو محبت کے ساتھ سمجھاؤں بجھاؤں ۔ ان کی تکلیفوں کو سمجھوں ان کی عادتیں بدلنے کے لیئے جو تعلیم یا مدد چاہیئے وہ دوں ۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے اس طرح سمجھانے بجھانے کا اور ہماری محبت کا اثر ان کے دل و دماغ پر ہوئے بغیر نہ رہے گا ۔

ڈاکوؤں کو روپیہ ادا کر کے جان چھڑانا سخت غلطی ہے ۔ یہ تو ان کو بار بار ڈاکے ڈالنے کا راستہ دکھانا ہے ۔ یہ تو ہمارے اور ان ڈاکوؤں دونوں کے لیئے ذلت کا باعث ہے ۔ زیادہ عقل مندی کا راستہ یہ ہوگا کہ ہم انھیں رشوت دینے کے بجائے ان کو دستکاری اور صنعت سکھا کر ان کا افلاس دور کریں اور ایمانداری سے روزی کمانے کا راستہ ان کے لیئے کھول دیں ۔ تاکہ وہ ڈاکہ زنی پر مجبور نہ ہوں ۔

میری آج کل خدائی خدمت گاروں کے ساتھ بات چیت ہو رہی ہے۔ بادشاہ خاں کے ساتھ مل کر میں ایک تجویز تیار کر رہا ہوں۔ اگر میری کوشش کامیاب ہوئی اور خدائی خدمت گار جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہوتا ہے سچ مچ خدمت کرنے والے بن گئے تو ان کے طرز عمل کا اثر پھولوں کی مہک کی طرح دور دور پھیل جائے گا۔ اور خود بخود سرحد کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے ہو جائے گا۔

بنوں سے روانہ ہونے سے پہلے گاندھی جی اس جگہ کو دیکھنے کے لئے گئے جہاں ابھی حال میں چھاپہ مارا گیا تھا۔ اس تھوڑی سی دیر میں کئی باتیں ان کے علم میں لائی گئیں جو قابل ذکر ہیں، لیکن چونکہ ورکنگ کمیٹی کی ہدایت کے مطابق آصف علی صاحب ان واقعات کی تحقیقات کر رہے ہیں اس لئے میں انھیں چھوڑتا ہوں۔ البتہ میں نے خود جو کچھ دیکھا اور سنا وہ لکھے دیتا ہوں۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ اگر مقامی افسر چاہتے تو یہ چھاپہ روکا جا سکتا تھا۔ انھیں اطلاع مل چکی تھی کہ چھاپہ مارا جائے گا۔ چھاپہ مارنے والے قریب قریب سارے وقت نظروں کے سامنے رہے۔ پھر یہ واقعہ کیوں ہونے دیا گیا؟ یہ ایک معمہ ہے جسے اگر سرکاری کمیٹی نہیں تو آصف علی صاحب ضرور حل کریں گے۔

پڑھنے والوں کو اس کا اندازہ ہونا چاہیئے کہ جس جگہ چھاپہ مارا گیا اس کا محل وقوع کیا ہے۔ یہ زرخیز اور خوش منظر میدان جسے

ٹرم اند کمبیلا دریا سیراب کرتے ہیں، ایک گوناگوں اور دردناک تاریخ رکھتا ہے۔ اس کے شمال میں ضلع کوہاٹ کے بے آب و گیاہ پہاڑوں کا سلسلہ جو سالٹ رینج (SAITRAN) کہلاتا ہے، واقع ہے اور جنوب میں ڈیرہ اسمٰعیل خاں کا ریتیلا میدان ہے اور مغرب اور شمال مغرب میں وزیرستان کی بھیانک پہاڑیاں ہیں جہاں زندگی نام ہے ایک دائمی کشمکش کا نہ صرف انسان اور فطرت میں، بلکہ انسان اور انسان میں بھی، ایسے ماحول میں قدرتی طور پر یہ اپنے تند خو سرحدی ہمسایوں کے حملوں کی جولاں گاہ بن گیا اس کی ابتدائی تاریخ جس کا اندازہ آپ کو ذیل کی عبارت سے ہوگا جو تھا۔ ربرن کی کتاب سے لی گئی ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ یہ انسان انسان کے بیچ نہیں بلکہ چیلوں اور دوسرے شکاری جانوروں کے بیچ لڑائی کی خوفناک کیفیت آنکھ کے سامنے گذر رہی ہے۔ اس بات سے شاہ فرید (جو شیتک بھی کہلاتے تھے) کی اولاد کو بڑی خوشی ہوئی، اس لئے کہ ان لوگوں کو وزیری قبیلے کے لوگوں نے بہت تنگ کر رکھا تھا۔ یہ لوگ کمر کس کر تیار ہو گئے ان کے ساتھ اُن کے بیوی بچے بھی پہاڑ سے اُتر آئے اور وہ ٹوچی کے دہانے پر خیمہ زن ہوئے۔ اس کے بعد ان کے سردار جمع ہوئے، اور انھوں نے کہا " ہم لوگ منگلوں اور ہانیوں کے پاس تین کبوتر بھیجتے ہیں جس سے ان کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے ہاتھوں

ان کا کیا حشر ہونے والا ہے"۔ اس کے بعد انھوں نے تین کبوتر لئے۔ پہلے کو صحیح سلامت رہنے دیا۔ دوسرے کے پنکھ اکھاڑ لئے اور تیسرے کا ایک ایک پر نوچا، اور سر اور پیر کاٹ لیے۔ انھوں نے یہ کبوتر ایک قاصد کے ساتھ منگلوں اور ہانیوں کے سرداروں کے پاس اس پیام کے ساتھ بھیجے کہ اللہ تعالےٰ تم سے ناراض ہے اس لئے کہ تم نے پیر صاحب کے ساتھ بے ادبی کی اور اس نے تم کو ہمارے سپرد کر دیا۔ اگر تم بھاگ گئے تو پہلے کبوتر کی طرح صحیح سلامت رہو گے اگر یہاں ٹھہرے رہے تو دوسرے کبوتر کا سا حال ہو گا اور اگر تم نے ہمارا مقابلہ کیا تو وہ حشر ہو گا جو تیسرے کبوتر کا ہوا۔ اس سے منگل اور ہانی ڈر گئے، اور واقعی ان کے ساتھ وہی ہوا جو کبوتروں کے ساتھ ہوا تھا"۔

عہدِ وسطیٰ میں یہ جگہ ان بدیشی فوجوں کی آرام گاہ کا کام دیتی تھی جو غزنی سے ہندوستان کی طرف جاتے ہوئے یہاں سے گذرتی تھیں۔ اور حملہ آور فوجوں کے ساتھ جو علیق یعنی رنڈی بھڑوے ہتھک گوتے وغیرہ رہا کرتے ہیں۔ انھوں نے اس کو اپنا مرکز بنا لیا۔ ان لوگوں کی روایات ابھی تک چلی جاتی ہیں۔ تاریخ کے اس پس منظر کا سرحدی علاقے کے چھاپوں اور اغوا کی وارداتوں کے متعلق بحث کرتے ہوئے ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے:

تشدد اور عدم تشدد کی طاقت کا مقابلہ۔ پہلی دشمن کو ختم کر دیتی

ہے اور دوسری اس کو دوست بناتی ہے، اس لئے وہ بڑی ہے۔
تعمیری پروگرام اس کا ظاہری یا سماجی روپ ہے جیسے کہ چرخہ، چھوت
چھات کو مٹانے۔ شراب اور دوسری قومی اثمات پیدا کرنے کی تحریک
یہ سب چیزیں عارضی، سیاسی مصلحت کے طور پر نہیں ہونی چاہئیں
بلکہ عدم تشدد کے سانچے میں ڈھل جانی چاہئیں۔

۲۵ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کو بنوں میں خدائی خدمت گار افسروں کے
ساتھ گاندھی جی کی اہم بات چیت ہوئی، گاندھی جی نے کہا:
میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر عدم تشدد پر قائم رہنا
چاہتے ہیں تو اس میں کون سی چیزیں ہیں جنھیں سمجھنا آپ کے لیے
ضروری ہے۔ عدم تشدد کی تحریک جب یہاں شروع ہوئی تھی، تو
لاکھوں لوگوں نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ سرکار کا مقابلہ ہم تلوار سے
نہ کر سکیں گے۔ کیونکہ سرکار کی طاقت ہماری تلوار کی طاقت سے بہت
بڑی ہے۔ ہم جب تلوار لے کر نکلتے ہیں تب بھی مرنے کی تیاری
کر کے ہی جاتے ہیں۔ تلوار ہاتھ میں ٹوٹ جائے گی تو موت تو
سامنے کھڑی ہی ہے۔ پھر ہم بغیر تلوار کے مرنے کا علم سیکھ کر باہر
کیوں نہ نکلیں۔ سرکار ہمیں مارنا چاہتی ہے۔ مارے، قید کرنا چاہتی
ہے تو قید کرے۔ ہماری جائداد ضبط کرنا ہے تو کرے۔ مگر اکثر لوگوں کے
دل میں یہ خیال ہے کہ اگر ان کے پاس تلوار کی کافی طاقت ہو تو وہ
تلوار سے بھی لڑیں گے۔ آج عدم تشدد سے کام لیتے ہیں کیونکہ

اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دل میں تو تشدد موجود ہے۔ بظاہر اسے ترک کر دیا ہے۔ اس سے ہماری قوت بڑھی تو سہی مگر ہمارا عدم تشدد بہادر آدمی کا نہ تھا کمزور کا تھا۔ جو لوگ عدم تشدد کو اس طرح سے اختیار کرتے ہیں۔ اور عدم تشدد کو کمزور کی طاقت سمجھتے ہیں۔ انھوں نے بڑی بھاری غلطی کی ہے۔ اگر آپ ایک لاکھ خدائی خدمت گار بھی یہی غلطی کریں تو یہ بڑی بُری بات ہوگی۔ اگر آپ نے بادشاہ خاں کے کہنے پر بظاہر تو تلوار کو چھوڑ دیا۔ مگر دل میں تشدد بھرا رہا تو آپ کا عدم تشدد زیادہ دیر تک قائم رہنے والا نہیں۔ دو چار سال بعد آپ پھر تلوار پکڑنا چاہیں گے۔ اور اس وقت عادت چھٹ جانے کی وجہ سے آپ کو دقت پیش آئے گی، اور آپ نہ اِدھر کے رہیں گے، نہ اُدھر کے۔ خواہ مخواہ بعد میں پچھتائیں گے اور یہ بادشاہ خاں کے میرے اور آپ کے لئے باعثِ شرم ہوگا۔ آپ لوگ کمزور اور بزدل بن جائیں گے۔ یہ ہم نہیں چاہتے۔ میں جو چیز چاہتا ہوں وہ تو سب سے انوکھی ہے۔ یعنی یہ کہ ہم لوگ اگر تلوار چلا بھی سکتے ہوں اور ہماری فتح ہونے میں کوئی شک نہ ہو تو بھی ہم دشمن پر تلوار نہ چلائیں گے۔ اور مخالف کے پاس ایک ٹوٹی سی تلوار ہو، تب بھی اُسے ہم اپنے گلے پر چلانے دیں۔ دل میں غصہ تک نہ لائیں۔ اور یہی نہیں بلکہ محبت سے اس کو اپنے دل میں

جگہ بھی دیں۔ اگر آپ واقعی عدم تشدد کو اسی طرح سمجھ گئے ہیں تو آپ کے لئے یہ سوال آسان ہو جاتا ہے کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ جو شخص سمجھ گیا ہے کہ عدم تشدد کی روحانی طاقت تلوار سے بڑھ کر ہے جو محض جسمانی طاقت ہے۔ تو وہ کسی پر تلوار چلانا ہی نہیں چاہے گا۔ نہ غصہ کرے گا۔ چوبیس گھنٹے خدمت ہی میں لگا رہے گا اور اس کا یہی فرض ہے۔ خدا کی خدمت صرف اس کی مخلوق کی خدمت سے ہی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ خود خدا کو نہ تو حاجت ہے اور نہ کسی شخص کی خدمت کی ضرورت ہے۔ آپ بنوں میں رہتے ہیں تو آپ کو چاہیے کہ بنوں کے لوگوں کی خدمت کریں۔ وہ گندے رہتے ہیں تو ان کو صفائی سکھائیں۔ صفائی کرنے میں انھیں مدد دیں۔ وہ بیمار ہیں تو ان کی دوا دارو کریں۔ ان کی تیمارداری کریں۔ اگر وہ بے کار ہیں تو ان کی بے کاری مٹائیں۔ اس طرح جتنی ہم خدمت اور محبت کریں گے۔ اتنی ہی ہماری طاقت بھی بڑھے گی۔

آپ پوچھیں گے کہ یہ سب کام کرنے سے انگریزی حکومت پر کیا اثر پڑے گا۔ میرا کہنا یہ ہے کہ ہر خدمت کر کے ہندوستان کے سب لوگوں کو محبت کے رشتے میں باندھ کر ملک میں ایک نئی فضا پیدا کر سکتے ہیں اور انگریزوں کو بھی اس محبت کی تلوار سے گھائل کر سکتے ہیں۔ آپ کہیں گے انگریزوں پر محبت کی جگب کا اثر نہیں ہوگا۔ میرا اتیس سال کا تجربہ اس کے برعکس ہے۔

جنوبی افریقہ میں ایسی ہی محبت کی جنگ ہوئی تھی اور وہی انگریز جو شروع میں ہمارے سخت دشمن تھے، آخر میں ہمارے دوست بن گئے

یہاں ستر ہزار انگریز ہم تیس کروڑ لوگوں پر حکمراں ہیں۔ کیونکہ ہمارے دل پر اُن کا رعب بیٹھ گیا ہے۔ اگر ہم تیس کروڑ لوگ آپس میں اس طرح محبت سے رہنے لگیں کہ ہندو اور مسلمان چھوت اور اچھوت، لکھپتی اور بھکاری کے درمیان تفرقہ مٹ جائے تو مٹھی بھر انگریزی فوج کی مجال نہیں کہ ہم پر حکمراں رہ سکے۔

جس طرح تشدد کے جنگ میں کچھ قانون و قواعد ہوتے ہیں۔ اسی طرح عدم تشدد کے جنگ میں بھی ہوتے ہیں۔ دنیا آج صرف تشدد کی جنگ کے آداب سے واقف ہے۔ تشدد برائی کرنے والے کو سزا دیتا ہے۔ عدم تشدد برائی کرنے والے کو، شرابی اور چور کو محبت سے سمجھا کر سُدھارتا ہے۔

اگر انگریزی حکومت کو عدم تشدد کے ذریعے ہٹانا ہے تو ہمیں کیا کرنا ہوگا؟ تشدد سے کام کرنے کے لئے آپ لوگوں کو قواعد کرنی ہوگی۔ تلوار اور بندوق کا فن سیکھنا ہوگا۔ مگر تلوار کی تو اب کوئی قدر و قیمت ہی نہیں رہی۔ بندوق کی تھوڑی سی ہے۔ لیکن چند سال میں وہ بھی نہیں رہے گی۔ اب تو پہاڑ کی چوٹی پر سے ہوائی جہازوں کے ذریعے بمب پھینک کر دوسرے کو فنا کر سکتے ہیں۔ زہریلی گیس چھوڑ کر تباہ کر سکتے ہیں۔ ولایت میں

میں پر تعلیم عورتوں اور بچوں تک کو دی جا رہی ہے۔ اسی طرح جنھوں نے عدم تشدد کی سائنس کو اختیار کر رکھا ہے انھیں اس کے قانون اور قواعد کے مطابق اپنی ساری زندگی بنانی ہوگی۔ ورنہ یہ چیز ان کے دلوں کے اندر گھر نہیں کر سکتی۔

عدم تشدد کی لڑائی کا عملی پروگرام میں نے سنہ ۱۹۲۰ء میں ملک کے سامنے رکھا تھا۔ وہ آج بھی کانگریس کے سامنے ہے۔ اس میں ایک حصہ پُرامن عدم تعاون کا اور دوسرا تعمیری کام کرنے کا ہے یعنی قومی اتحاد پیدا کرنا، چھوت چھات کو دور کرنا۔ شراب اور دوسری نشی چیزوں کو چھوڑنا۔ کھادی اور چرخے وغیرہ کو اپنانا مگر یہ سب چیزیں ایک سیاسی چال کے طور پر نہیں بلکہ عدم تشدد کے ڈھانچے میں ڈھال کر کرنی ہیں مثلاً بطور ایک عارضی سیاسی مصلحت کے ہندو مسلم اتحاد ایک چیز ہے مگر عدم تشدد کے سانچے میں ایسے ڈھالنا چاہیے کہ دل اس طرح مل جائیں کہ کبھی الگ ہی نہ ہوں۔ تب یہ ایک دوسری ہی چیز بن جائے گی۔ پہلی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے صرف چند روز تک چل سکتی ہے اس میں دھوکا ہو سکتا ہے، چالاکی ہو سکتی ہے۔ مگر دوسری میں صرف محبت ہی محبت ہے۔

چرخے کو میں نے اتنی اہمیت دی مگر اس کو بھی اس عدم تشدد کے سانچے میں ڈھالنا ہے۔ ہندوستان میں آج کروڑوں آدمی بے کار پڑے ہیں، یا تو ہم ان کو مر جانے دیں تاکہ جو تھوڑے سے

باقی بچیں ان میں سے ہر ایک کے حصے میں کچھ زیادہ زمین آئے جیسے کہ جنوب افریقہ میں ہوا۔ مگر یہ تشدد کا راستہ ہے۔ عدم تشدد پر چلنے والا انسان تو خدا کی ساری مخلوق کی یکساں خدمت کرنا چاہے گا اس کا دل یہی کہے گا کہ جو چیز غریب سے غریب آدمی کو نہیں مل سکتی وہ مجھے بھی نہیں چاہیئے۔ وہ لوگ جو مشقت کرتے ہیں وہ اس میں بھی شامل ہوں گے چرخے کی دریافت اسی خیال کے ماتحت ہوئی۔ جب میں نے ہند سوراج میں چرخے کا نسخہ پیش کیا تب میں نے چرخہ دیکھا بھی نہ تھا۔ اسے جانتا بھی نہ تھا۔ میرے سامنے تو ان غریبوں کا تصور تھا جو افلاس کے بوجھ سے دب گئے ہیں اور بغیر زمین کے بے کار اور بغیر کھانے کے بھوکے بیٹھے ہیں۔ ان کو میں کیسے بچاؤں؟ یہ سوال میرے سامنے تھا۔ میں اس وقت یہاں اس محل میں بیٹھا ہوں، لیکن اگر میرا دل اس میں پھنس جائے تو عدم تشدد کے ایک پیروکار کی حیثیت سے تو میرا خاتمہ ہی ہو جائے۔

لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ یہاں میں مجبوراً بیٹھا ہوں۔ میرا جسم یہاں ہے مگر میرا دل غریبوں کی جھونپڑیوں میں پڑا ہے۔ اگر کسی جھونپڑی میں مجھے بیٹھنا نصیب ہو تو مجھے زیادہ اچھا لگے گا۔ ہم تو غریبوں میں مل جل کر رہنا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سی چیز ہے جو ہم کو غریبوں سے ملا سکتی ہے۔ اس کا جواب ہے چرخہ! اسی طرح اگر میں ایک ڈاکٹر ہوں تو بھی میری آنکھوں

کے سامنے غریب لوگوں کی تصویر ہی ہوگی۔ ان کی مصیبت کیسے کٹے۔ اس کی مجھے فکر ہوگی۔ ایک راجہ کو کیسے اچھا کروں۔ اس کا چنداں خیال نہ ہوگا۔

چرخہ میری ایجاد نہیں۔ وہ تو ہمارے بزرگوں کے زمانے میں بھی چلتا تھا مگر چرخے کو عدم تشدد کے ساتھ جوڑنا میری ایجاد ہے۔ خدا نے میرے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ اگر تو عدم تشدد سے کام لینا چاہتا ہے تو تجھے چھوٹی سے چھوٹی، حقیر سے حقیر چیز سے کام لینا ہوگا۔ بڑی بڑی چیزوں سے نہیں۔ اگر تعمیری پروگرام کی چاروں چیزوں پر ہم جیسے چاہیئے ویسے ہی بیس سال سے عمل کرتے آتے تو آج ہم اپنے ملک کے مالک خود ہوتے۔ انگریز، جاپانی یا کوئی دوسرا ہندوستان کو چھو نہ سکتا۔ اور اگر کوئی یہاں آ جاتا بھی تو یہاں سے کچھ نہ لے جا سکتا۔ آخرکار خفیہ سی محبت سے ہم میں مل جاتا اگر ہندوستان کے تیس کروڑ لوگوں میں ہمارا دشمن ہی نہ نکلے تو کیا باہر سے خدا ہمیں دشمن بھیجے گا اور اگر کوئی دشمن بن کر آئے گا بھی تو ہمارا عدم تشدد اسے دوست بنا لے گا

ایسے ہی عدم تشدد کی میں آپ سے امید رکھتا ہوں۔ سچے عدم تشدد کی میرے دل میں قدر ہے اگر آپ لوگ سچے عدم تشدد کو مان لیں۔ اس پر عمل کرنے لگیں تو ساری دنیا کی راہ نمائی کر سکتے ہیں۔ اس لئے میں آپ لوگوں کی تعریف کرتا ہوں۔ میں

دوسری بار یہاں آیا ہوں ۔ اور مجھے امید ہے کہ یہ آخری بار نہ ہو۔ اگر آپ چاہیں تو مجھے دھوکہ بھی دے سکتے ہیں میرے ساتھ عدم تشدد پر کاربند رہنے کے قول و قرار کے بعد باہر جا کر کسی کو لاٹھی بھی مار سکتے ہیں ۔ اگر ایسا ہو تو آپ کے اور میرے درمیان عدم تشدد کا جو عہد ہوا ہے وہ الٹا بیکار ہو گا ۔ لیکن اگر آپ مجھے اور اپنے آپ کو دھوکا نہیں دے رہے تو آپ کو اپنے چال چلن سے سب پر ثابت کر دینا ہو گا کہ سرخ پوشوں سے کسی کو ڈرنے کی مطلق ضرورت نہیں ، اور نہ اُن کی موجودگی میں کسی اور سے ڈرنے کی ضرورت ہے ۔

گیارھواں باب

تشدد اور روحانیت

بنوں کے خوش منظر میدان کے بالکل برعکس مروت کی تحصیل ہے۔ یہ ایک بہت بڑا ریتیلا میدان ہے جو گیارہ سو اٹھاونے مربع میل میں پھیلا ہوا ہے، اور اس کا صدر مقام لکی کہلاتا ہے۔ گاندھی جی گذشتہ مہینے کی چھبیس تاریخ کو انتالیس میل موٹر کا سفر کرکے یہاں پہنچے تھے۔ لکی کے پروگرام میں ایک دلچسپ چیز وہ خٹک ناچ تھا جو بادشاہ خاں نے خاص طور پر گاندھی جی کے لئے کرایا تھا۔ خٹک ناچ جیسا کہ اس کے نام سے (خٹک سنسکرت لفظ کھٹوگ سے نکلا ہے، جس کے معنی تلوار کے ہیں۔) ظاہر ہے شمشیر زنی کے کرتبوں پر مبنی ہے اور خٹک قبیلے کے پٹھانوں میں بہت مقبول ہے، جن کا سلسلہ بنوں سے کوہاٹ ہوتا ہوا دریائے سندھ کے کنارے شمال میں اکارہ ضلع پشاور تک چلا گیا ہے۔ عوام کے فنون لطیفہ کے اور بہت سے نمونوں کی طرح یہ ناچ بھی مٹتا جارہا تھا لیکن

خدائی خدمت گاروں کی تحریک نے جو پٹھانوں کی پرانی تہذیب کے

پرانے عناصر کو نئے سرے سے زندہ کرنا چاہتی ہے، اسے بچا لیا۔ ان

متناسب حرکات میں ڈھولک اور سرنائی کی دلکش آواز کے ساتھ کی

جاتی ہیں۔ اس قدر سادگی اور زور تھا جو سننے والے کو مسحور کر لیتا تھا۔

اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی تھی کہ سب بچے اور بوڑھے جن میں کہیں

کہیں ایک آدھ ہندو بھی نظر آجاتا تھا۔ نہایت جوش کے ساتھ ناچ

میں حصہ لے رہے تھے خصوصاً ایک زندہ دل بوڑھے کے کرتب

نہایت دلچسپ تھے جو اس پرانے گیت کے الفاظ کی مجسم تصویر تھا

کیا خوب محفل ہے جہاں، لہرا رہی ہوں داڑھیاں ناچ کے چکروں کے

بیچ بیچ میں یہ بڑے میاں اپنی بگلے کے پر جیسی سفید داڑھی لیے

ہوئے ایسی بے ساختہ مضحک حرکتیں کرتے تھے کہ بے حس سے بے حس

آدمی بھی لوٹ پوٹ ہو جائے۔

رات کو ایک عام جلسہ ہوا جس کے اندر جا بجا توڑے دار بندوقوں

اور رائفلوں کا ایک جنگل سا نظر آتا تھا جس سے یہ بات صاف ظاہر

تھی کہ جو لوگ نہایت غور سے گاندھی جی کی تقریر عدم تشدد

پرسن رہے تھے وہ کوئی بودے لوگ نہ تھے۔ یہ اس تقریر کے لئے

جس کا موضوع "ترک اسلحہ کی قوت" تھا۔ نہایت ہی موزوں ماحول

تھا۔ گاندھی جی نے فرمایا: "میں عدم تشدد کا پچاس سال کا تجربہ

لئے ہوئے آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ ترک اسلحہ کی قوت بھی قوت

سے بلند جہاز زیادہ ہے۔ ایک مسلح سپاہی کی ساری طاقت اس کے ہتھیاروں پر موقوف ہے۔ اگر اس کی بندوق یا تلوار اس سے لے لی جائے تو عام طور پر وہ بالکل بے دست و پا ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن وہ شخص جس نے عدم تشدد کے اصول کو سچ مچ عملی جامہ پہنایا ہے ایک ایسی خداداد طاقت رکھتا ہے جس کی دنیا میں کوئی نظیر نہیں۔ انسان کبھی کبھی غفلت میں خدا کو بھول جاتا ہے، لیکن خدا ہمیشہ اس کی نگہبانی اور حفاظت کرتا ہے۔ اگر خدائی خدمت گاروں نے اس راز کو سمجھ لیا ہے۔ اگر ان پر یہ حقیقت ظاہر ہو گئی ہے کہ عدم تشدد دنیا میں سب سے بڑی طاقت ہے تو بہت اچھا ہے ورنہ بادشاہ خاں کے لئے یہ بہتر ہو گا کہ انھیں وہ ہتھیار واپس کر دیں جو ان لوگوں نے ان کے کہنے سے چھوڑ دئے ہیں۔ اس صورت میں وہ کم سے کم اس دنیا کی رسم کی مطابق جو بہیمی قوت کو پوجتی ہے بہادر کہلائیں گے۔ لیکن اگر وہ ایک طرف اپنے پرانے ہتھیاروں کو چھوڑ دیں، اور دوسری طرف عدم تشدد کی قوت سے بھی محروم رہیں تو یہ ایک ایسا افسوس ناک واقعہ ہو گا جس کے لئے میں تیار نہیں ہوں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے بادشاہ خاں بھی تیار نہیں ہیں۔"

گاندھی جی نے انھیں سمجھایا کہ اس تعمیری کام میں جو کسی سیاسی مصلحت سے لوگوں کی خدمت کے لئے کیا جائے اور اس تعمیری کام میں جو عدم تشدد کے ساتھ کیا جائے، کیا فرق ہوتا ہے۔ یہ

دوسری قسم کا کام ایک زبردست قوت ہے جو لوگوں کو آزادی کی دولت بخشتی ہے۔

ملکی مروت میں خدائی خدمت گار افسروں کے ساتھ گاندھی جی نے بات چیت کے دوران میں کہا:

"جوں جوں مجھے آپ سے واقفیت ہوتی جاتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے ہاں کے لوگ اتنے غریب اور سیدھے سادے اور صاف دل ہیں کہ جب ایک بار اُن کے دل میں کوئی بات بیٹھ جائے تو پھر آسانی سے نہیں مٹ سکتی، اور ان کو بات سمجھانا بھی کچھ مشکل نہیں۔

عدم تشدد کی تنظیم کے اصول اور قواعد ان اصول اور قواعد کے بالکل برعکس ہوتے ہیں جن پر تشدد کی تنظیم مبنی ہے۔ فوج میں افسر اور معمولی سپاہی میں اونچ نیچ کی تمیز کی جاتی ہے۔ افسر حاکم اور سپاہی محکوم ہوتا ہے۔ مگر آپ کا جرنیل سب سے بہتر اور سب سے زیادہ سیوا کرنے والا سیوک مانا جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو معمولی سے معمولی ماتحت سے بھی کسی طرح بڑا نہیں سمجھتا۔ آپ نے محبت سے خان صاحب کو بادشاہ خان کا لقب دے رکھا ہے۔ لیکن اگر وہ دل میں اپنے آپ کو سچ مچ بادشاہ سمجھنے لگیں اور انھیں یہ زعم ہو جائے کہ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں تو اُن کی سرداری ہی ختم ہو جائے۔ خان صاحب آپ کے بادشاہ اس لیے ہیں کہ خدمت کی جتنی لیاقت ان میں ہے اتنی اور کسی میں نہیں!

تشدد اور عدم تشدد کی تنظیم میں دوسرا فرق یہ ہے کہ فوج کے افسروں، جرنیل، کرنیل وغیرہ کو بادشاہ مقرر کرتا ہے۔ سپاہیوں کو ان کے چناؤ میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ سردار بن کے بیٹھ جاتے ہیں اور انھیں یہاں تک اختیار رہتا ہے کہ جسے چاہیں ماریں جسے چاہیں رکھیں۔ مگر یہاں بادشاہ خاں کو آپ نے خود بادشاہ بنایا ہے اور آپ جب چاہیں انھیں ہٹا بھی سکتے ہیں۔ پُرامن فوج میں سپاہی خود جرنیل اور افسروں کا چناؤ کرتے ہیں، اور ویسے بھی ان افسروں کی حکومت محض اخلاقی ہوتی ہے۔ ان کا حکم تب ہی تک چل سکتا ہے جب تک سپاہی اُن کی سنیں۔

یہ تو آپس کے تعلقات کی بات ہوئی۔ آپ اگر باہر کی دنیا کے ساتھ تعلقات کو دیکھیں تو بھی وہی فرق ان دونوں نظاموں میں نظر آئے گا۔ یہاں ابھی تھوڑی دیر ہوئی۔ باہر ایک مجمع اکٹھا ہو گیا تھا ان کو دھکے دے کر ہٹانے کے بجائے آپ نے ادب اور منت سے سمجھانے کی کوشش کی۔ جب آپ اس میں ناکام رہے تو خود اندر آ کے بند ہو گئے، اور انھیں کچھ بھی نہ کہا۔ لیکن فوجی ضابطے میں اخلاقی دباؤ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آئیے اب اس سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھیں۔ یہاں جو لوگ باہر سے آئے ہوئے ہیں وہ اگرچہ خدائی خدمتگار نہیں ہیں۔ پھر بھی ہماری بات محبت سے سنتے ہیں اور ان کا یہ ہلڑ مچانا بھی اُن کی محبت ہی کی ایک نشانی ہے۔ مگر ان کے علاوہ کچھ لوگ

ایسے بھی ہیں جو ہم سے دوستی نہیں بلکہ دشمنی رکھتے ہیں۔ مگر تشدد میں تو ایسے لوگوں کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔ مگر ہمارے یہاں دشمن کو دل میں دشمن سمجھنا بھی محبت کی بولی میں گناہ کہلائے گا۔ سو ہم ان سے بدلہ لینے کے بجائے دعا کرتے ہیں کہ ان کی طبیعت بدل جائے اور اگر ان میں کوئی تبدیلی نہ ہو تو ہم ان کی مار پیٹ کو برداشت کرتے رہیں، اور بزدلی سے نہیں بلکہ اپنی خوشی سے۔

جنوبی افریقہ کے ستیہ گرہ کے دوران میں میر عالم خاں نے غلطی سے یہ سمجھ بیٹھا کہ میں نے قوم سے دغا کی ہے۔ چنانچہ اس نے مجھ پر اچانک قاتلانہ حملہ کیا اور مجھے مردہ سمجھ کر بھاگ گیا۔ آخر غنڈہ اندر بزدل ہی ہوتا ہے۔ جب وہ گرفتار کر کے عدالت میں لایا گیا تو میں نے بیان دیا کہ میں اسے گرفتار کرانا نہیں چاہتا۔ کیونکہ اس نے جو کچھ کیا غلط فہمی کی وجہ سے کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ میرا دوست بن گیا۔ اور ایک بڑے مجمع میں اس نے مجھ سے معافی مانگی۔ اگر میں نے بدلہ لینے کی کوشش کی ہوتی تو یہ بات کبھی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ طبیعت کے بدلنے کی اعلیٰ مثال کہی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر محبت سے دشمن کی طبیعت کو بدلنے کی لگن آپ اپنے اندر محسوس نہیں کرتے تو آپ کے لئے یہی بہتر ہے کہ آپ عدم تشدد سے کنارہ کر لیں۔ یہ چیز آپ کے بس کی نہیں۔ آپ پوچھیں گے کہ اگر کوئی چور ڈاکو آ جائے یا کسی بے بس عورت پر کوئی بدمعاش حملہ کرے تب کیا اس وقت بھی ہم تشدد کا

استعمال نہ کریں۔ میرا جواب ہے، ہرگز نہیں۔ جان لینے کا حق صرف خدا کی ذات واحد و لایزال ہی کو حاصل ہے۔ اسی کو یہ قدرت ہے کیونکہ اصل حقیقت کو صرف وہی جانتا ہے کہ بے خطا فیصلہ کر سکے۔ انسان غلطی کا پتلا ہے۔ اسے فیصلے کا حق حاصل نہیں۔ عدم تشدد کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ لاچار ہو کر برائی کو برداشت کر لیں۔ یا اسے نظر انداز کر دیں یا ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں۔ اگر ہمارا عدم تشدد سچا ہے اور محبت سے پیدا ہوا ہے تو برائی کو روکنے کے لئے تشدد سے کہیں بڑھ چڑھ کر موثر ثابت ہو گا۔ آپ سے میں اس بات کی توقع رکھوں گا کہ اگر خدانخواستہ ایسا موقع آئے تو آپ ڈاکوؤں کو کھوج نکالیں۔ ان کو ان کی غلطی سمجھائیں، اور اس کام میں اگر جان بھی جاتی ہو تو اس کی پرواہ نہ کریں۔"

لکی سے ڈیرہ اسمٰعیل خاں تک موٹر کا لمبا اور تھکا دینے والا سفر تھا۔ اس علاقے میں ایک وسیع خشک منظر میدان ہے جو دریائے سندھ کے کنارے تک چلا گیا ہے۔ اس کے بیچ میں چکنی مٹی کی پہاڑیاں کسی دقیانوسی جانور کے ڈھانچے کی طرح کھڑی ہیں۔ ان کے پہلوؤں میں ہوا اور بارش نے گہری دراڑیں ڈال دی ہیں۔ اونٹوں کی قطاریں اپنی پیٹھ پر ننھے بچوں سے لے کر مرغیوں اور جلانے کی لکڑیوں تک پورے گھر بار کا سامان لادے چلی جا رہی ہیں۔ افغانستان کے موٹے تازے، خوفناک پاسبان کتے اپنے

مالک کے خاندان کے ساتھ جاڑا بسر کرنے کے لئے برطانوی ہند کے میدانوں کی طرف کا رخ کئے چلے جا رہے ہیں۔ گرم ہوا کے پردے کے پیچھے سراب کی جھلک نظر آتی ہے۔ گرد سے ڈھکی ہوئی جھاڑیاں سڑک کے کنارے تیزی سے دوڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مگر جب ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے راستے کی سب تصویریں حافظے میں آتی ہیں تو گرد اور دھوپ کا نقش ہی سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔

شام کے وقت ہم ڈیرہ اسمٰعیل خاں پہنچے۔ یہاں ۱۹۳۰ء کے ہندو مسلم فساد، لوٹ مار اور آتش زدگی کے واقعات کے آثار اب تک باقی تھے۔ مقامی کانگریس محض برائے نام تھی اور یہاں کے والنٹیرز کو بادشاہ خاں کے خدائی خدمت گاروں کے ساتھ مل کر کام کرنا بھی گوارا نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب گاندھی جی شام کو اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو مجمع کو قابو رکھنے کا سارا انتظام درہم برہم ہو گیا اور پرارتھنا کی صحبت نہیں ہو سکی بعض من چلے چھت پر چڑھ گئے۔ اور گاندھی جی کے کمرے کے روشن دان سے بیسیوں متجسس آنکھیں اندر جھانکنے لگیں۔ دو دن کے بعد ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے نواب گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں کو ان کے ہندو میزبان کی اجازت سے "گرفتار" کر کے اپنے ساتھ لے گئے اور انھیں اپنے مکان میں رکھا جہاں مقابلتاً امن تھا۔

دوسرے دن شام کو ایک عام جلسہ ہوا جس میں ۲ ۵ ۷ ۵ روپے کی تھیلی گاندھی جی کی خدمت میں پیش کی گئی۔ یہ رقم ڈیرہ اسمٰعیل خاں

جیسے شہر کے لئے کچھ بھی نہ تھی۔ اور اس میں بھی پانچ ہزار روپے ایک ہی شخص کا عطیہ تھا۔

گاندھی جی نے متعدد سپاس ناموں کے جواب میں جوان کے سامنے پیش کئے گئے تھے۔ ایک تقریر کی جس میں انھوں نے کہا:

آپ لوگوں نے مجھے روپے کی جو تھیلی دی ہے، اس کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ان سے میرا پیٹ نہیں بھرتا۔ مجھے تو کروڑوں آدمیوں کا کام کرنا ہے۔ مگر میں اس وقت پیسے جمع کرنے نہیں آیا ہوں۔ پیسے جمع کرنے آتا تو دوسری طرح کام کرتا۔ امیروں سے پیسے اکٹھا کر کے غریبوں کی جیب میں ڈالنا، یہ میرا پرانا کام ہے۔ بادشاہ خاں نے مجھ سے کہا تھا کہ یہاں سے پیسے نہ لینا۔ مگر میں آپ کی تھیلی واپس کر دوں، یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اتنا آپ لوگ سمجھ لیں کہ ہماری عورتوں کو دیہاتوں میں پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا تو ان سے آزادی کی گفتگو کرنا بے کار ہے۔ جب تک ہندو، مسلمان، عیسائی سب ایک دل نہیں ہو جائیں گے۔ آزادی صرف نام کی ہی ہوگی۔ عدم تشدد کے ذریعے آزادی حاصل کرنی ہے تو ہمیں چار طرح کا تعمیری پروگرام پورا کرنا ہوگا۔ یعنی کھادی، قومی اتحاد، چھوت چھات کا دور کرنا اور نشہ بندی۔

اس صوبے میں ہندو مسلمان اور انگریز تینوں کا امتحان ہو رہا ہے۔ پہلے میں کہا کرتا تھا کہ ہمارا امتحان پنجاب میں ہوگا۔ مگر اس وقت تک میں سرحدی صوبے میں نہیں آیا تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان کو

غلامی کی زنجیر میں جکڑنے کے لئے جو کچھ کیا ہے اس کا فیصلہ تو تاریخ آگے چل کر کرے گی۔ مگر ہندو مسلمان آج اپنی تاریخ خود بنا رہے ہیں۔ اگر وہ آپس کے تعلقات ٹھیک کرلیں تو دنیا کے لئے ایک مثال قائم کر جائیں گے۔ بس اگر خدائی خدمت گار عدم تشدد کو سمجھ لیں اور اس پر قائم رہیں تو یہ سب جھگڑے طے ہو سکتے ہیں۔ ہمیں کھادی کے ذریعے سے یہ کوشش کرنی ہے کہ کروڑوں روپیہ جو سوت کی خریداری کے لئے ہندوستان سے باہر جاتا ہے بچ جائے۔ چرخہ سنگھ نے کھادی کے کام کے ذریعے سے اب تک چار کروڑ روپئے سے زیادہ غریب ہندو مسلمان کاتنے اور بننے والوں کو مزدوری کے طور پر تقسیم کیا ہے۔ اس کے علاوہ اچھوت ادھار کا کام ہے اور یہ بھی خدمت خلق سے کم نہیں ہے۔ آپ کا عطیہ اس عظیم الشان کام کی مناسبت سے ہونا چاہئے جس کے لئے وہ دیا گیا ہے۔ آپ کا شہر کوئی غریب شہر نہیں ہے۔ چندہ زیادہ تر تاجروں نے دیا ہے۔ یقیناً آپ لوگ اس سے زیادہ دے سکتے تھے۔ اس کے بعد خدائی خدمتگاروں سے مخاطب ہو کر انھوں نے ان کے اندر مقامی والنیٹیروں کے تعلقات کی کشیدگی کا ذکر کیا جو اُن کے علم میں آئی تھی۔ یہ اختلافات بہت افسوسناک ہیں، لیکن اگر خدائی خدمت گار اپنے اصول پر جو وہ اب اچھی طرح سمجھ گئے ہیں، پورا پورا عمل کریں تو یہ جھگڑے اور لڑائیاں داستانِ پارینہ بن جائیں گی۔ یہی ان کے امتحان کا

وقت ہے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو گئے تو وہ فرقہ وارانہ اتحاد پیدا کرنے اور سوراج قائم کرنے میں مدد دیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ غصے کو بالکل نکال دینا بہت مشکل کام ہے۔ یہ محض انسان کی کوشش سے نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے توفیق الٰہی کی ضرورت ہے۔ آپ سب لوگ میرے ساتھ مل کر خدا سے دعا کیجئے کہ وہ خدائی خدمت گاروں کو اتنی قوت دے کہ اپنے دل سے غصہ اور تشدد کے رہے سہے آثار بھی دور کر دیں۔"

کلاچی اسی نام کی تحصیل کا صدر مقام ہے اور دریائے لونی کے شمالی کنارے پر ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے ۲۷ میل پچھم میں واقع ہے یہاں کے لوگوں نے ۳۰ ر اکتوبر کو ایک عام جلسے میں گاندھی جی کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ اس میں اس تحصیل کے دائمی افلاس کا اور بارش کی کمی کا ذکر تھا جس کا اوسط سال میں چار انچ سے زیادہ نہیں۔ گاندھی جی نے یہ سن کر بے تامل جواب دیا کہ "چرخہ چلانے سے افلاس دور ہو سکتا ہے۔" میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ پٹھان یہ پرامن مشغلے اختیار کریں تو سوت اور اون کی کتائی کا مستقبل بہت شاندار ہوگا۔"

اگلے دن ٹونک کے عام جلسے میں گاندھی جی نے ان شکایتوں کا ذکر کیا جو وہاں کے ہندوؤں نے اُن کے سامنے پیش کی تھیں۔ ہندوؤں کے ایک وفد نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ شکایت کی تھی کہ

کا جان مال محفوظ نہیں اگر مقامی خدائی خدمت گار ان کی مدد
کریں تو ان کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ گاندھی جی نے کہا۔ ان لوگوں
کا یہ خیال ہے کہ اس علاقے میں مسلمانوں کی کثیر آبادی کے درمیان
مٹھی بھر ہندوؤں کی گذر اُسی وقت ہو سکتی ہے جب مسلمان ان کے
ساتھ سچ مچ ہمسایوں کا سا برتاؤ کریں۔ انھوں نے مجھ سے درخواست
کی ہے کہ خدائی خدمت گاروں کو اس قدرتی فرض کی طرف توجہ دلاؤں
جو ان پر عائد ہوتا ہے۔ میں ان کے اس خیال کی اور اس درخواست
کی تائید کرتا ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ اگر وہ توقعات جو میں نے
آپ سے قائم کی ہیں پوری ہو جائیں تو ان لوگوں کو کوئی کھٹکا نہ رہے
گا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس صوبے میں ہندو، مسلمان
اور انگریز سب کی آزمائش ہو رہی ہے۔ انگریز جو کچھ کر رہے ہیں
اس کی اچھی برائی کا فیصلہ تاریخ کرے گی، لیکن ہندو اور مسلمان
چاہیں تو آپس کے اچھے برتاؤ سے اپنی تاریخ کو بدل سکتے ہیں خدائی
خدمت گاروں کا راستہ تو صاف ہے انھیں اپنے ہمسایوں کا
پشت پناہ بن کر رہنا ہے۔

پکے ارادے اور پکے عقیدے کے مٹھی بھر آدمی تاریخ
کی رو کو بدل سکتے ہیں۔ یہ پہلے بھی ہو چکا ہے اور اب بھی ہو سکتا
ہے۔ اگر خدائی خدمت گاروں کا عدم تشدد محض ملمع نہیں بلکہ
کھرا سونا ہے۔

خدائی خدمت گار افسروں کے ساتھ بات چیت کے دوران میں گاندھی جی نے کہا :- "بادشاہ خاں نے آپ لوگوں کا نام خدائی خدمتگار رکھا ہے اور ہندوستان کو یہ بات سنائی گئی ہے کہ آپ عدم تشدد کے پابند ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو چھپی نہیں رہ سکتی۔ جیسے سورج نکلتا ہے تو اندھے کو بھی اس کی حرارت محسوس ہونے لگتی ہے۔ ویسے ہی آپ کی محبت کی حرارت ہندوستان بھر میں پھیل جائے گی۔ آج تک ایک بھی خدائی خدمت گار مجھے ایسا نہیں ملا جس نے یہ کہا ہو کہ وہ عدم تشدد کا پابند نہیں یا اسے سمجھتا نہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم عدم تشدد پر قائم ہیں اور رہیں گے۔ خدا نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔ میرے جیسا آدمی جس نے تلوار بندوق کو چھوا تک نہیں یہ کہے کہ میں عدم تشدد پر قائم رہوں گا تو اس کی بات کی کوئی اہمیت نہیں۔ لوگ کہیں گے کہ اس سے اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔ مگر جب آپ لوگوں کے بارے میں میں یہ کہتا ہوں کہ آپ عدم تشدد پر قائم رہیں گے تو لوگ ہنستے ہیں اور مجھے بے وقوف بناتے ہیں مگر میں یہ نہیں مانتا کہ میں بے وقوف ہوں۔ البتہ اگر کسی پر اعتماد کرنا بے وقوفی میں داخل ہے تو ایسا بے وقوف بننا مجھے اچھا لگتا ہے۔ آخر میں کیوں نہ دوسروں کے قول پر اسی طرح بھروسا کروں جیسے میں چاہتا ہوں کہ دوسرے لوگ مجھ پر بھروسا کریں اگر آپ کے بارے میں میرا خیال غلط ہے تو بہت جلد اس کا پتہ چل جائے گا یہ ایسی چیز نہیں جس کا اثر دیکھنے کے لئے پچاس سال انتظار کرنا

پڑے۔ یہاں کے ہندو لوگ بھی میرے پاس آتے ہیں۔ ان کو یقین نہیں ہے کہ آپ سچے خدائی خدمت گار ہیں۔ اگر آپ لوگ پوری طرح عدم تشدد پر قائم ہوں گے تو خود بخود سب لوگ قائل ہو جائیں گے۔ یہ ایک بڑا معجزہ ہوگا۔ دو تین دن ہوئے سرحدی صوبے کے معزز مسلمان میرے پاس آئے تھے۔ کہنے لگے تم بڑے ہوشیار ہو۔ خدائی خدمت گاروں سے میل جول پیدا کر رہے ہو۔ یہ اچھی ترکیب ہے۔ میں تمھاری چال سمجھ گیا ہوں۔ میں چونکا کہ نہ جانے کیا سمجھے ہوں گے۔ وہ کہنے لگے کہ تم خدائی خدمت گاروں کو بہادر بنا رہے ہو۔ یوں تو وہ پہلے ہی سے بہادر ہیں۔ مگر تم ان کی بہادری کو اور بڑھا رہے ہو۔ جہاں تک بن پڑے گا یہ لوگ تلوار سے کام نہیں لیں گے۔ بہادر کو تلوار کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ہٹلر کو دیکھو نہ! بغیر تلوار نکالے وہ فتح پر فتح حاصل کر رہا ہے۔ لیکن اگر کبھی ان لوگوں کو تلوار نکالنے کا موقعہ پڑ جائے تو ان کی تلوار سب کو کاٹ کر رکھ دے گی۔

میں دل میں کچھ ہنسا اور کچھ رویا۔ اگر میری تعلیم آپ کے دل میں اس طرح کا جذبہ پیدا کرتی ہے تو پہلے میرے دل میں یہ جذبہ ہونا چاہیے۔ لیکن میں تو خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ ایسی بات میرے دل میں کبھی آتی ہی نہیں۔ تو پھر آپ کے دل میں کیسے آجائے گی خصوصاً ایسی حالت میں کہ آپ نے میرا پیام خود میرے منہ سے سنا ہے۔

مجھ میں غصہ تو کافی ہے۔ مگر پچاس سال کی کوشش سے میں اسے قابو میں رکھ سکتا ہوں۔ مخالف پر تو مجھے غصہ آتا ہی نہیں ہے۔ مگر دوستوں پر کبھی کبھی کر لیتا ہوں۔ اتنی کمزوری مجھ میں ضرور ہے۔ میں آپ کو جو سکھانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ فرض کیجئے یہاں جنگ چھڑ جائے۔ دشمن معصوم بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا شروع کر دیں اور ہر طرح سے آپ کو اور مجھے اشتعال دلانے کی کوشش کریں۔ اس پر بھی ہم تشدد کا دامن نہ چھوڑیں۔ خدا ہمارا امتحان اسی طرح سے لیتا ہے۔

اس دوست نے جو کچھ میری بابت سمجھا وہی چیز کئی انگریزوں کے دلوں میں بھی ہے۔ مگر میں تو آپ لوگوں کو اس کے برعکس تعلیم دینا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں آپ لوگ غصے کو بالکل دل سے نکال دیں۔ مرنے سے تو ڈرنا ہی کیا۔ آپ تو پہلے بھی نہیں ڈرتے تھے۔ اب اور بھی نڈر ہو جائیں گے۔ کوئی ہم کو مار ڈالے، ہمارے معصوم بچوں کو قتل کر ڈالے، تو بھی ہماری تلوار اس پر نہیں چلے گی۔ اس کو غلط راستے سے روکنے کی کوشش میں ہم خود مر جائیں گے مگر اس پر غصہ نہیں کریں گے۔

مجھ سے کسی نے پوچھا تھا کہ فرض کیجئے آپ کی لڑکی کو ڈاکو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ آپ اس کی حفاظت کے لئے مرنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ آپ کو درخت سے باندھ دیتا ہے، اور مرنے بھی نہیں دیتا۔ تب

آپ کیا کریں گے؟ میں نے جواب دیا کہ تب میں لاچار ہو جاؤں گا اور خدا مجھے معاف کر دے گا۔ مگر میں اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ وہ جس رسی سے مجھے باندھے جہاں تک ہو سکے گا اُسے توڑ ڈالوں گا۔ لیکن اگر اس کو توڑنے کی طاقت ستر سال کی عمر میں مجھ میں نہ ہوئی تو اس کوشش میں خود ٹوٹ جاؤں گا۔ صرف اس کی ضرورت ہے کہ زندگی کی محبت دل سے نکال دیں۔ اپنی جان دینے کی طاقت تو ہر انسان میں ہوتی ہو ہونی ہی چاہیے۔

تو میں آپ کو جان دینے کا فن سکھانا چاہتا ہوں۔ کوئی آپ کی بیوی بچوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے تو بھی آپ کے منہ سے یہی نکلے کہ یا خدا اس پر رحم کر۔ اسے حیوانیت سے بچا۔ اگر آپ یہ سیکھ سکتے ہیں تو بہت اچھا ہے۔ لیکن اگر نہیں سیکھ سکتے تو بہتر ہو گا کہ آپ پھر تلوار اُٹھا لیں۔ مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ میں آپ سے ہاتھ دھو لوں گا اور صبر کر کے بیٹھ رہوں گا۔ رہی دنیا تو اُسے شکایت ہی کیا ہو سکتی ہے۔ آپ نے ہزار ہا سال تلوار چلائی ہے۔ آئندہ بھی وہی کرتے رہیں تو اس میں کوئی انوکھی بات نہ ہوگی۔ لیکن اگر میری تعلیم کی وجہ سے آپ تلوار چھوڑ کر بزدل اور نامرد بن جائیں تو اس میں آپ کی، میری خان صاحب کی سب کی ذلت ہے۔

غالباً یہ ایک پہلا موقعہ تھا کہ کسی شخص نے ان لوگوں سے اس طرح گفتگو کی تھی، اور عدم تشدد کا مکمل پیغام ان تک پہنچایا تھا۔ خود

یہ بات کہ گاندھی جی کو اس کا موقع دیا گیا، پٹھانوں کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کرتی ہے۔ جب یہ اکھڑ سپاہی اپنے سردار خان عبدالغفار خاں کی تیز نظروں کے سامنے گاندھی جی کے انوکھے پیام امن کو غور سے سن رہے تھے تو ان کو دیکھ کر بے اختیار کیٹس کے یہ لافانی اشعار یاد آجاتے تھے جن میں بہادر کورٹیز اور اس کے ساتھیوں کا ذکر ہے۔

اس وقت میری حالت اس شخص کی سی تھی جو دوربین لگائے آسمان کو دیکھ رہا ہو اور یکایک ایک نئے ستارے کی جھلک اس کی نظر پر آن کر پڑتی ہے یا بہادر کورٹیز کی سی جس کی عقاب کی سی تیز نظریں بحرالکاہل کو چھانتی ہوئی یکایک ٹھٹک گئیں اور اس کے سب ساتھی کبھی حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اور کبھی ڈارین کی سرزمین پر پہاڑ کی ایک چوٹی کو ـــ

بارھواں باب

آزاد قبائل میں

ڈیرہ اسمٰعیل خاں پہنچ کر صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں کا دورہ ختم ہو گیا۔ ۱۳ ماہ گذشتہ کو سہ پہر کے وقت ڈیرہ اسمٰعیل سے روانہ ہو کر ہم نے دورے کا آخری حصہ شروع کیا۔ سیواگرام سے جہاں بیماری پھیل گئی تھی اور آدھے کارکن، صاحب فراش تھے۔ واپسی کا تقاضا ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ گاندھی جی کو یہ فکر تھی کہ رمضان کے مہینے میں اپنے دورے کو اس سے زیادہ جاری نہ رکھیں جتنا کہ اشد ضروری تھا۔ جس اہتمام کے ساتھ ہمارے مسلمان میزبان بادشاہ خاں صاحب اور ان کے خدائی خدمت گار روزے کی حالت میں گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں کے کھانے پینے کا اور آرام و آسائش کا سامان کرتے تھے اس کی وجہ سے گاندھی جی کو اور بھی لگنے لگا کہ جہاں تک ہو سکے ان کا بوجھ ہلکا کرنا شرافت کا تقاضا ہے۔ ایک روز جب ہم دوپہر کے کھانے کے بعد سڑک کے کنارے

ایک چھوٹے سے گاؤں میں ٹھہرے تھے۔ گاندھی جی نے خدائی خدمتگاروں سے گفتگو کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا۔ انھوں نے کہا "میں اس سے بہت متاثر اور شرمندہ ہوں کہ رمضان کے زمانے میں جب کہ مسلمانوں کے اس گاؤں کے کسی ایک گھر میں بھی چولھا نہیں جلتا۔ ہم لوگوں کے لئے آپ کو کھانا پکوانا پڑا۔ اب میری وہ عمر نہیں کہ میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ روزہ رکھوں۔ جیسے میں جنوبی افریقہ میں ان مسلمان بچوں کی تربیت کی غرض سے رکھتا تھا جو میری نگرانی تھے۔

"اس کے علاوہ مجھے خاں صاحب کے جذبات کا لحاظ تھا۔ جنھیں دن رات میرے آرام کی فکر رہتی ہے۔ میرے روزے رکھنے سے ضرور وہ پریشان ہوتے۔ اس کے سوا کہ میں آپ سے معافی مانگوں اور کیا کر سکتا ہوں؟"

ہمارا باقی سفر بھاگ دوڑ ہی گذرا۔ پہلے دن ہم سو میل کا فاصلہ طے کرکے پنیالے کے گاؤں تک پہنچنا چاہتے تھے جو بڑی سڑک سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔ جب ہم میری خیل پہنچے تو اندھیرا ہو چلا تھا اور سڑکیں روک دی گئی تھیں۔ اس سڑک کے اس حصے میں سفر خطرناک سمجھا جاتا ہے اور سہ پہر کے چار بجے کے بعد آمد و رفت کی اجازت نہیں دی جاتی۔ لیکن بادشاہ خاں کی موجودگی ہر جگہ "کھل جا سم سم" کا کام دیتی تھی۔ جب ہم پہلی روک پر پہنچے تو بادشاہ خاں نے اپنے بیٹے ولی خاں سے جو موٹر چلا رہے تھے کہا "ان لوگوں سے

کہہ دو کہ ہم اپنی ذمہ داری پر سفر کرنا چاہتے ہیں اور دیکھو اگر کوئی شخص چلائے کہ ٹھہر جاؤ تو فوراً گاڑی روک دینا۔ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم کون ہیں تو کوئی ہم سے تعرض نہیں کرے گا۔ لیکن اگر تم نے یہ کوشش کی تیزی سے نکل جاؤ تو ممکن ہے کہ پیچھے سے بندوق کی آواز سنائی دے!" رات کو ہم مقصود جان اور ان کے بھائی کے باغ میں ٹھہرے جنھوں نے اپنی اعلیٰ تعلیم کو دیہاتی وضع اور لمبی سفید ریش میں چھپا رکھا ہے۔ صبح پھر وہی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ اسی راستے سے ہم ڈیرہ اسمٰعیل خاں واپس پہنچے اور احمدی بانڈہ نام گاؤں میں دو گھنٹے ٹھہر کر بنوں کے قریب سے گذرتے ہوئے سالٹ رینج کی بھوری مٹی کی پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ چلتے رہے جن کی شکستہ چوٹیوں پر ہمیشہ ایک طلسمی سکوت اور خواب سا چھایا رہتا ہے۔ پھر کوہاٹ کے شہر اور درۂ کوہاٹ سے ہوتے ہوئے اس مقام سے گذرے جہاں ایک چھوٹی سی پگ ڈنڈی ایک کوہستانی گھاٹی سے نکلتی ہے۔ اسی جگہ سے لوگ مولی ایلس کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ اب اس مقام پر پولیس کا پہرہ لگا دیا گیا ہے۔ اس سے آگے ایک سو پچیس میل کا فاصلہ طے کر کے شام کے وقت ہم پشاور شہر کے چوک میں پہنچ گئے۔

جب ہم اسٹیفال کی سڑک پر اڑتے چلے جا رہے تھے، تو بادشاہ خاں مختلف مقامات اور مناظر پر جو رستے میں آتے

تھے سرسری تبصرہ کرتے جاتے تھے ۔ بنوں سے کوہاٹ جانے والی سڑک کی بے شمار فوجی چوکیوں میں سے ایک کے پاس سے گذرتے ہوئے انھوں نے کہا "کس قدر بے کار اسراف ہے ۔ مہاتما جی ذرا جھنڈوں اور مسلح گاڑیوں اور ٹینکوں کی اس بے جا نمائش کو دیکھیے گا اور اس پر بھی یہ لوگ ڈاکوؤں کے اس چھوٹے سے گروہ کو جو مدت سے اس علاقے کو تاراج کر رہا ہے ۔ گرفتار کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ۔ ایک سال ڈاکوؤں کے سردار نے اپنا جھنڈا سامنے کی پہاڑی پر برطانوی فوج کے سامنے گاڑ دیا اور پکار کر کہا کہ اگر ہمت ہو تو مجھے پکڑ لو لیکن وہ اب تک پکڑا نہیں گیا ۔ یا تو یہ فوج کی انتہائی نالائقی ہے اور یا اس کی مجرمانہ بے پروائی ۔"

پنیالہ اور احمدی بانڈہ میں گاندھی جی نے خدائی خدمت گاروں سے گفتگو کی اور پنیالا میں ایک عام جلسہ بھی ہوا ۔ مگر قبل اس کے کہ میں گاندھی جی کی گفتگو کا خلاصہ بیان کروں یہ ضروری ہے کہ جو لوگ ان کے مخاطب تھے اُن کی کچھ روایات اور خصوصیات بیان کر دی جائیں ۔

لفظ افغان ایک وسیع معنی رکھتا ہے جس کا اطلاق افغانستان کی جدید ریاست کے ہر باشندے پر ہوتا ہے لیکن لفظ پٹھان کا تعلق زبان سے ہے ۔ یہ پختنوں کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کے معنی ہیں پختنوں بولنے والا ۔ اس میں جنوبی مشرقی

افغانستان اور ہندوستان کے سرحدی علاقے کے سب لوگ جو پختون یا پشتو بولتے ہیں شامل ہیں۔ ایک چیز جس پر بادشاہ خان عام جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے اکثر زور دیتے تھے یہ تھی کہ ہر وہ شخص پٹھان ہے جس نے اس صوبے کو اپنا وطن بنا لیا ہے اور پختون بولتا ہے، چاہے ہندو ہو یا سکھ یا مسلمان۔ واقعی ایسے ہندو اور سکھ مرد عورتیں اور بچے موجود ہیں جو پٹھانوں کے درمیان بس گئے ہیں، پٹھانوں کا لباس پہنتے ہیں اور پشتو کے سوا کوئی زبان نہیں بولتے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنے ناموں میں پشتو زبان کا لاحقہ، زئی بھی لگا لیا ہے۔

پٹھان بڑے تنومند ہوتے ہیں۔ ان کا جسم دُبلا مگر مضبوط اور لچک دار ہوتا ہے۔ سارے دورے میں ایک پٹھان بھی نہیں ملا جس کا پیٹ نکلا ہوا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ بے چربی کا گوشت کھاتے ہیں۔ اور نشاستے دار غذائیں بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ یہ کبھی بغیر ہتھیار لگائے باہر نہیں نکلتے۔ مویشی چراتے وقت لدو جانوروں کو ہانکتے وقت، کھیت بوتے وقت، میلے ٹھیلے میں، عام جلسوں میں، غرض ہر وقت، ہر جگہ وہ مسلح ہوتے ہیں ان کی رائفل یا بھاری جزائل (پرانے منش کے پٹھان توڑے دار بندوق کو اس نام سے پکارتے ہیں۔) عموماً بائیں کندھے سے لٹکی ہوتی ہے۔ کارتوسوں کی پیٹی، چھریاں اور خنجر ان کے جسم میں

جابجا گھسے ہوئے ہوتے ہیں مثلاً کمر کی پٹی پر، گریباں کے نیچے گوٹی پر اس تمام وقت میں جو وہ گھر سے باہر گذارتے ہیں دم بھر بھی الگ نہیں ہوتے۔ وہ بڑے ماہر نشانہ باز ہوتے ہیں اور گھات میں چھپ کر بیٹھنے، چھاپہ مارنے اور پہاڑی لڑائی لڑنے میں کمال رکھتے ہیں

جو انگریز پٹھانوں پر کتابیں لکھتے ہیں وہ عام طور پر ان کے کیرکٹر کو برا کہتے ہیں۔ اس لئے کہ ان میں سے اکثر پرانے فوجی افسر ہوتے ہیں جن سے ان کی دشمنی ہے۔ پٹھانوں کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہ "پرلے سرے کے چور اور لٹیرے ہوتے ہیں!" کمانڈر اسٹیفن کنگ ہال فرماتے ہیں "پٹھان سوتے آدمی کے نیچے سے کمبل تک چرا لیتے ہیں!" لیکن ڈیویز کا اور اس دلچسپ کتاب "کاروان خیبر" کے مصنف کا خیال ہے کہ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ پٹھانوں کو سوتے ہوئے شہریوں کے نیچے سے کمبل چرانے سے کیونکر روکا جائے بلکہ یہ ہے کہ سنتریوں کی رائفلوں کی چوری کیونکر بند کی جائے۔ یہاں تک ہوا کہ رائفل کے چوری چلے جانے پر مارشل لا کی سزا دی گئی، اور پہرے والوں کی بندوقیں ان کی کلائی یا کمر پر زنجیر سے جکڑی جانے لگیں۔ مگر اس کا نتیجہ صرف یہی ہوا کہ رائفل بمعہ سنتری کے لاپتہ ہونے لگیں۔

اپنے سماجی تعلقات میں پٹھان "پٹھن ولی" کے یعنی تین اخلاقی ضابطوں کے پابند ہیں جن کا قبائل کے لوگوں کو خیال رکھنا پڑتا ہے
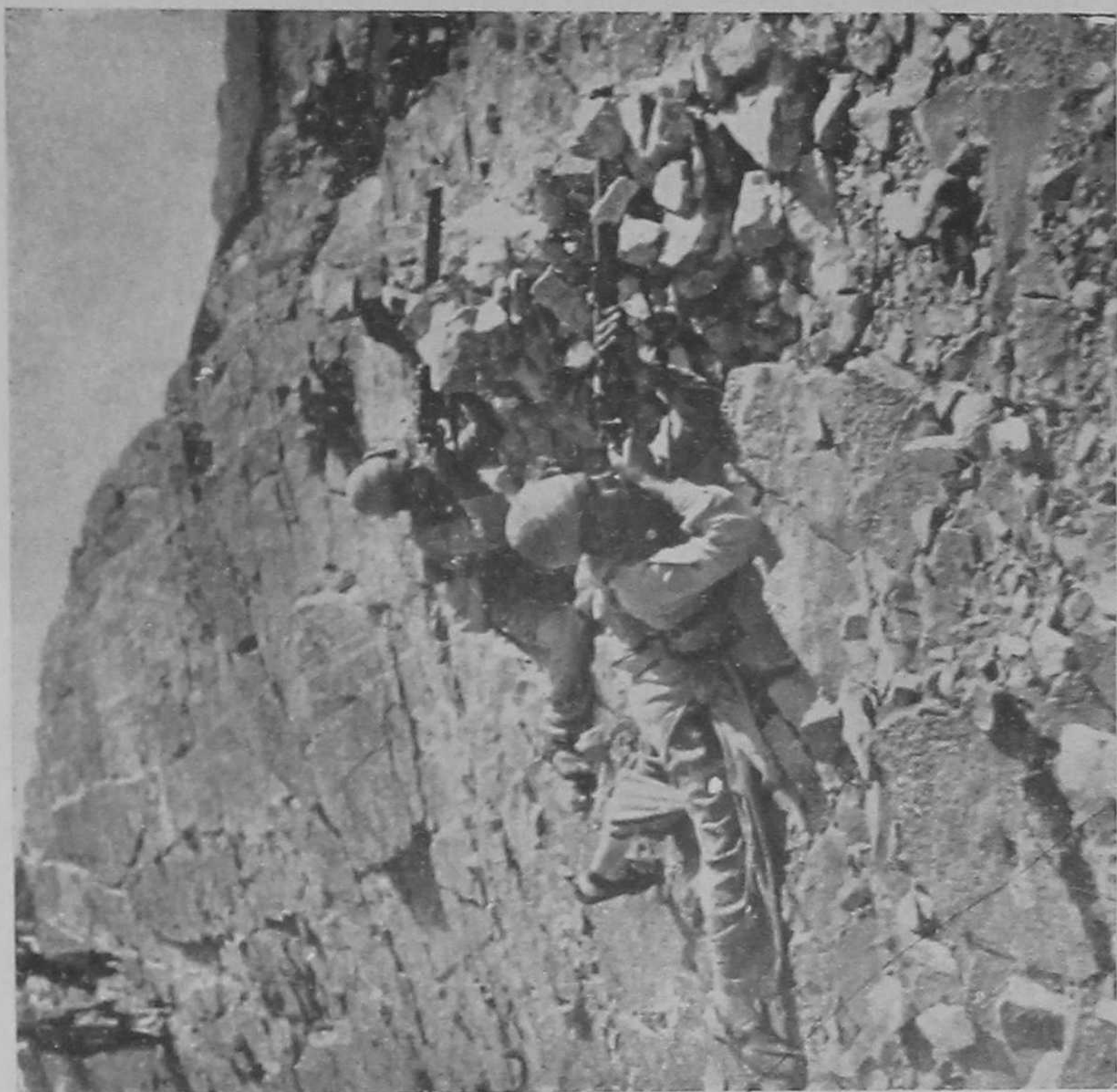
جن کی خلاف ورزی گناہِ کبیرہ سمجھی جاتی ہے اور دائمی ذلت اور معاشرتی مقاطعے کا باعث ہوتی ہے۔

(۱) پٹھان کو چاہیئے کہ مفرور کو پناہ دے (ننواتی) (۲) اس کا فرض ہے کہ سخت سے سخت اپنے دشمن سے مہماں نوازی (مل مستیا) کا برتاؤ کرے (۳) اس پر لازم ہے کہ توہین کا بدلہ توہین سے لے (بدل)، اس آخری اصول کی وجہ سے خون کی عداوت کا سلسلہ چلتا رہتا ہے جو پٹھانوں کی قوم کے لئے ایک لعنت ہے۔ ہر قبیلے کی چھوٹی چھوٹی گوتوں میں خانہ جنگی ہوتی رہتی ہے ہر خاندان کسی دوسرے خاندان سے خون کی عداوت رکھتا ہے اور ہر شخص کے کچھ نہ کچھ جانی دشمن ہوتے ہیں۔ ہر شخص اپنی قتل کی وارداتوں کا شمار رکھتا ہے ہر قبیلے کا اپنے ہمسایوں سے جانوں کی لین دین کا کھاتا ہوتا ہے ڈیویز لکھتا ہے "بدقسمتی سے سرکش پٹھانوں کو یہ احساس نہیں کہ اس وحشیانہ رسم کے مہلک اثر سے ان کے بہت سے بہترین خاندان قریب قریب ختم ہو گئے ہیں۔ جب تک یہ خانہ جنگیاں موقوف نہ ہوں نہ تو ایک متحدہ قوم بن سکتی ہے اور نہ امن قائم ہو سکتا ہے"!

بہرحال پٹھانوں کی سیرت کی اچھی یا بُری صفات میں اب تک عدم تشدد داخل نہ تھا۔ اسی لئے گاندھی جی نے خدائی خدمتگاروں کو یہ بتانے میں خاص اہتمام کیا کہ وہ جو بات انھیں سمجھانے کے لئے آئے ہیں وہ ان کے قدیم علم و عمل سے بالکل الگ ہے اور بادشاہ خاں

کی تعلیم روایات ماضی کے بالکل برعکس ہے ۔ انھوں نے پٹیالہ میں خدائی خدمت گاروں سے کہا:-

"میں نے جو کچھ بادشاہ خاں سے سنا تھا ۔ وہ اب خود آپ لوگوں کی زبان سے سن لیا کہ آپ نے عدم تشدد کو مصلحت وقت کے طور پر نہیں بلکہ ایک عقیدے کے طور پر ہمیشہ کے لئے اختیار کر لیا ہے ۔ اس لئے محض تلوار کو ہاتھ سے رکھ دینا جب کہ آپ کے دل میں تلوار موجود ہے ، کچھ زیادہ فائدہ نہیں دے گا ۔ تلوار کا ترک اس وقت تک سچا نہیں سمجھا جائے گا جب تک آپ کے دل میں ایسی طاقت نہ پیدا ہو جائے ، جو تلوار کی طاقت کے برعکس اور اس سے برتر ہو ۔ اب تک انتقام آپ لوگوں کے ہاں ایک مقدس فرض سمجھا جاتا ہے ۔ اگر آپ کی کسی شخص سے خون کی عداوت ہو تو ہمیشہ باقی رہتی ہے اور باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی چلی جاتی ہے ۔ عدم تشدد کا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص آپ کو اپنا سمجھتا ہو تو آپ کو یہ حق نہیں کہ اسے اپنا دشمن سمجھیں ظاہر ہے کہ انتقام کا یہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔"

انھوں نے اپنے مخاطبوں سے پوچھا " جنرل ڈائر سے زیادہ ظالم اور خوں خوار اور کون ہو سکتا ہے ؟ لیکن کانگریس نے جو کمیٹی جلیانوالہ باغ کے معاملے کی تحقیق کے لئے مقرر کی تھی وہ میرے مشورے سے ، یہ مطالبہ کرنے سے باز رہی کہ ڈائر پر مقدمہ چلایا جائے ۔ میرے دل میں اس کی طرف سے مخالفت کا شائبہ بھی نہ تھا ۔ میں تو

چاہتا تھا کہ اس سے مل کر اس کے دل پر اثر ڈالوں مگر یہ آرزو پوری نہیں ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے ان لوگوں کو بتایا کہ خدائی خدمت گاروں کا عدم تشدد اپنے آپ کو کس طرح خلق خدا کی خدمت میں ظاہر کر سکتا ہے اور اس کے لئے کس قسم کی تربیت کی ضرورت ہے۔

جب یہ گفتگو ختم ہوئی تو ایک خدائی خدمت گار نے جو گاندھی جی کی تقریر بڑے غور سے سن رہا تھا یہ مشکل سوال پوچھا "آپ ہم سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہم ہندوؤں کی چھاپہ مارنے والوں سے حفاظت کریں مگر اسی کے ساتھ آپ ہم سے یہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے ہتھیاروں سے چوروں اور ڈاکوؤں کے مقابلے میں بھی کام نہیں لے سکتے یہ دونوں باتیں ساتھ ساتھ کیسے ہو سکتی ہیں؟ گاندھی جی نے جواب دیا یہ تناقص محض ظاہری ہے۔ اگر آپ نے سچ مچ عدم تشدد کی روح کو جذب کر لیا ہے تو آپ چھاپہ مارنے والوں کے حملے کا انتظار نہیں کریں گے بلکہ ان کے علاقے میں جاکر انھیں ڈھونڈھ نکالیں گے اور ایسی کوشش کریں گے کہ ان کے حملے رک جائیں۔ اگر اس پر بھی وہ چھاپہ ماریں تو آپ ان کا سامنا کریں گے اور ان سے یہ کہیں گے کہ وہ آپ کے ہندو ہمسایوں کے مال کو اس وقت تک ہاتھ نہیں لگا سکتے جب تک آپ کی لاشوں پر سے نہ گذریں۔ اگر سینکڑوں خدائی خدمت گار اپنے ہندو ہمسایوں کی حفاظت پر

تیار رہوں تو چھاپہ مارنے والوں کو اس میں بہت تامل ہوگا کہ ان سب بے گناہ خدائی خدمت گاروں کو، جو عدم تشدد کے ذریعے ان کا مقابلہ کر رہے ہیں، بغیر کسی اشتعال کے قتل کر دیں۔ آپ کو شیخ عبدالقادر جیلانی کا اور ان چالیس اشرفیوں کا قصہ معلوم ہے جو ان کی ماں نے انھیں بغداد جاتے وقت دی تھیں۔ راستے میں قافلے پر ڈاکوؤں نے حملہ کیا اور حضرت عبدالقادر کے ساتھیوں کے پاس جو کچھ تھا لوٹ لیا۔ خود عبدالقادر اتفاق سے بچ گئے تھے مگر آپ نے خود چھاپہ مارنے والوں کو پکار کر کہا کہ میری ماں نے چالیس اشرفیاں میرے کرتے کے استر میں سی دی ہیں، روایت یہ ہے کہ ڈاکوؤں پر اس لڑکے کے (حضرت شیخ اس زمانے میں بہت کم سن تھے) بھولے پن کا اس قدر اثر ہوا کہ انھوں نے نہ صرف اس کو بے لوٹے چھوڑ دیا بلکہ اس کے ساتھیوں کا بھی سارا مال واپس کر دیا۔"

احمدی بانڈہ میں گاندھی جی نے خدائی خدمت گاروں کو یہ سمجھایا کہ عدم تشدد کے پروگرام میں سول نافرمانی کی کیا حیثیت ہے اور وہ عملی پروگرام سے کیا تعلق رکھتی ہے۔ لیکن چونکہ گاندھی جی اس تقریر کو اپنے اخبار میں شائع کر چکے ہیں۔ اس لئے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

پشاور کے بار ایسوسی ایشن نے گاندھی جی کی موجودگی

سے فائدہ اٹھا کر وزیر اعظم کے مکان پر ان کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کیا اس میں انھوں نے بڑے فخر سے یہ دعوے کیا کہ گاندھی جی ان کی برادری کے رکن ہیں اور ضمناً اپنے پیشے کے بعض ممتاز لوگوں کی سیاسی خدمات کا ذکر کر کے اپنی تعریف بھی کر دی۔ گاندھی جی نے ایک مزاحیہ تقریر میں اس عزت کا شکریہ ادا کیا جو انھیں بخشی گئی تھی اور کہا کہ میں اس رتبے کا مستحق نہیں ہوں۔ اس لئے کہ ایک تو لندن کی اس قانونی انجمن نے جس سے میں نے سند لی تھی مجھے اپنی رکنیت سے خارج کر دیا ہے، دوسرے میں نے جو کچھ قانون پڑھا تھا وہ سب مدت ہوئی بھلا دیا۔ پچھلے زمانے میں میرا شغل عدالتوں میں قانون کی تشریح کرنے سے زیادہ قوانین کی خلاف ورزی رہا ہے۔ ایک اور وجہ جو سب سے اہم ہے یہ کہ میں وکیلوں اور ڈاکٹروں کے بارے میں کچھ انوکھے خیالات رکھتا ہوں جو میں نے اپنی کتاب انڈین ہوم رول میں ظاہر کئے ہیں۔ میرے خیال میں سچا وکیل وہ ہے جو حق اور خدمت کو مقدم سمجھتا ہے اور معاوضے کو مؤخر جانتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ آپ لوگوں نے بھی اس نصب العین کو اختیار کیا ہے یا نہیں۔ لیکن اگر آپ یہ حلف اٹھائیں کہ آپ اپنی قانونی قابلیت کو ایثار کے جذبے کے ماتحت خدمت میں صرف کریں گے تو میں سب سے پہلے آپ کے سامنے ہدیہ عقیدت پیش کروں گا۔"

پشاور سے روانہ ہونے سے پہلے گاندھی جی صوبہ سرحد کے وزیروں سے ملے اور وہ وعدے پورے کرنے کے لئے جو انھوں نے مختلف اوقات پر کئے تھے، ان کے ساتھ بعض سیاسی اور انتظامی معاملات پر گفتگو کی جن کے بارے میں پبلک میں بڑی بحث ہو رہی تھیں۔ اس گفتگو کے بعض معاملات صاف ہو گئے اور وزارت نے گاندھی جی کے ملاحظات کی روشنی میں بعض امور کا قطعی فیصلہ کر دیا۔

جنوبی ہند کے ایک اعلیٰ انگریز عہدے دار پشاور میں گاندھی جی سے ملنے کے لئے آئے اور انھوں نے اُن سے ایک مشکل سوال پوچھا "جنوب سے شمال کی طرف آتے ہوئے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالکل دوسری قسم کے انسان رہتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں میں اور جنوب کے لوگوں میں کوئی چیز مشترک معلوم ہی نہیں ہوتی کیا یہ دونوں کبھی مل سکتے ہیں؟" گاندھی جی نے جواب دیا کہ ظاہر میں یہ اختلاف ضرور ہے لیکن عدم تشدد وہ سنہری پل ہے جو تند خو اور جنگ جو پٹھانوں کو جنوبی ہند کے ذہین اور علیم لوگوں سے ملاتا ہے۔ وہ خدائی خدمت گار جنھوں نے عدم تشدد کا عقیدہ اختیار کر لیا ہے اب ہندوستان کے دوسرے حصے کے لوگوں سے مختلف نہیں رہے، اگر کچھ فرق ہے تو تشدد سے پاک بہادری کے مدارج میں ہے۔ مختلف قسم کے لوگوں کے میل جول کا مسئلہ ہو

یا کوئی اور پیچیدہ سوال ہو، عدم تشدد کا نقطۂ نظر اختیار کرتے ہی ساری مشکلات غائب ہو جاتی ہیں۔

ضلع ہزارہ جو دریائے سندھ کے اس پار واقع ہے آخری ضلع تھا جس کا گاندھی جی نے دورہ کیا۔ یہ صوبہ سرحد کا انتہائی شمالی ضلع ہے اور سارے صوبے میں یہی ایک علاقہ ہے جو دریائے سندھ کے مشرق میں واقع ہے۔ یہ برطانوی علاقے کی ایک سو بیس میل لمبی ایک گاؤ دم پٹی ہے جس کے مشرق میں کشمیر کا علاقہ اور مغرب میں علاقہ آزاد کی پہاڑیاں ہیں۔

اس ضلع میں داخل ہونے سے پہلے ۸ر نومبر کو گاندھی جی تھوڑی دیر کے لئے بھرتی علاقہ چھچھ میں گئے تھے۔ یہ علاقہ اگرچہ سیاسی اور جغرافی حیثیت سے پنجاب کا ایک حصہ ہے۔ لیکن زبان رسم و رواج اور عادات و خصائل کے لحاظ سے یہاں کے باشندے سرحد کے لوگوں سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے یہ درخواست کی کہ ان کے علاقے کے پشتو بولنے والے لوگوں کو صوبہ سرحد کی خدائی خدمت گاروں کی تحریک میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے۔ گاندھی جی نے ان سے کہا اس میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ خدائی خدمت گاروں کی ایک انجمن ہے جس کا صدر مقام اتمان زئی ہے۔ ہر شخص جو اُن کے حلف نامے پر دستخط کر دے اور پشتو بول سکتا ہو اپنا نام خدائی خدمت گاروں میں لکھوا سکتا ہے۔

صرف یہ شرط ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ کسی اور انجمن کا ممبر نہ ہو۔ اس لئے آپ لوگوں کو پورا حق ہے کہ خدائی خدمت گاروں میں داخل ہو جائیں اور اس کے لئے کسی خاص اجازت کی ضرورت نہیں ہے!!

بھوتی جاتے ہوئے گاندھی جی کی موٹر کو ایک حادثہ پیش آیا جس میں ایک بچھڑا ٹکر کر کچھ تھوڑا سا کچل گیا۔ مقامی کانگریسیوں نے جو بادشاہ خاں کے ساتھ تھے بے تامل اس حادثے کا سارا الزام اپنے مخالفوں پر یا حکومت پر رکھ دیا۔ گاندھی جی کے نزدیک کانگریسی دوستوں کے اس طرح جھٹ پٹ اپنے مخالفوں کو بغیر کافی وجہ کے قصوردار ٹھہرانے میں تعصب اور تنگ دلی پائی جاتی تھی جو عدم تشدد کے ساتھ نہیں کھپتی تھی۔ گاندھی جی نے کہا "جب محبت کا بیج ہمارے دل میں پھوٹ آئے گا تو ہمارے فسادات جھگڑے اور آپس کی تو تو میں میں ایک داستان پارینہ بن جائے گی جب خدائی خدمت گاروں کے دل محبت سے بھر جائیں گے تو ہمیں آزادی مل جائے گی۔ لیکن آزادی ہمیں اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک ہماری محبت روزمرہ کے کاموں میں نہ چھلکے!!

جب جلسہ ختم ہو گیا تو گاندھی جی نے بادشاہ خاں سے کہا "ہم کو یہ چاہئے کہ جہاں یہ حادثہ ہوا تھا وہاں کسی شخص کو بھیج کر بچھڑے کے مالک کو معاوضہ دیں اور بچھڑے کے علاج کے لئے سالوتری کے پاس لے جائیں۔ بادشاہ خاں نے کہا "بے شک" اور فوراً اس کا انتظام کر دیا۔

گاندھی جی ۶ نومبر کی شام کو ہری پور پہنچے اور راستے میں سکھوں کے مشہور مندر پنجہ صاحب میں گئے۔ جہاں مندر کے منتظموں کی طرف سے ان کو اور بادشاہ خاں کو "سراپا" دیا گیا، ہری پور میں ویسی ہی گڑبڑ بھی جیسی ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں ہوئی تھی۔ شہر کے اندر سے گاندھی جی کا جلوس نکالا گیا حالانکہ انھوں نے اس کی ممانعت کر دی تھی اور ان سے وعدہ کر لیا گیا تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ گاندھی جی کے اسباب کے پہنچنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ لگ گیا۔ اس مجمع کی وجہ سے جس نے ان کے میزبان کے گھر کو گھیر رکھا تھا، ہم کو وہاں پہنچے چند ہی گھنٹے ہوئے تھے کہ لوگ دروازے کے اندر گھس آئے اور دوسرے دن صبح کو مقررہ وقت سے کئی گھنٹہ پہلے گاندھی جی ایبٹ آباد روانہ ہو گئے۔

چھ تاریخ کی شام کو ہری پورہ میں ایک جلسہ ہوا یہاں بھی ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا جس کی طرف گاندھی جی نے اپنی تقریر میں اشارہ کیا۔ جلسے سے پہلے ایک مقامی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کا خط گاندھی جی کے پاس پہنچا جس میں نرمی سے اس بات کی شکایت کی گئی تھی کہ کانگریس کے مقامی عہدہ داروں نے اسکول کی زمین پر جلسہ کرنے کے لئے ان سے باضابطہ اجازت نہیں لی تھی۔ گاندھی جی نے اپنی تقریر میں کہا کہ مکمل اخلاق اور ضابطے کی پوری پابندی بھی اسی طرح عدم تشدد کے اجزا ہیں جس طرح اور بڑی بڑی چیزیں جو ان کے سامنے بیان کی گئیں، سائنس داں کہتے ہیں کہ ہم لنگور

کی اولاد ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا ہو، لیکن انسان کو خدا نے اسی لئے نہیں بنایا کہ وہ حیوانِ مطلق کی حیثیت سے زندگی بسر کرے جس نسبت سے وہ عدم تشدد اور رضاکارانہ ضبط کی عادت ڈالتا ہے اسی نسبت سے وہ حیوانوں سے ممتاز ہوتا ہے اور اس درجے پر پہنچتا ہے جو خدا نے اس کے لئے مقرر کیا ہے۔ عدم تشدد نے جو ذمہ داریاں ہم پر عاید کی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم کمزور سے کمزور آدمی یہاں تک کہ بچے کے حقوق کا بھی احترام کریں۔"

سوشلسٹ خیال کی ایک چھوٹی سی جماعت نے ایک چھوٹا سا ہنگامہ برپا کر دیا انھوں نے بادشاہ خاں کو ایک ایڈریس دیا جو وہ گاندھی جی کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے لیکن چونکہ جلسہ شروع ہو چکا تھا اس لئے انھیں اجازت نہیں دی گئی۔ اس پر وہ ناشائستہ نعرے لگاتے ہوئے جلسے سے چلے گئے۔ گاندھی جی نے اس واقعہ سے فائدہ اٹھا کر اس بات پر زور دیا کہ عدم تشدد میں تحمل بہت ضروری ہے۔ ہمیں گالیوں کا جواب تحمل سے دینا چاہیے۔ انسانی فطرت اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اگر ہم غصے یا گالی کا بالکل نوٹس نہ لیں تو دوسرا شخص جلد تھک کر خاموش ہو جائے گا۔ ہمیں ان لوگوں کی طرف سے جنھوں نے گڑبڑ مچائی تھی دل میں ناراضگی نہیں رکھنی چاہیے انھوں نے بلا ارادہ ہمیں تحمل کا ایک قابل قدر سبق دیا، ستیہ گرہی ہمیشہ دشمن کو امکانی دوست سمجھتا ہے۔ عدم تشدد کے نقطۂ

صدی کے تجربے میں میں نے ایک مثال بھی ایسی نہیں دیکھی کہ کامل عدم تشدد کے مقابلے میں عداوت زیادہ دیر تک باقی رہ سکی ہو۔"

۳۱ر نومبر ۱۹۳۶ء

تیرھواں باب

عدم تشدّد کی وضاحت

سرحد پار کے اضلاع پشاور، مردان، کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے برخلاف ہزارہ کے ضلع میں نہ تو آبادی میں پٹھانوں کا غالب حصہ ہے اور نہ یہاں کے پٹھان اتنے اجڈ ہیں جتنے دوسرے اضلاع کے۔ یہ ضلع مانسہرہ اور ایبٹ آباد کے پہاڑی خطوں اور ہری پور کی سیراب تحصیل پر مشتمل ہے۔ یہ کم و بیش قدیم ٹیکشاشلا کا علاقہ ہے جو سندھ کے اس پار ایک خوش حال ہندو ریاست تھی اور جس کے دارالسلطنت ٹیکسلا میں وہ مشہور و معروف یونیورسٹی تھی جہاں نہ صرف ہندوستان کے دور دراز مقامات سے بلکہ وسط ایشیا میں صحرائے گوبی کے آگے کے ملکوں تک سے بھی طلبا ر اُمڈے چلے آتے تھے، گاندھی جی کے پروگرام میں یہ بھی شامل تھا کہ تینوں تحصیلوں کے صدر مقامات میں جائیں۔ ۷ر نومبر کی صبح کو وہ ہری پور سے مقررہ وقت سے کئی گھنٹہ پہلے روانہ ہو کر ایبٹ آباد

ہم اپنے میزبان رائے بہادر پرمانند کے یہاں اچانک پہنچے۔ ایبٹ آباد سطح سمندر سے چار ہزار ایک سو دو فٹ بلند ہے۔ اس کے شمال میں وادی ککن کے خوش نما مناظر ہیں اور مانسہرہ کی طرف برف پوش پہاڑ کی چوٹیوں کا سلسلہ ہے۔ ایبٹ آباد بڑی دلچسپ جگہ ہے لیکن اس کے ساتھ ماضی کی ناخوش گوار یادوابستہ ہے۔ ہندوستان میں بہت کم مقامات ہوں گے جنھوں نے خلافت کے زمانے میں عدم تشدد کے پہلے سبق کی اتنی بھاری قیمت ادا کی ہو جتنی ایبٹ آباد نے کی تھی۔ آج بھی اگر کوئی شخص ایک بار اس شہر سے گذر جائے تو اس پر یہ تکلیف دہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ دوسرے پہاڑی مقامات کی طرح یہاں بھی فوج والوں کے سوا عام شہری ذلت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ سب اچھی جگہیں فوج کے لئے اور حکمران طبقے کے لئے محفوظ ہیں۔ مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ ایک معزز ہندوستانی کو اپنے ذاتی بنگلے میں رہنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس لئے اس سے ملے ہوئے دونوں بنگلوں میں جو اسی کی ملکیت تھے صاحب لوگ کرائے پر رہتے تھے، اور ان کو یہ گوارا نہ تھا کہ کوئی "نیٹو" اُن کے بیچ میں رہے۔

فقیر بادشاہ خاں کا دل ہمیشہ غریبوں میں پڑا رہتا ہے۔ یہ بات ہم پر ایک روز صاف ظاہر ہو گئی، جب وہ صبح تڑکے ہم میں سے چند نوجوانوں کو پہاڑ پر چڑھنے کے لئے لے گئے۔ انھوں نے کہا

"چلو پہاڑ کی چوٹی سے سورج نکلنا دیکھیں اور ہمیں زبردستی صبح کی سخت سردی میں گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ پہاڑ کی اطراف کا منظر جو جاڑوں کی تازگی بخش اور شاندار صبح کو دکھائی دیا ایک جان فزا منظر تھا۔ وادی کی دھندلی گہرائی سے لے کر پہاڑوں کی چیڑ کی درختوں سے ڈھکی ہوئی سر بفلک چوٹیوں تک، کھیتوں کی سیڑھیاں اس کی شہادت دے رہی تھیں کہ آخر کار عدم تشدد لاکھوں انسانوں کے صبر، محنت اور اتحاد عمل کی شکل میں اس جنگ میں فتح حاصل کرتا ہے جو ان پہاڑیوں میں قدرت کی تہی دستی سے ہمیشہ سے ہوتی ہے۔ بادشاہ خاں نے ہم کو لے جاکر ان کھیتوں میں سے ایک کھیت دکھایا تاکہ ہمیں یہ اندازہ ہو کہ پہاڑوں کے پہلو کی بنجر پتھریلی زمین کو کاشت کے قابل بنانے میں کس بلا کی محنت کرنی پڑتی ہے۔" یہ کشمکش نہایت دقت سے آہستہ آہستہ قدم بہ قدم آگے بڑھتی ہے۔ کھیت کی ایک تنگ پٹی سے چٹان کو صرف ہاتھ کی قوت سے ہٹانے میں سالہا سال صرف ہو جاتے ہیں اور پھر جیسے ہی زمین سے کچھ پیداوار ہونے لگتی ہے حکومت فوراً آکر لگان کا مطالبہ کرتی ہے۔" بادشاہ خاں جوش میں چلا اٹھے۔ "یہ بڑی بے انصافی اور سنگدلی ہے۔ اگر میرے اختیار میں ہو تو میں اس قسم کے کام کے لئے جس میں زمین کو قدرت سے چھیننا پڑتا ہے، امداد دیتا بجائے اس کے کہ اس پر محصول لگاؤں۔ یہ ایک شرمناک لوٹ ہے۔"

کھیت کے بیچ میں ایک جھونپڑی کھڑی تھی۔ بادشاہ خاں نے
اصرار کیا کہ ڈاکٹر سوشیلا نائر جو ہمارے ساتھ تھیں اس جھونپڑی
میں رہنے والے کسانوں کے خاندان سے ملیں اور معلوم کریں کہ ان
کو کسی قسم کی مدد کی ضرورت تو نہیں ہے اور جب انھوں نے تھوڑی
دیر بعد واپس آکر یہ بتایا کہ انھوں نے اس خاندان کے ایک مرد
کو جسے کوئی چھوٹی موٹی بیماری تھی ایک سہل سا نسخہ بتا دیا تھا تو
بادشاہ خاں بہت خوش ہوئے۔ دورے کے زمانے میں انھوں نے
بارہا گاندھی جی سے کہا تھا "مہاتما جی مجھے سیاست سے نفرت
ہے یہ ایک بھول بھلیاں ہے جس میں آدمی بے کار چکر کھاتا رہتا ہے
میں چاہتا ہوں کہ اس سے بھاگ کر غریب سے غریب لوگوں کے
گھروں پر جاؤں اور ان کی خدمت کروں۔" واپسی میں ہم نے دفعتاً
دیکھا کہ ہم غائب ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان کو اپنی پسند کا ایک کام مل گیا
تھا۔ ایک پٹھان لڑکا ایک گدھے پر پتھر لادے ہوئے جا رہا تھا
گدھے نے ٹھوکر کھائی اور بوجھ اس کی پیٹھ پر سے گر گیا۔ یہ دیکھ کر کہ
لڑکے کو پتھر لادنے میں بڑی دقت ہو رہی ہے۔ بادشاہ خاں
اس کی مدد کے لئے رک گئے۔ انھوں نے دوسرے ساتھیوں کو بھی
مدد کرنے کے لئے بلا لیا اور جب اس کام سے فارغ ہو کر انھوں نے
پہاڑی سے اترنا شروع کیا تو ان کے دل میں اس بات کی تسلی تھی کہ
انھوں نے دن کا آغاز اس طرح کیا جیسا ایک خدائی خدمت گار کو

زیب دیتا ہے۔

ایبٹ آباد کے قیام میں جتنے اہم کام تھے وہ سب دوسرے دن کے پروگرام میں جمع ہوگئے تھے۔ مانسہرہ میں آٹھ تاریخ کو ایک جلسہ تھا جس میں گاندھی جی کی خدمت میں ایک ایڈریس قصبے کے باشندوں کی طرف سے اور ایک وہاں کی کسان کمیٹی کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔ آخرالذکر نے گاندھی جی کو اس طرف توجہ دلائی کہ مانسہرہ تحصیل کے بعض حصوں میں نظام مال گذاری کے بعض تکلیف دہ دقیانوسی طریقے رائج ہیں اور ان کی منسوخی کی درخواست کی۔ مثلاً موروثی کاشتکاروں کو (۱) روپے میں چار آنے سے لے کر بارہ آنے تک لگان کے علاوہ مالکانہ کے نام سے زمیندار کو دینا پڑتا ہے۔ (۲) سال میں کچھ دن بغیر کسی اُجرت کے بیگار کرنی پڑتی ہے (لیکن بیگاریوں کی تعداد کھیت کے رقبے کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ اس پر موقوف ہے کہ وہ کتنے آدمیوں میں تقسیم ہوا ہے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ چالیس کنال کا ایک کھیت ہے اور اس پر پانچ بے گاری دینے پڑتے ہیں۔ اب اگر زمیندار کے مرنے کے بعد اس کے پانچ بیٹوں میں تقسیم ہوجائے تو ان میں سے ہر ایک کسان سے پانچ بیگاری مانگے گا۔) (۳) زمین ساری کی ساری ورثے میں لڑکوں کو ملتی ہے۔ لڑکیاں بالکل محروم رکھی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایڈریس میں کئی ابواب اور ناجائز رقموں

اور ان دھوکوں اور زیادتیوں کا ذکر تھا جو زمیندار کی طرف سے
کاشتکاروں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ان بیانات کے متعلق اس کے
سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ اگر ان کا ایک حصہ بھی صحیح ہے تو یہ ایک شرمناک
ظلم ہے جسے فوراً ختم کر دینا چاہیے مخصوصاً ایسے زمانے میں جب
حکومت کانگریسی وزرار کے ہاتھ میں ہے۔

مانسہرہ کے عام باشندوں کی طرف سے جو ایڈریس دیا
گیا وہ ان تمام ایڈریسوں میں جو سارے دورے میں گاندھی جی کی
خدمت میں پیش کیے گئے سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے۔ گاندھی
جی نے اس کے جواب میں لوگوں کو یقین دلایا کہ آپ نے عدم تشدد
کے میدان میں جو کچھ کر دکھایا ہے، اس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں
لیکن میں اس پرانی مثل کا قائل ہوں کہ جو دیتا ہے اس سے اور زیادہ
مانگا جاتا ہے۔ میں آپ کو جتلائے دیتا ہوں کہ میں اس وقت تک چین
نہ لوں گا جب تک آپ اپنے عدم تشدد کے ذریعے نہ صرف اپنی
بلکہ ہندوستان کی آزادی نہ حاصل کرلیں۔ میں آپ کے صوبے میں
دوبارہ آیا ہوں تاکہ آپ سے اور اچھی طرح واقف ہو جاؤں اور
یہ دیکھ لوں کہ آپ کے ہاں عدم تشدد کس طرح برتا جاتا ہے اور
میرا ارادہ تیسری بار آنے کا بھی ہے اور اس وقت میں ان مسائل
کو جو بیچ میں چھوٹ گئے ہیں پھر سے اٹھاؤں گا۔

اس سے پہلے خدائی خدمت گاروں کے افسروں کو مخاطب

کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا :- آپ لوگوں نے مجھے ابھی بتایا ہے کہ آپ نے ہمیشہ کے لئے تشدد کی جگہ عدم تشدد اختیار کر لیا ہے۔ کل اس بارے میں بات چیت کرتے ہوئے میرے منہ سے نکل گیا کہ ہمیں عدم تشدد کی جگہ "محبت" لفظ استعمال کرنا چاہیے۔ یعنی آج تک جو کام تشدد سے کیا جاتا ہے وہ ہمیں اب محبت سے کرنا ہے اس کے یہ معنی ہو جاتے ہیں کہ جسے ہم دشمن سمجھتے تھے اس کے متعلق دشمنی کا خیال بالکل دل سے نکل جانا چاہیئے۔ مگر صرف اتنا ہی کافی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس کی جگہ کون سی چیز لے گی۔ آج دنیا میں لاکھوں آدمیوں کے پاس لاٹھی نہیں۔ مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ عدم تشدد کے پابند ہیں۔ عدم تشدد تو تب وجود میں آتا ہے جب ہم محبت میں وہ طاقت پیدا کر لیں جو لاٹھی میں بھی۔ یا تو ہماری سب طاقت زائل ہو جاتی ہے اور ہم کسی کام کے نہیں رہتے یا ڈرپوک بن جاتے ہیں اور اس طرح اپنی انسانیت ہی کھو بیٹھتے ہیں۔

آج کل یہ کہنے کا رواج ہو گیا ہے کہ دنیا کا کاروبار تو تھپڑ کا جواب تھپڑ سے دئے بغیر نہیں چلتا۔ میری رائے میں یہ بات ٹھیک نہیں ایک بچہ اپنے تھپڑ کا جواب تھپڑ سے نہیں دیتا۔ وہ اپنے باپ کا حکم مانتا ہے۔ مگر اس کے تھپڑ کے ڈر سے نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ تھپڑ مارنے پر بھی اسے اس کی محبت نے مجبور کیا ہے اور وہ اس محبت کو ٹھیس لگانا نہیں چاہتا

میرا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا کا کاروبار اسی طاقت کے سہارے
پر چلتا ہے اور چلایا جا سکتا ہے۔ دنیا کو خاندان کا ایک وسیع تر نمونہ
سمجھنا چاہیئے۔ جو قانون خاندان پر عائد ہوتا ہے وہ دنیا پر بھی
ہوتا ہے۔ باقی یہ تو ہم ہی نے دنیا کو باہم مخالف گروہوں میں
بانٹ کر دوست، دشمن کی تمیز پیدا کر دی ہے۔ مگر اس کے باوجود
دنیا چلتی تو محبت کی طاقت سے ہی ہے۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ یہاں
کے خدائی خدمت گار محض نام ہی نام کے ہیں۔ اُن کا کچھ بھروسہ
نہیں۔ آج سُرخ پوش بن جاتے ہیں اور کل دوسرا رنگ اختیار
کر لیتے ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو میرا آپ سے کچھ کہنا بیکار
ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ الزام جھوٹا ہوگا۔ اگر آپ میں سچائی
نہیں جو کچھ آپ کرتے ہیں وہ سچے دل سے نہیں کرتے تو آپ
کی سرخ وردی کس کام کی۔ میں جانتا ہوں کہ بادشاہ خاں کو
اس بات نے کافی پریشان کر رکھا ہے کہ آپ کی جماعت میں
کئی نالائق اور مطلبی آدمی گھس آئے ہیں مجھے بھی اس سے
پریشانی ہوتی ہے۔ میں بادشاہ خاں کی رائے سے بالکل
متفق ہوں کہ اگر ہمارے آدمی سچے نہیں ہیں تو صرف نعرہ بازی بڑھانے
سے ہماری طاقت بجائے بڑھنے کے گھٹے گی۔ خدائی خدمتگاروں
کی تحریک کا کام ہندوستان بھر میں اور اس کے باہر بھی دور
دور مشہور ہو چکا ہے۔ آپ نے عدم تشدد کو جہاں تک

سمجھا ہے وہاں تک تو اس پر عمل کر لیا ہے۔ مگر اس کے اندر ابھی اور بہت کچھ ہے، اور وہ بہت بڑی چیز ہے۔ بادشاہ خاں یقین دلاتے ہیں اور میں اُسے مانتا ہوں کہ آپ عدم تشدد کا پورا پورا مطلب سمجھنے اور اس پر مکمل طور پر عمل کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کو بہت سے پہاڑ کاٹنے اور وادیاں عبور کرنی ہیں۔ عدم تشدد کا جو تعمیری پروگرام آپ کے سامنے رکھا گیا ہے۔ اس پر اگر ہم ایک بار ٹھیک طور پر عمل شروع کر دیں تو پھر آگے گا آپ کا راستہ خود بخود نکل آئے گا۔ اس سے آپ کی سچائی اور شوق کا بھی پتہ چل جائے گا۔

سہ پہر کو ایبٹ آباد واپس آ کر گاندھی جی مقامی ہریجن مندر میں گئے اور انھیں یہ سن کر خوشی ہوئی کہ کم سے کم ایبٹ آباد میں ہریجنوں پر اپنے بچوں کو مدرسے میں داخل کرانے یا کنوئیں سے پانی بھرنے وغیرہ میں کوئی روک ٹوک نہیں۔ وہ گورنمنٹ گرلز اسکولوں میں بھی گئے جو ان خاتون کے خلوص اور محبت کا نتیجہ ہے، جن کے گھر ہم ایبٹ آباد میں ٹھیرے تھے۔

سہ پہر کو اقلیتوں کا ایک وفد گاندھی جی کے پاس آیا تاکہ اُن مشکلوں کے بارے میں گفتگو کرے جن کا سامنا اقلیتوں کو صوبہ سرحد میں کرنا پڑتا ہے۔ سب سے زیادہ پریشانی ان کو یہ تھی کہ جب سے سرحد کا علیحدہ صوبہ بنا ہے تشدد کے جرائم

کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ اُن کی تجویز یہ تھی کہ بدامنی کے روز افزوں خطرے کو دیکھتے ہوئے ان اقلیتوں کو جو سرحدی علاقے میں آباد ہیں بلا معاوضہ ہتھیار دئے جائیں اور ان کا استعمال سکھایا جائے تاکہ ان کو اپنی حفاظت میں آسانی ہو۔ لیکن انھوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ سرحد پار کی بدامنی کا مسئلہ قطعی اور مکمل طور پر صرف اسی طرح حل ہو سکتا ہے کہ اس جماعت کو جس کی اکثریت ہے اقلیت کی دستگیری کے فرض کا احساس دلایا جائے۔ گاندھی جی نے جواب میں فرمایا کہ میں آپ کے مطالبے کی تائید تو کر سکتا ہوں کہ اسلحہ کے لئے بے تکلف لائسنس تقسیم کئے جائیں لیکن حکومت سے یہ توقع کرنا بے جا ہوگا کہ وہ سرحد کے قریب رہنے والے سب لوگوں کو مفت ہتھیار بانٹے۔ اگر آپ چاہیں تو مفت میں ہتھیار بانٹنے کے لئے چندہ جمع کر سکتے ہیں، لیکن مجھے اس میں شبہہ ہے کہ بلا معاوضہ ہتھیار بانٹنے اور ان کا استعمال سکھانے سے سرحد پار کی بدامنی کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اگر اس تجربے کو جو حال میں بنوں کے چھاپے میں ہوا ہے پیش نظر رکھا جائے تو اس طرح کی کارروائی محض فضول خرچی ہوگی مجھے بتایا گیا ہے کہ بنوں کے حملے کے وقت شہریوں کی طرف سے صرف ایک بندوق استعمال کی گئی حالانکہ شہر میں بندوقوں کی کمی نہ تھی اور اس ایک بندوق سے بھی چھاپہ مارنے والوں سے زیادہ پبلک کو نقصان پہنچا۔ البتہ آپ نے

اکثریت کے فرض کے متعلق جو کچھ کہا اُس سے مجھے اتفاق ہے۔ بادشاہ خاں خدائی خدمت گاروں کو اس کے لئے تیار کر رہے ہیں کہ شہریوں کو ان چھاپوں سے محفوظ رکھنے کا فرض انجام دے سکیں۔ وفد کے ارکان نے گاندھی جی سے چند اور امور کے متعلق بات چیت کی گاندھی جی نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور غالباً ان کے ساتھ بابو راجندر پرشاد کو ورکنگ کمیٹی نے صوبہ سرحد میں آنے کی ہدایت کی ہے۔ آپ ان سے ان چیزوں کے متعلق گفتگو کیجئے گا۔

صوبہ سرحد میں اقلیتوں کی جو حیثیت ہے یہاں اس کے متعلق چند باتیں کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اس صوبے کی کل آبادی ۲۴۲۷ لاکھ ہے جس میں سے ۲۲،۵ لاکھ مسلمان ہیں ۵،۱ لاکھ ہندو ہیں، ۷۰۹ ہزار سکھ ہیں۔ ۴،۱۶ ہزار عیسائی، ۶۲ پارسی ۱۱ یہودی اور ۳ بودھ ہیں۔ فی صدی کے حساب سے مسلمانوں کی آبادی ضلع ہزارہ میں ۹۰ فی صدی سے لے کر ڈیرہ اسمٰعیل خان میں ۸۶ فی صدی تک ہے۔ لین دین اور تجارت اب تک عموماً ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھ میں ہے اور چونکہ پہلے وہ تعلیم میں مسلمانوں سے آگے بڑھے ہوئے تھے۔ اس لئے ملازمتوں میں بھی ان کا حصہ اپنی تعداد کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔ کچھ عرصے سے انھیں مسلمانوں کے مقابلے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور مقابلے کی وجہ سے آپس میں مخالفت پیدا ہو گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے

کہ جو لوگ کامیاب ہیں انھیں اپنی کامیابی کا تاوان اور بھی زیادہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ ایک کامیاب رائے بہادر جس نے فوجی ٹھیکوں سے بہت بڑی دولت جمع کر لی ہے، قدرتی طور پر سرحد پار کے وزیری اور محسود قبائل کی لالچ کو بھڑکاتا ہے اور یہ لوگ اپنی غارت گری کے جذبے کو جائز ثابت کرنے کے لئے رائے بہادر پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ اس فوجی مشین کو تیار کرنے میں بالواسطہ مدد دیتا ہے جو ان کو کچلنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ مسلمان سیاسی کارکنوں کو خواہ وہ کانگریسی ہوں یا غیر کانگریسی اس سے یہ شکایت ہے کہ اگرچہ اس نے اپنی ساری دولت اسی صوبے میں پیدا کی ہے اور اقلیت کے ایک رکن کی حیثیت سے اپنی حفاظت کا اور خاص مراعات کا مطالبہ کرتا ہے۔ لیکن اس کو صرف حکومت کی نظر عنایت حاصل کرنے کی فکر رہتی ہے۔ وہ کبھی صوبے کی ترقی کے کسی کام میں روپے سے یا ہاتھ پاؤں سے مدد نہیں کرتا۔ اقلیت میں ذہانت اور قابلیت کے ساتھ ساتھ ایثار اور خدمت کی روح نہ ہو تو یہ اس کے پاؤں میں زنجیر ہو کر رہ جائیں گی۔ اگر وہ اپنی ذہانت اور قابلیت کو اس صوبے کی خدمت میں صرف کریں جس کو انھوں نے اپنا وطن بنایا ہے تو اکثریت بہت جلد انھیں محبت اور قدر کی نظر سے دیکھنے لگے گی۔ لیکن اگر وہ ان چیزوں کو جاہ و منصب حاصل کرنے کا ذریعہ بنائیں گے تو لوگوں کے دل میں مخالفت کا

جذبہ بھڑکانے کے سوا کوئی نتیجہ نہ ہوگا۔

ایک جگہ یہ شکایت کی گئی کہ ہندو اور سکھ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو چھونے سے ناپاک ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو اسے مذہب کے حقیقی جذبے کے مسخ ہو جانے کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ دوسروں کے مذہب کا اسی طرح احترام کرنا چاہیے جیسے ہم اپنے مذہب کا کرتے ہیں، ایک ایسا فرض ہے جس پر ہمیں ہر وقت اور ہر جگہ عامل ہونا ہے۔ مگر جہاں ایک چھوٹی سی اقلیت دوسرے مذہب والوں کی بہت بڑی اکثریت کے بیچ میں رہتی ہو، وہاں تو اس کے بغیر چارہ ہی نہیں۔ لیکن اگر اقلیت مجبور ہو کر ایسا کرتی ہے تو اکثریت کی یہ شان ہونی چاہیئے کہ وہ دل سے اقلیتوں کے جذبات اور عقائد کا احترام کرے۔

جس چیز سے گاندھی جی کو دلی خوشی ہوئی وہ یہ تھی کہ سارے دورے میں موجودہ وزارت پر سخت سے سخت نکتہ چینی کرنے والوں نے بھی خان عبدالغفار خاں یا اُن کے بھائیوں پر مذہبی تعصب کا الزام نہیں لگایا اور ان کے خلوص میں شبہہ نہیں کیا۔
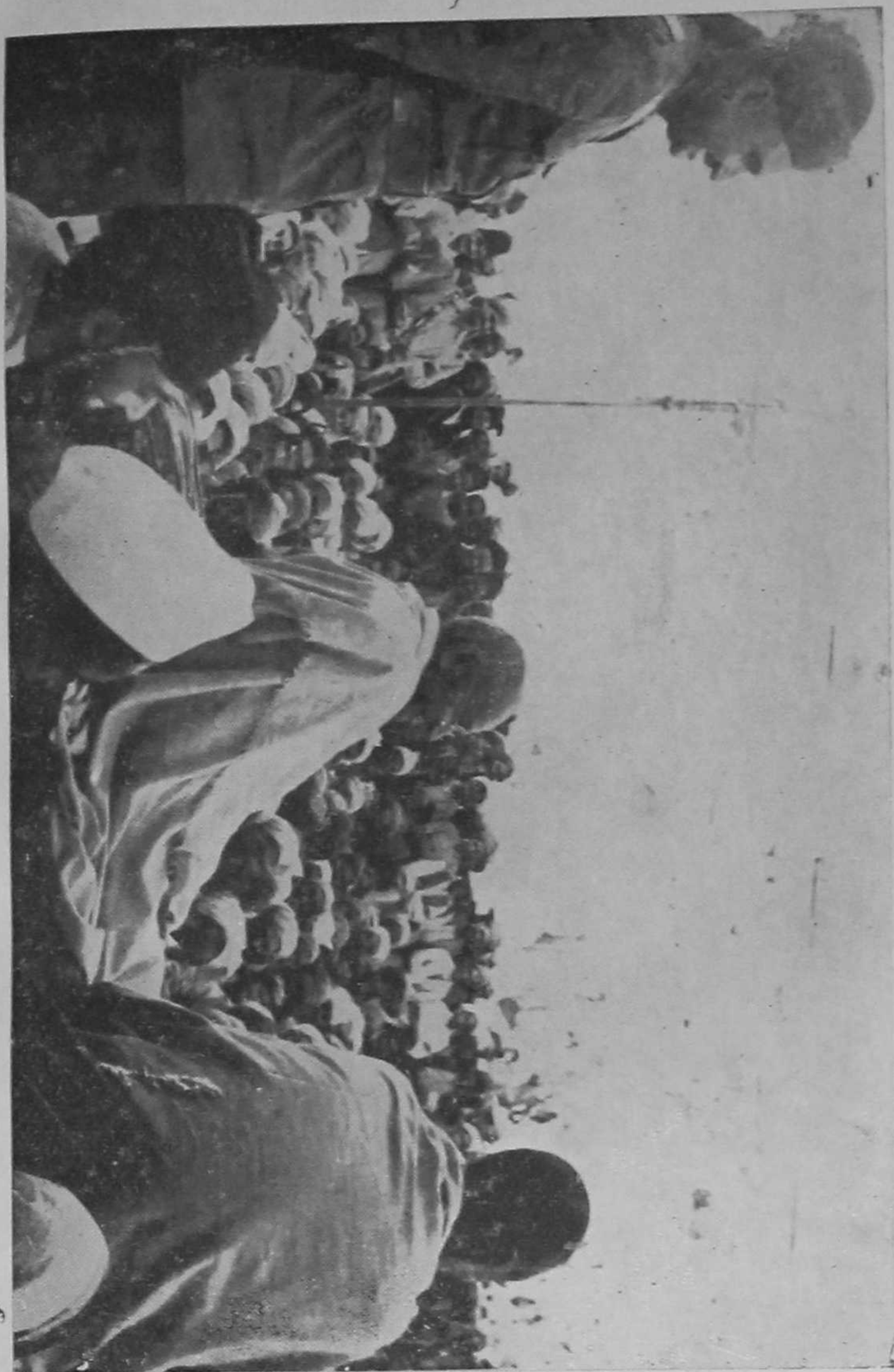
چودھواں باب

جُدائی

ایبٹ آباد کا پروگرام ایک جلسے پر ختم ہوا جس میں سارے ضلع کی طرف سے کئی ایڈریس اور ۱۱۲۵ روپے کی مجموعی رقم گاندھی جی کی خدمت میں پیش کی گئی۔ جلسے کی کارروائی میں بڑے مزے کی بات یہ ہوئی کہ ایڈریس کے لکھنے والوں نے جذبات کی رو میں بہہ کر گاندھی جی کے خیر مقدم میں زمین آسمان کے قلابے ملا دئے انھیں "دنیا کے سب سے بڑے آدمی" کے لقب سے مخاطب کیا۔ گاندھی جی نے اپنے جواب میں جو مذاق کے لہجے میں تھا اس مبالغہ آرائی پر اُن کی ایسی خبر لی کہ وہ عمر بھر نہ بھولیں گے۔ انھوں نے کہا

"آپ لوگوں نے جو ایڈریس مجھے دیا ہے، اس کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ صدر صاحب نے تو ایک بڑی زبردست بات کہہ دی کہ آپ لوگوں کے سامنے "دنیا کی سب سے بڑی ہستی"

کھڑی ہے۔ میں سوچ میں پڑگیا کہ وہ کون ہوگا۔ میں نہیں ہوں۔ اتنا تو میں جانتا تھا۔ یہ میں انکسار یا تکلف سے نہیں کہتا۔ بلکہ دل سے محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اس سلسلے میں یونان کے قدیم حکیم سولن (SOLON) کا ایک قصہ یاد آتا ہے۔ اس سے ایک بار یونان کے ایک بڑے دولت مند آدمی کریسس (CREASUS) نے پوچھا کہ دنیا میں سب سے خوش قسمت آدمی کون ہے اس نے جواب دیا کہ مجھے معلوم نہیں۔ اس پر وہ دولت مند آدمی جھنجھلایا اس نے سوچا تھا کہ شاید مجھ ہی کو کہے گا۔ مگر سولن نے سمجھایا کہ اس بات کا فیصلہ تو آدمی کے مرنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے کہ وہ خوش قسمت تھا یا نہیں۔ روایت ہے کہ بعد میں اس شخص پر بڑی بڑی مصیبتیں ٹوٹیں اور بالکل مفلسی کی حالت میں مرا مرتے وقت اس کو سولن کا وہ قول آیا اور وہ اس کی سچائی کا قائل ہو گیا۔

اگر اس کا فیصلہ کہ خوش قسمت کون شخص ہے مرنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے تو اس کا فیصلہ کرنا تو اور بھی مشکل ہونا چاہئے کہ دنیا کی سب سے بڑی ہستی کون ہے۔ خدا اتنا سیدھا سادہ نہیں ہے کہ اپنی بڑی سے بڑی ہستیوں کی قطار باندھ کر ایک جلوس نکال دے کہ دنیا انھیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھے۔ مجھے میرے ستر سال کے تجربے نے سکھایا ہے کہ دنیا کی حقیقی بڑی ہستیوں

کا ان کی زندگی میں دینا کو علم ہی نہیں ہوتا۔ سچی لڑائی کا علم صرف خدا ہی کو ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ صرف وہی ہمارے دلوں کا حال جانتا ہے میں نے یہ ساری بات آپ کو اس لئے سنائی ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس طرح کے ایڈریس دینا چھوڑ دیں۔ اور "دنیا میں سب سے بڑی ہستی" والے فقرے کو بالکل ہی بھول جائیں۔ جو ملک کا سچا خادم ہے وہ کبھی تعریف کا بھوکا نہیں ہو سکتا، اور اگر اسے تعریف کی بھوک ہے تو وہ سخت نالائق ہے۔ تعریف کے بجائے آپ نے اگر اپنے ایڈریس میں اپنے خادم کی خامیاں بتائی ہوتیں تو انھیں دور کرنے میں ملے کچھ مدد ملتی۔

اور آپ نے تعریف بھی کی تو کتنی۔" ایبٹ آباد کی پبلک ہی نہیں بلکہ ایبٹ آباد کا سورج، چاند اور تارے بھی اس اشتیاق میں تھے کہ مجھ جیسی ہستی یہاں کب تشریف آور ہو گی"۔ تو کیا میں یہ سمجھوں کہ چاند، تارے دودھا یا سیو گرام میں اور ہیں اور ایبٹ آباد میں اور۔

(مجمعے میں سے ایک آواز ———) ہم سے غلطی ہوئی معاف کیجئے۔

گاندھی جی ——— ابھی سے ؟ کان پکڑو، توبہ کرو (تقریر کو جاری رکھتے ہوئے) کاٹھیاواڑ میں ایک جماعت

"چارن" یعنی بھاٹوں کی ہوتی ہے۔ ان کا پیشہ ہی یہ ہوتا ہے کہ رئیسوں کی تعریفیں گا گا کر پیسے بٹوریں۔ خیر میں آپ کو بھاٹ تو نہیں کہوں گا۔"

(مجمعے میں سے پھر ایک آواز) مگر ہمیں تو ایڈریس پیش کرنے کے لئے الٹی روپے کی تھیلی ساتھ دینی پڑی ہے!"

گاندھی جی:۔ خیر یہ تو مذاق کی بات تھی۔ میں یہاں دوبارہ آؤں گا تو ایڈریس سے پہلے بادشاہ خاں سے پوچھوں گا کہ کیا یہاں کے لوگ ابھی بھی نئے نئے سورج اور ستارے بنانے والے ہیں؟ بات یہ ہے کہ عام جلسوں میں اکثر لوگ تماشہ دیکھنے کو آجاتے ہیں۔ مگر میں ایک ستر سال کا بوڑھا کیوں تماشوں میں اپنا وقت ضائع کروں؟ زندگی کے جو دن باقی ہیں انھیں خدا کی بندگی اور خدمت میں کیوں نہ صرف کروں؟

میں جب سے اس صوبے میں آیا ہوں عدم تشدد کے بارے میں اپنے دل کی بات خدائی خدمت گاروں سے بغیر کسی قسم کی کمی بیشی کے کہتا رہا ہوں۔ مجھے عدم تشدد کا پورا علم نہیں اور مجھے کیا کسی کو بھی نہیں۔ یہ علم تو صرف خدا ہی کو حاصل ہے میں جو سمجھ سکا یا برت سکا وہ حقیقت کا محض ایک کرشمہ ہے مگر میں نے اپنی زندگی کے پچاس سال اس چیز کی مسلسل اور جان توڑ کوشش میں صرف کئے ہیں۔ میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں

کہ جتنا آپ اس چیز کو جانتے ہیں، میں اس سے کچھ زیادہ ہی جانتا ہوں، اس میں شک نہیں خدائی خدمت گاروں نے جس حد تک عدم تشدد کو سمجھا ہے اس پر عمل کر کے ایک خوبصورت اور روشن مثال دنیا کے سامنے قائم کی ہے اور ساری دنیا کا خراج تحسین حاصل کیا ہے مگر اب انھیں ایک قدم اور آگے بڑھانا ہے۔ اگر اس آنے والے امتحان میں پورا اترنا ہو تو انھیں اپنے عدم تشدد کا تصور اور بھی وسیع کرنا ہوگا۔ اور میدانِ عمل میں اس کے تعمیری پہلو پر اور بھی زیادہ زور دینا ہوگا۔ ان کے ہر فعل میں اس کی جھلک دکھائی دینی چاہیئے۔ عدم تشدد کے معنی صرف تلوار کو چھوڑنا ہی نہیں، نہ یہ بزدل یا کمزور کا ہتھیار ہے۔ ایک لڑکے کے ہاتھ سے اگر میں لاٹھی چھین لوں تو وہ نہتا ہو جائے گا۔ مگر اس سے اس میں عدم تشدد کی صفت نہیں پیدا ہو جائے گی۔ جس میں لاٹھی چلانے کی طاقت ہی نہیں وہ عدم تشدد کی طاقت کو کیا پہچانے گا؟ عدم تشدد کی طاقت تیر و تفنگ کی طاقت سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ جس شخص نے یہ محسوس نہیں کیا کہ عدم تشدد حیوانیت کی طاقت سے بدرجہا بہتر اور موثر ہے اس نے اس ہتھیار کی خوبی کو سمجھا ہی نہیں۔ مگر عدم تشدد زبان سے نہیں سکھایا جا سکتا۔ یہ تو خدا کی دین ہے۔ اس کی رحمت سے اس کا ظہور بندگی کرنے والے کے دل میں خود بخود ہوتا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ آج ایک لاکھ خدائی خدمت گار موجود ہیں اور انھوں نے

عدم تشدد کو اپنا عقیدہ بنالیا ہے۔ مگر بادشاہ خاں نے ۱۹۲۵ء
ہی میں جب پرامن عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی اور خدائی
خدمت گار کا نام تک نہ تھا کہہ دیا تھا کہ لوگ مانیں یا نہ مانیں مگر
مجھے تو بلند سے بلند طاقت مل گئی ہے، اٹھارہ سال کے ذاتی تجربے
نے ان کا یہ یقین اور بھی پکا کر دیا ہے۔ انھوں نے دیکھ لیا ہے کہ
کس طرح اس نے پٹھانوں کی طاقت کو بڑھا دیا ہے اور ان کو بہادری
سکھا دی ہے۔ ایک زمانہ تھا بیس پچیس روپے کی نوکری کھونے کے ڈر
سے وہ کانپتے تھے۔ محلے میں ایک انگریز افسر یا سپاہی آجاتا
تھا تو ان کی روح خشک ہو جاتی تھی۔ عدم تشدد کی تحریک سے
یہ سارا نقشہ بدل گیا ہے۔ آج میرے اس ستر سالہ قلب میں
عدم تشدد کا اعتقاد اور بھی بڑھ گیا ہے۔ لوگ مجھ سے کہتے ہیں
کہ تمھارے عدم تشدد کا پروگرام تو اٹھارہ سال سے ملک کے سامنے
ہے۔ مگر آزادی کہاں ہے۔ میرا جواب ہے کہ اگرچہ کروڑوں آدمی
عدم تشدد کے نام کی دہائی دیتے ہیں۔ مگر اس پر عمل بہت کم نے ہی
کیا ہے۔ انھوں نے بھی اسے بطور عقیدے کے نہیں بلکہ صرف پالیسی
کے طور پر اپنایا ہے تو بھی جو نتیجہ اس سے نکلا ہے اس نے میری
ہمت بڑھا دی ہے اور میں نے خدائی خدمت گاروں کو اس کام کے لئے
تیار کرنے کا قدم اٹھایا ہے۔ خدا نے چاہا تو اس میں ضرور
کامیابی ہوگی۔

گاندھی جی ۹ نومبر کو سیگاؤں روانہ ہو گئے۔ راستے میں انھوں نے ٹیکسیلا کے مشہور و معروف آثار قدیمہ کی سیر کی۔ یہ سیر ایسے وقت کی گئی جب جلائی کی گھڑی سر پر کھڑی تھی۔ چار ہفتے تک مل جل کر عدم تشدد کی منزلیں طے کرنے کے بعد گاندھی جی کو بادشاہ خاں اور ان کے جاں باز خدائی خدمت گاروں سے اور زیادہ انس ہو گیا تھا۔ بادشاہ خاں گاندھی جی کے ساتھ مل کر اپنے کام کے آئندہ پروگرام کی تفصیلات طے کر رہے تھے اور انھیں یہ افسوس تھا کہ ان نئی ذمہ داریوں کی وجہ سے جو وہ اپنے اوپر لے رہے تھے ان کی اس پرانی آرزو کے پورے ہونے کی کوئی اُمید نہیں رہی کہ شوال اور سوات کی پہاڑیوں کے لاابالی سیلانیوں کی طرح چکر لگائیں میں نے انھیں کہتے ہوئے سنا "مہاتما جی جب سے آپ آئے ہیں میں خدائی خدمت گاروں سے یہ کہہ رہا ہوں کہ تم نے غریبوں کی مدد کا بیڑا اٹھایا ہے مگر ان کے افلاس کو دور کرنے کے لئے کیا کیا ہے۔ تم نے حلف اُٹھایا ہے کہ اپنے مخالفوں سے کبھی بدلہ نہ لوگے مگر تم نے ان کے پاس جا کر محبت سے ان کا دل ہاتھ میں لینے کی بھی کوشش کی ہے"

انھوں نے گاندھی جی کو کئی واقعات سنائے جو ان پر گذر رہے تھے اور جن سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ان میں عدم تشدد کی روح کس قدر سرایت کر گئی ہے۔ ایک بار ایک مسلمان پنجابی ان کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ان حضرت نے مجھے اس بات پر سخت سست

کہنا شروع کیا کہ میں نے پٹھانوں کو عدم تشدد کی تلقین کر کے اسلامی روح کو کچل دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ بات بے سمجھے بوجھے کہہ رہے ہیں۔ اگر آپ اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ عدم تشدد کے پیام نے پٹھانوں میں کیا حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا ہے اور انھیں قومی اتحاد کا ایک نیا خواب دکھا دیا ہے تو آپ ایسی باتیں کبھی نہ کہتے۔ میں نے قرآن کی آیتوں کا حوالہ دے کر یہ ثابت کیا کہ اسلام نے امن پسندی پر بہت زور دیا ہے اور اُسے اپنی تعلیم کا سنگ بنیاد بنایا ہے۔ میں نے انھیں مثالیں دے کر یہ بھی سمجھایا کہ تاریخ اسلام کی سب سے بڑی شخصیتیں زیادہ تر ضبط و عمل میں مشہور تھیں کہ تند خوئی اور جنگ جوئی میں میرا جواب سُن کر وہ چپ رہ گئے۔" انھوں نے بتایا کہ ایک اور موقع پر یہ الزام لگایا گیا کہ انھوں نے ایک لاکھ خدائی خدمت گاروں کا لشکر اس غرض سے جمع کیا ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے کچلنے میں مدد دیں"۔ مجھے کئی دوستوں نے یہ رائے دی کہ اس صریح بہتان کی تردید شائع کروں۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ میں نے ان سے کہا ابھی میں صوبہ سرحد کے عوام تک اچھی طرح نہیں پہنچ سکا ہوں میں جو کچھ اُن سے کہوں گا وہ اُسے اس وقت تک غالباً ویسی ہی زبانی جمع خرچ کی بات سمجھیں گے، جیسی دوسرے کہا کرتے ہیں۔ جب تک ہماری بے غرض خدمت ان کی آنکھیں نہ کھول دے۔ اس لئے ابھی مجھے اور انتظار کرنا چاہیئے۔" انھوں نے گاندھی جی کو ترک موالات کے زمانے کا صو

سرحد کا ایک واقعہ سنایا جو عدم تشدد کی ایک شاندار داستان معلوم ہوتی ہے۔ چارسدہ میں خدائی خدمت گاروں نے ایک عام جلسے کا انتظام کیا تھا۔ تھوڑی دیر میں فوج آ پہنچی اور اس نے انھیں منتشر ہو جانے کا حکم دیا۔ انھوں نے اس کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ اس پر لاٹھی چارج اور پھر گولی چلانے کا حکم دیا گیا۔ لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ لوگ ٹس سے مس نہ ہوئے جہاں بیٹھے تھے وہیں بیٹھے رہے فوج والے حیران رہ گئے۔ انھیں جوشیلے پٹھانوں سے اس خاموش عزم و استقلال کی توقع نہ تھی۔ چند فیر کرنے کے بعد انھوں نے گولی چلانا بند کر دیا۔ ان کے آس پاس بہت بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ بادشاہ خان کا بھتیجہ سعد اللہ خاں بھی وہاں موجود تھا۔ فوج کمانڈنگ افسر نے اس سے پوچھا "آخر تم کیا چاہتے ہو" سعد اللہ نے جواب دیا "کچھ نہیں" اس پر فوجی افسر نے کہا "اچھا تو ہم جاتے ہیں، ہمیں راستہ دو" وہ لوگ چلے گئے، اور اتنے بڑے مجمع میں کسی نے انھیں چھیڑا تک نہیں۔

پندرھواں باب

پشاور کی کھادی کی نمائش

عدم تشدد کے منصوبے میں کھادی اور گھریلو صنعتوں کو جو اہمیت حاصل ہے اس کے پیش نظر گاندھی جی پشاور کی کھادی کی نمائش کے افتتاح کے لئے تیار ہو گئے۔ صوبہ سرحد میں یہ اپنے قسم کی پہلی نمائش تھی جس کا انتظام کل ہند چرخہ سنگھ کی پنجابی شاخ نے کیا تھا۔ اس نمائش کو حکومت سرحد کی پوری مدد اور اشتراک حاصل تھا۔ جن لوگوں نے مخصوص طور سے مدد کی ان میں وزیر صنعت اور محکمہ صحت، صنعت، زراعت اور جیل کے حکام شامل تھے خدائی خدمت گاروں نے ایک رضا کاروں کا دستہ مہیا کیا۔ تمام وزیر اور شہر کے بہت سے آدمی خاص طور سے عورتیں نمائش دیکھنے آئے تھے۔

وزیر اعظم ڈاکٹر خان صاحب اور کھادی سنگھ کی پنجابی شاخ کے نمائندے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو نے کھادی سنگھ کا تعارف

کرواتے ہوئے کچھ ایسی باتیں کہیں جن پر ہمیں غور کرنا چاہیئے۔

انھوں نے بتایا کہ ہندوستان اور برما میں کھادی سنگھ کے چھ سے زیادہ صنعتی مرکز اور بھنڈار ہیں۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں ۲۹ ۰۲۹ گاؤں میں اس کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں مگر سنہ ۱۹۳۷ء میں ان کی تعداد ۱۰۲۸۰ تک پہنچ گئی۔ اور سال رواں (سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء) میں کم از کم ۲۰۰۰۰ ہوگئی۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں ۱۱۳۴۸۹ بننے اور کاتنے والے اس میں کام کرتے تھے۔ مگر سنہ ۳۷ء میں ان کی تعداد ۱۹۱۰۹۴ تک پہنچ گئی اور سال رواں (سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء) میں یہ تعداد ۰۰۰۰۰ لہ ہوگئی۔ سنہ ۳۶ء میں مجموعی پیداوار ۲۴۰۶۹۵۷۲۳ گز اور سنہ ۳۷ء میں ۳۰۱۵۳۳۹ تھی مگر امسال ۳۰ جون تک کی پیداوار ۲۴ لاکھ روپے سے زیادہ ہے اور یقین ہے کہ ۵۰ لاکھ تک ہوجائے گی۔ سنہ ۳۷ء میں ۷ لاکھ روپے مزدوری دی گئی تھی مگر امسال اس کی دوگنی سے زیادہ مزدوری دی جائے گی۔ بمبئی اور احمد آباد کے مل جن کا سرمایہ ۵۰ کروڑ سے زیادہ ہے صرف ۱۷۵۰۰۰ مزدوروں کو کام دے سکے۔ اس کے مقابلے میں کل ہند چرخہ سنگھ نے جس کا سرمایہ صرف ۲۵ لاکھ ہے ۱۶۰۰۰۰ مزدوروں کو کام پر لگایا (اس میں سے وہ مزدور شامل نہیں جو مصدقہ مرکزوں میں کام کرتے ہیں) اس کے علاوہ ایک چرخے کی قیمت صرف ایک سے تین روپے تک ہے۔ جس کے ذریعے ایک مزدور کو کام

دیا جا سکتا ہے۔ مگر مل میں ایک مشین کی تکلی ساٹھ روپے میں آئی ہے اور چونکہ ایک آدمی ایک وقت میں ۲۰۰ تکلیاں چلا سکتا ہے اس لئے مل میں ایک آدمی کو کام دینے کے ۱۲۰۰۰ روپئے چاہیئے۔

مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ سول نافرمانی کے دلانے میں کھادی کی تحریک نے ہمارے ملک کو اپنی ضروریات خود پوری کرنے کی منزل کی طرف کتنی تیزی سے بڑھنے میں مدد دی۔ سول نافرمانی سے پہلے سنہ ۲۱-۲۰ء میں ہندوستانی ملوں نے ۸۵ کروڑ مربع گز کپڑا تیار کیا جس کی قیمت ۶۳ کروڑ روپیہ تھی۔ سنہ ۲۱-۲۰ء میں تحریک سول نافرمانی شروع ہونے کے بعد اس کی تعداد ۱۷۳ کروڑ مربع گز تک پہنچ گئی۔ سنہ ۲۸-۲۷ء میں ۲۴۴ کروڑ مربع گز اور سنہ ۳۱-۳۰ء میں ۲۵۶ کروڑ مربع گز تک اس کے مقابلے میں ولایتی کپڑا سنہ ۲۱-۲۰ء میں ۱۴۱ کروڑ مربع گز آیا جس کی مجموعی قیمت ۸۰ کروڑ روپیہ تھی سنہ ۲۲-۲۱ء میں یہ گھٹ کر ۹۸ کروڑ گز رہ گیا جس کی قیمت ۴۰ کروڑ روپیہ ہوئی۔ سنہ ۳۰-۲۹ء میں یہ پھر بڑھ کر ۱۴۴ کروڑ گز ہو گیا۔ لیکن سنہ ۳۱-۳۰ء میں سول نافرمانی کے شروع ہونے کے بعد گھٹ کر ۸۱ کروڑ مربع گز رہ گیا۔ سنہ ۳۲-۳۱ء میں اس کی تعداد ۶۹ کروڑ مربع گز تھی۔

اس سے بھی زیادہ جاذب توجہ وزیر اعظم ڈاکٹر خان صاحب کا وہ جواب تھا جو انھوں نے ان لوگوں کو دیا جو اس ادارہ پر فرقہ پرستی کا الزام لگاتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے معترضین کہتے

ہیں کہ چرخا سنگھ تو صرف ایک ہندو ادارہ ہے مگر مندرجہ ذیل اعداد و
شمار سے معلوم ہو گا کہ اس کے ماتحت تمام فرقوں کے لوگ بلا کسی تفریق
کے کام کرتے ہیں۔

	کاتنے والے	بُننے والے	کل تعداد
ہندو	۱۰۷۱۵۰	۵۵۲۹	۱۱۲۶۷۹
مسلمان	۵۰۲۳۸	۳۸۶۲	۵۴۱۰۰
ہریجن	۱۵۹۴۰	۳۷۰۲	۱۹۶۴۲
دوسرے فرقے	۳۳۵		۳۳۵
کل	۱۷۳۶۶۳	۱۳۰۹۳	۱۸۶۷۵۶

حالانکہ ابھی بہت کم لوگ کھادی پہننے کے عادی ہوئے ہیں اس
کے باوجود اپنی تیرہ سالہ زندگی میں سنگھ نے ۴۰۰۰۰۰۰ روپے مزدوری
میں تقسیم کئے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ اگر سب یا ہندوستانیوں کی اکثریت
کھادی پہننے لگے تو اس کا نتیجہ کتنا اچھا ہو۔ اس کے بعد پنجاب کی غیر
کانگریسی حکومت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر خاں صاحب نے کہا کہ پنجاب
کی حکومت نے جو کانگریسی حکومت نہیں ہے حالات سے مجبور ہو کر
قحط سالی سے بچنے کے لئے اپنے یہاں کھادی کو رواج دیا ہے حصار
میں کتائی کے مرکز بنانے کے لئے انھوں نے ۲۵ ہزار روپیہ منظور
کیا ہے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ اس رقم کو اور بڑھانے والے ہیں۔
وہ دن دور نہیں ہے کہ جب مشکوک سے مشکوک طبیعت

انسانوں کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہماری اقتصادی بدحالی کا تنہا علاج چرخہ ہے - اخیر میں ڈاکٹر خاں صاحب نے صوبہ سرحد کے ہر ہر گاؤں اور قصبے میں ایک کھادی کا مرکز بنانے کی پرزور اپیل کی -

گاندھی جی نے اپنے تحریری ہندوستانی پیغام میں جو چھاپ کر تقسیم کیا گیا تھا سودیشی کے متعلق کئی چبھتے ہوئے جملے لکھے تھے انھوں نے کہا کہ نام سے دھوکا نہ کھانا چاہیئے - اگر ایک جاپانی کپڑے پر سودیشی لکھ دیا جائے تو وہ سودیشی نہیں ہو جاتا - ہم تو صرف اس مال کو سودیشی کہیں گے جو ہندوستان میں بنے اور اس کے بنانے والے یہاں کے لاکھوں غریب دیہاتی ہوں - اس میں جو کچا مال استعمال ہو اس کو بھی ہندوستانی ہونا چاہیئے - اس معیار پر صرف کھادی ہی پوری اترتی ہے - بقیہ کپڑے تو سودیشی کو بدنام کرتے ہیں جس طرح سورج کے بغیر صبح نہیں ہو سکتی ، ویسے ہی کھادی کے بغیر سودیشی کی تعریف مکمل نہیں ہو سکتی - اس طرح دیکھئے تو پشاور سودیشی کے دوڑ میں بہت پیچھے ہے - یہاں صرف ایک کھادی بھنڈار ہے اور وہ بھی خسارہ میں چل رہا ہے مجھے اُمید ہے کہ اس نمائش کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ کھادی بھنڈار کی بنیادیں مضبوط ہو جائیں گی اور اس کے بند ہو جانے کا امکان نہ رہے گا - نمائش کی افتتاح کرتے ہوئے گاندھی جی نے اپنی تقریر میں سرحد کے وزیر دل اور اسمبلی کے کانگریسی ممبروں کو کھادی نہ پہننے پر کھری کھری سنائیں

انھوں نے کہا ڈاکٹر گوپی چند نے وزیروں کی امداد کا شکریہ ادا کیا ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ نہ تمام وزیر اور نہ تمام کانگریسی ممبر کھادی پہننے کے عادی ہیں کچھ صرف اسمبلی میں کھادی "پہنتے" ہیں۔ کچھ تو اتنا بھی نہیں کرتے۔ یہ کانگریس کے آئین کے خلاف ورزی ہے۔ ابھی تو سُرخ قمیضوں کو بھی کھادی کا بننا ہے۔ اگر سب کھادی پہننے لگے تو یہ ایک لاکھ کتنی جلدی تمام صوبے کے لوگوں کو کھادی پہنوا دیں گے۔ اس صوبے میں کھادی بنانے کے لئے فطری ذرائع بہت زیادہ ہیں۔ مگر جہاں تک کھادی پہننے کا تعلق ہے یہ سب سے پیچھے ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ سب لوگ اس نمائش میں اگر مطالعہ کریں اور اپنی معلومات بڑھائیں مشینی صنعت کے بر خلاف کھادی کی پیداوار بڑھانے کے لئے نہ لاکھوں روپے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ زیادہ تکنیکی کی معلومات کی۔

یہ نمائش ایک اسکول کی عمارت میں ہوئی تھی جسے دروازوں اور جھنڈیوں سے بہت سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ میزوں اور بنچوں کو ملا کر دوکانیں اور اسٹال بنائے گئے تھے۔ اسکول کے اس حصے میں جہاں کھادی کی نمائش ہو رہی تھی۔ دیواروں پر کھادی کی اقتصادی حیثیت سے متعلق سبق آموز کتبے آویزاں کئے گئے تھے کھادی کے مختلف اقسام کی قیمتوں اور اس کے پیداوار کے اخراجات کا تجزیہ کر کے اعداد و شمار کے ذریعے یہ دکھایا گیا تھا کہ کھادی میں

منافع خوری کے مواقع نہیں۔ کھادی کے نئے نئے نمونے جنھیں اندھرا کے باریک کپڑے سے لے کر شمالی ہند کی دبیز پلنگ کی چادر جن تک کوٹ کے کپڑوں سے لے کر ساڑیوں تک اور ہر قسم کی چھینٹ اور چھپے ہوئے کپڑے ہندوستان کے تمام حصوں سے لا کر شامل کئے گئے تھے۔ مقامی صنعتوں میں قسم قسم کے اونی کپڑے، منقش چوغے اور سوات کے کمبل شامل تھے۔ یہ کمبل ضلع ہزارا اور چترال کی وادی کاگان میں بنے جاتے ہیں، اور نہایت سستے ہیں۔ ان مقامات پر نرم اون پیدا ہوتا ہے جس سے یہاں گرم کپڑے کی صنعت کی ترقی کے بہت مواقع ہیں۔ آخری دن عورتوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس روز کھادی کی نمائش گاہ میں اتنی عورتیں آئیں کہ ایک خاصہ ہنگامہ بپا ہو گیا وہ ہزاروں کی تعداد میں آئیں۔ ان میں سے بہت سی پنسل اور کاپیاں لے کر آئیں اور کھادی کے متعلق جو کتبہ آویزاں کئے گئے تھے وہ نقل کر لئے گئیں۔ بکری امید سے کہیں زیادہ ہوئی۔

عورتوں کے سیکشن کا تمام کپڑا ختم ہو گیا اور تار کے ذریعے پنجاب سے منگوانا پڑا اس دوران میں چھپے ہوئے مردانے صافے، زنانہ کپڑوں کی جگہ فروخت کئے گئے۔

نمائش میں کھادی کے حصے کے بعد جس حصے میں لوگوں کو زیادہ دلچسپی تھی وہ صنعتی حصہ تھا۔ جہاں کھادی بنانے کے طریقے دکھائے جاتے تھے۔ لوگوں نے ایک نئے قسم کے تکلے میں زیادہ دلچسپی لی

جس کی قیمت صرف پانچ آنے تھی۔ مگر اس کے لگانے سے معمولی پنجابی چرخے کی گردش پچاس سے لے کر ایک سو چالیس تک بڑھ جاتی تھی۔

ایک اور حصے میں کاغذ سازی اور گنے کے رس اور تاڑی سے گڑ بنانے کے طریقے دکھائے جاتے تھے۔ حکومت کے محکمہ جات صحت، زراعت اور صنعت بھی اپنی اپنی چیزیں نمائش میں لائے تھے۔ ایک صاف ستھرے بالترتیب گاؤں کے مٹی کے ماڈل کے مقابلے میں ایک گندے اور بے ترتیب گاؤں کا ماڈل بنا کر فرق دکھایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ دیہاتی مکان باغ اور کھیت کے بھی مٹی کے ماڈل بنائے گئے تھے۔

نمائش میں داخلہ مفت تھا۔ جیسا کہ گاندھی جی نے بتایا یہ طریقہ غلط تھا۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی رقم کی ادائیگی ایک صحت مند دلچسپی پیدا کرنے کی باعث ہوتی ہے۔ پہلے دن اتنے لوگ آئے کہ سوائے عورتوں کے سب کا داخلہ بند کر دینا پڑا۔ اس کے باوجود لوگ دروازے اور کھڑکیاں توڑ کر اندر داخل ہو گئے۔ چھ دن میں ۴۰۰ روپے سے زیادہ کی کھادی فروخت ہوئی۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ پچھلے بیس سال میں مقامی کھادی بھنڈار کی سالانہ بکری کبھی بھی ۱۰۰۰ روپے سے زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ یہ عجیب بات تھی۔

ریلوے گاڑی اور جنگی وغیرہ کے اخراجات کے علاوہ نمائش پر ۲۰۲ روپے خرچ ہوئے۔ ان میں سے کتبوں، خاکوں اور دوسرے آرائش کے سامان کی قیمت منہا کر لینی چاہیے۔ کیونکہ یہ سامان نمائش کے ساتھ ختم نہیں ہو گیا۔

سولھواں باب

"جس کے تخیل میں ماضی کا نقشہ ہو وہ مستقبل کی تصویر نہیں دیکھ سکتا۔"
(رفائیل سبیٹینی)

ٹیکسلا

(۱)

گاندھی جی نے اپنا سرحد کا دورہ ختم کرنے کے بعد ٹیکسلا سٹیشن سے وردھا روانہ ہونے سے پہلے ٹیکسلا کے کھنڈروں کی سیر کی۔ اس کے بغیر ان کا دورہ نامکمل رہ جاتا جس طرح اس بات کے سمجھنے کے لئے کہ خدائی خدمت گاروں کی عدم تشدد کی تحریک کوئی سطحی اور عارضی چیز نہیں بلکہ ایک ارتقائی منزل ہے جو ان کی معاشرتی زندگی کے اندرونی تقاضے سے پیدا ہوئی ہے۔ بادشاہ خاں اور ان کے خدائی خدمتگاروں کے ساتھ چار ہفتے مل جل کر رہنے کی ضرورت تھی۔ اسی طرح پٹھانوں کے متعلق ایک عالمگیر غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ٹیکسلا جانا لازمی تھا۔ بعض نکتہ چینوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ عدم تشدد صوبہ سرحد میں ایک خارجی چیز ہے۔ اور وہ یہاں کے ناسازگار ماحول میں پنپ نہیں سکتا۔ ان لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ ایک ہزار سال تک اس خطے میں بودھ مت

کا دور دورہ رہا ہے۔ وادی سوات، وادی کابل اور اس کے آگے افغانستان سے ختن تک کے علاقے میں آج بھی قدم قدم پر اسٹوپ خانقاہیں، ستون اور بودھ مت کی دوسری یادگاریں باقی ہیں۔ جو زبانِ حال سے اپنی داستان سناتی ہیں۔ ٹیکسلا اور گندھارا ہی کے راستے سے شمالی بودھ مت چین تک پھیلا تھا اور جب آج کل "خدائی خدمت گار خیال، قول اور فعل میں عدم تشدد کی پابندی کے حلف نامے پر دستخط کرتا ہے تو وہ گویا اپنے ان بزرگوں کی تقلید کر رہا ہے جو ٹیکسلا قدیم کے گوشۂ عافیت میں چین کے ان جانری طالب علموں کے ساتھ جو صحرائے گوبی کو پار کر کے آتے تھے، بیٹھ کر غصّے کو تحمل سے دبانے کے مسئلے کے پراسرار معنی پر غور کیا کرتے تھے

سر جان مارشل (SIR JOHN MARSHAL) نے اور ان سے پہلے کرین کرافٹ (CRANCRAFT) ڈیل میرک (DELMERICK) اور کننگھم (CUNNINGHAM) نے جو محض شوقیہ آثار قدیمہ کی تحقیقات کرتے تھے اس کام میں جو محنت کی ہے اس کی بدولت ہم آج صدیوں پیچھے جا سکتے ہیں اور تھوڑے سے تخیل سے کام لے کر صوبہ سرحد کی تاریخ کے اس دل کش دور کا جیتا جاگتا نقشہ دیکھ سکتے ہیں۔ راول پنڈی سے بیس میل شمال مغرب میں ٹیکسلا اسٹیشن کے مشرق اور شمال مشرق کی طرف تین الگ الگ شہروں کے آثار ہیں یہ تینوں قدیم ٹیکشاشیلا

کے کھنڈر ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف مقامات پر از سرِ نو تعمیر ہوتا رہا
مہابھارت میں جنم جے کی سانپ کی قربانی کے سلسلے میں ٹیکسا شیلا
کا ذکر آیا ہے۔ ایرین (ARRIAN) نے اس کا ذکر ایک عظیم الشان
اور خوش حال یونیورسٹی ٹاؤن کی حیثیت سے کیا ہے "دراصل
یہ ان سب شہروں میں جو انڈس (INDUS) اور ہیڈسپیس
(HYDASPAS) (جہلم) کے درمیان واقع ہیں سب
سے بڑا شہر تھا اور اس زمانے میں اور اس کے بعد صدیوں تک
علوم و فنون کے مرکز کی حیثیت سے شہرت رکھتا تھا۔"

ان تین شہروں کے کھنڈروں کے علاوہ کچھ اور متفرق آثار
زیادہ تر بودھ، استوپ اور خانقاہیں۔ جو اس سارے خطّے
میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے گاندھی جی نے جولیاں کی بودھ
خانقاہ کے کھنڈر کو دیکھا۔ یہ خانقاہ تین سو فٹ اونچی پہاڑ کی
چوٹی پر واقع ہے اور کسی زمانے میں بودھ سنگھ کے لوگوں اور
جاتری طالب علموں کے لئے جنھوں نے "عیش و راحت سے
منہ موڑ کر کلفت و مشقت کی زندگی بسر کرنے کا" حلف اٹھایا
تھا، بہترین گوشۂ عافیت تھی۔ اس کا اس اونچی پہاڑی پر واقع
ہونا جہاں سے دور دور تک کا منظر نظر آتا ہے، اس کی خاموشی
اور تنہائی اور اس کی "ٹھنڈی اور گرد و غبار سے پاک" ہوا
ان لوگوں کے ذوق جمال کو تسکین دیتی ہوگی جو اپنے گیان دھیان

کے لئے پاک اور بے داغ فطرت کی صحبت کو ناگزیر سمجھتے تھے۔ یہ یادگار ایک خانقاہ اور دو استوپوں کے چبوتروں پر جو مختلف سطحوں پر واقع ہیں مشتمل ہے۔ استوپوں کے چبوترے کھلے مربعے میدان ہیں جن کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنی ہیں جن میں مورتیاں رکھی جاتی تھیں۔ خانقاہ کے کھلے چوک کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں ہیں جو مراقبے اور مطالعے کے لئے استعمال ہوتی تھیں یہاں سے ہم وہ باورچی خانہ جہاں یہ لوگ کھانا کھاتے تھے۔ رسوئی، کھلنے کا کمرہ۔ پہاڑی کے نیچے کنوئیں جہاں سے پانی آتا تھا اور وہ پگ ڈنڈیاں دیکھ سکتے ہیں جن سے یہ لوگ قریب کے شہر سرسکھ میں بھیک مانگنے جایا کرتے تھے۔ کوٹھریوں میں گھڑے اور پانی پینے کے آب خورے آج تک اسی طرح رکھے ہوئے ہیں جیسے اب سے دو ہزار برس پہلے رکھے تھے۔ اس خانقاہ میں گندھارا آرٹ کے بعض بہترین نمونے ملتے ہیں جو اب تک بہت اچھی حالت میں ہیں۔ اس سے تھوڑی دور کے فاصلے پر سرکاپ کے آثار کھود کر نکالے گئے ہیں۔ یہ ان تین مقامات میں سے دوسرا مقام ہے جہاں ٹیکسا شیلا کا شہر دوسری صدی قبل مسیح کے شروع میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے گرد ایک پتھر کی دیوار ہے جس کا گھیر چھ ہزار گز اور چوڑائی پندرہ سے لے کر بیس فٹ تک ہے۔ یہ شہر پہاڑی سے لے کر وادی تک پھیلا ہوا ہے اور اس کے

احاطے کے اندر سلسلۂ ہتھیال کی تین کھڑی چٹانیں ہیں اور ایک چھوٹی پہاڑی ہے جو سب سے الگ واقع ہے۔ یونانیوں کے بیان کے مطابق یہ شہر وسعت میں نینوا کے برابر تھا اور اس میں ایک سورج کا مندر اور ایک شاہی محل تھا۔ اس کا نقشہ موزوں اور سڈول ہے۔ سڑکیں اس زمانے کے یونانی شہروں کی طرح تنگ اور بے قاعدہ ہیں۔ مکانوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ دیکھنے میں ایک منزل کے معلوم ہوتے تھے لیکن اصل میں ان میں زمین کے اندر بھی ایک منزل ہوتی تھی۔ ۶۳۰ء میں ہیون سانگ نے اس شہر کو اور اس کے آس پاس بودھ مت کے معبدوں کو اچھی خاصی حالت میں دیکھا تھا۔ بودھ آرٹ اور تہذیب موریا سلطنت کے زمانے میں عروج کو پہنچی اور ۴۵۵ء کے بعد ہن قوم کی ظالمانہ تاخت و تاراج سے برباد ہو گئی۔

میوزیم میں ان باقیات کو دیکھ کر جو کھدائی سے حاصل کی گئی ہیں، انسان بڑی آسانی سے اس زندگی کا ہو بہو تصور کر سکتا ہے جو ان سڑکوں پر چلنے والے اور ان مکانوں میں رہنے والے کسی زمانے میں بسر کرتے تھے ——— ان کے لباس کا، پیتل کے برتنوں کا جس میں وہ کھانا کھاتے اور پکاتے تھے، وہ چکیاں، اوکھلیاں اور تین چار فٹ اونچی مٹی کی گولیں جو یہاں صحیح و سالم پائی گئیں، بالکل ویسی ہی ہیں جیسی کہ آج ہندوستان

کے گاؤں میں استعمال ہوتی ہیں اور اگر کوئی چپکے سے ان میں ادل بدل کر دے تو کسی کو کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔ ایک عجائب گھر میں مٹی کے کھلونے، گاڑیاں، سپاہی اور سادھو نظر آئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی ان بچوں کے ہاتھوں نے جو اُن سے کھیلتے تھے اُن کو چھوا ہے۔ اگر آج کوئی گاؤں کا بچّہ ان کو دیکھے تو یہ کہے گا کہ کسی نے میرے کھلونے چُرا لئے۔ وہ برتن وغیرہ۔ اور دوسرا سامان جو گھر یلو رسموں میں استعمال ہوتا تھا نظروں کو ایسا مانوس معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایچ۔ جی۔ ویلز کی "وقت کی مشین" کا ایک چکر ہمیں تین ہزار سال قبل کے ان لوگوں کے گھروں میں پہنچا دے جہاں یہ رسمیں ہو رہی ہوں تو ہم بغیر اجنبیت کے جھجک کے ان میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اُن کی زینت اور آرائش کی چھوٹی چھوٹی چیزیں کنگھے، آئینے، استرے وغیرہ چھوٹی چھوٹی سیندور کی ڈبیاں، سرمے کی سلائیاں، اور چاندی سونے کے زیورات بھی زمانے کے ہاتھوں ہم تک پہنچے۔ گاندھی جی کو میوزیم کے نگراں نے چاندی کے بھاری کڑوں کا ایک جوڑا دکھایا تو محبت کے جذبے سے ان کا دل بھر آیا اور ایک ٹھنڈا سانس کھینچ کر انھوں نے کہا "یہ تو ہو بہو ویسے ہی ہیں جیسے میری ماں پہنتی تھیں۔"

ہمارے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر ان لوگوں کے خیالات اور عقائد اور رسم و رواج کیا تھے۔ اسٹریبو ایرین

(STRABO'ARRYAN) اور دوسرے یونانی فاضلوں نے
جو سکندر کی فوج کے ساتھ آئے تھے اپنے زمانے کے ان رسوم و
قوانین کا حال لکھا ہے۔ ان سب میں بھی بودھ مت کے اہنسا کے
عقیدے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس نظام معاشرت میں انفرادی
آزادی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ایرین لکھتا ہے کہ بہت سی عجیب
رسموں میں جو ہندوستان میں رائج ہیں، ایک رسم قدیم حکمار
کے زمانے سے چلی آئی ہے، اور حقیقت میں بہت قابل تعریف
ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قانون کی رو سے کوئی شخص کسی حال میں بھی
دوسرے کا غلام نہیں ہو سکتا ہر شخص خود آزاد ہوگا اور دوسرے
کے حق آزادی کا بھی احترام کرے گا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ وہی
لوگ جو نہ تو دوسروں پر حکومت کرتے ہیں اور نہ اُن کی خوشامد
کرتے ہیں۔ ایسی زندگی گذار سکتے ہیں جو تقدیر کے نشیب و فراز
کا مقابلہ کر سکے۔ اس لئے کہ جب دولت کی غیر مساوی تقسیم جائز
رکھی گئی ہے تو انصاف کا تقاضا ہے کہ ایسے قانون بنائے
جائیں جن کی پابندی بلاتفریق سب پر لازم ہو۔
غیر ملکیوں اور اجنبیوں کی خاطر مدارات کا خاص اہتمام تھا
اور ان کی حفاظت کی اسی طرح ضمانت کی جاتی تھی، جیسے ملکیوں
کی حفاظت کی۔ بعض افسر خاص طور پر اس کام کے لئے مقرر
کئے گئے تھے کہ غیر ملکیوں کا خیال رکھیں اور ان کے ساتھ کوئی

زیادتی نہ ہونے دیں۔ اگر ان میں سے کوئی بیمار ہو جائے تو یہ لوگ اس کے دیکھنے کے لیے طبیب کو بھیجتے ہیں اور اس کی ہر طرح دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اگر وہ مر جائے تو اُسے دفن کراتے ہیں اور اس کی چھوڑی ہوئی املاک اس کے رشتہ داروں کو پہنچا دیتے ہیں عدالت کے حاکم ان مقدمات کے فیصلے میں جن کا تعلق غیر ملکیوں سے ہو۔ بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ اور جو لوگ اُن سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہیں اُن سے وہ بہت سختی سے پیش آتے ہیں۔

سود خواری کا نام تک نہ تھا اور قوانین میں لمبی چوڑی مقدمے بازی کی گنجائش نہ تھی۔ ایک پرانی عبارت میں جو میک کرنڈل نے ڈھونڈھ کر نکالی ہے لکھا ہے "ہندوستانی نہ تو سود پر روپیہ قرض لیتے ہیں اور نہ دیتے ہیں۔ ہندوستان کے دستور کے مطابق نہ کوئی شخص دوسرے کے ساتھ زیادتی کرتا ہے اور نہ اپنے اوپر زیادتی ہونے دیتا ہے۔ اس لیے ان کو نہ معاہدے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ضمانتوں کی"

ایک اور ٹکڑا یہ ہے "ہندوستانیوں میں جو شخص قرضہ یا امانت واپس نہ دے سکے اس کے لئے کوئی قانونی تدبیر نہیں ڈ یہی کر سکتا ہے کہ اپنے آپ کو کوسے کہ کیوں ایک بد معاش پر بھروسہ کیا"

طب کا اچھا خاصا رواج تھا لیکن مہلک اور خصوصاً متعدی بیماری کو لوگ ایک قسم کی ناپاکی اور جسمانی فساد سمجھتے تھے اور اس کا علاج یہی سمجھا جاتا تھا کہ بیمار اپنے ہاتھوں اپنا خاتمہ کرلے۔ ہندوستانی حکیم کلا لونس جو معتوب ہو گیا تھا سکندر کی ہندوستان سے واپسی کے وقت اس کے ساتھ تھا جب سخت بیچش میں مبتلا ہوا تو اس نے چتا میں جل کر جان دے دی۔ حالانکہ سکندر اس کو بہت خوشامد سے روکتا رہا۔ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں علاج دواؤں سے زیادہ غذا کے اعتدال سے کیا جاتا تھا۔ سب سے اچھا علاج مرہم اور پلاسٹر کا استعمال سمجھا جاتا تھا۔ علاج کے اور طریقے بڑی حد تک مضر سمجھے جاتے تھے۔

لڑائی بالکل موقوف تو نہیں ہوئی تھی مگر صرف سپاہیوں کے طبقے تک محدود تھی۔ کاشتکاروں کا طبقہ "جو اوروں سے تعداد میں کہیں زیادہ تھا" جنگی خدمت اور دوسری عمومی خدمات سے مستثنیٰ تھا۔ حملہ آور دشمن کو اگر کوئی کسان کھیت میں کام کرتا ہوا ملے تو اُسے نہیں چھیڑتا تھا۔ اس لئے کہ اس طبقے کے لوگ جو خلق خدا کے محسن سمجھے جاتے تھے ہر طرح کے نقصان سے محفوظ تھے۔ زمین تباہی سے بچی رہتی تھی۔ فصلیں اچھی ہوتی تھیں اور لوگوں کی ضرورت کی سب چیزیں جو زندگی کو خوشگوار بناتی ہیں۔ میسر تھیں۔

رپورٹ کا حسب ذیل بیان آج کل کے سرحدی پٹھانوں کے متعلق اوپر کے بیان کی صدائے بازگشت معلوم ہوتا ہے "اس خطے کے پٹھان باہمی لڑائیوں کے سلسلے میں ایک دوسرے کے زرعی مزدوروں کو یا عورتوں بچوں، مہمانوں اور اجنبیوں کو کبھی نہیں ستاتے اس مثال سے وہ لوگ سبق لے سکتے ہیں جنہیں برتر تمدن کے مالک ہونے کا دعوےٰ ہے"۔

یہاں سے دور پاٹلی پتر میں معاشیات کا ماہر کوٹلیہ جو اپنے جنم بھوم ٹیکسلا سے ہجرت کر کے گیا تھا۔ ایک ایسے معاشی نظام کی بنیاد ڈال رہا تھا جس میں ادنیٰ تر کا بھی اتنا ہی لحاظ رکھا جاتا تھا جتنا اعلیٰ تر کا۔ اس کے ارتھ شاستر کا یہ ٹکڑا سنئے:۔

"ان عورتوں کے لئے جو اپنے گھروں سے نہیں نکل سکتیں جن کے شوہر پردیس گئے ہیں، جو چلنے پھرنے سے معذور ہیں اور ان لڑکیوں کے لئے جو اپنی روزی کمانے پر مجبور ہیں (سوت کاتنے کا) کام عزت کے ساتھ کتائی کے مرکزوں کی ملازمہ عورتوں کی معرفت مہیا کرنا چاہیے جو عورتیں خود کتائی کے مرکز میں جا سکتی ہیں ان کے لئے ایسا انتظام ہونا چاہیے کہ صبح تڑکے اپنا سوت دے کر اجرت لے سکیں۔ وہاں صرف اتنی روشنی ہو کہ سوت کے تار نظر آ جائیں۔ اگر داروغہ ان عورتوں کی طرف یا کسی اور معاملے کے متعلق گفتگو کرے تو اسے سخت سزا ملنی چاہیے۔ اجرت کی ادائیگی میں دیر یا بغیر کام کے

تکمیل ہونے کے اجرت دے دی جائے تب بھی وہ سزا کا مستوجب ہے۔

نصف صدی بعد ٹیکسلا میں اشوک کے فرمانوں کا دور دورہ تھا جن میں سے بعض آج بھی شہباز گڑھ میں موجود ہیں۔ ہم ان کے کچھ ٹکڑے نقل کرتے ہیں جو آج دنیا کی قوموں کے لئے دستور العمل کا کام دے سکتے ہیں :-

"نیکی کرنا مشکل ہے، لیکن کرنے والے اس مشکل کام کو کر ڈالتے ہیں...... اپنی تخت نشینی کے سترہ سال بعد میں نے دھرم مہا ماتر مقرر کئے۔ ان کا کام یہ ہے کہ چھتریوں اور برہمنوں، امیروں غریبوں اور بوڑھوں۔ یونانیوں، افغانوں اور دوسری سرحدی قوموں کے لوگوں سے ملیں۔ وہ اس شخص کو جس کے پاؤں میں زنجیر ہے تسکین دیتے ہیں۔ اس کی راہ سے رکاوٹوں کو دور کرتے ہیں اور اس کو رہائی دلاتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کے بال بچے ہیں جن کا اسے پیٹ بھرنا ہے وہ مکر و فریب کا شکار ہے اور اس کی کمر بڑھاپے سے جھک گئی ہے۔"

عدل و انصاف کے متعلق یہ ہدایت ہے :-

"میں نے یہ کیا ہے ہر وقت اور ہر جگہ کھانے کے وقت، سونے کے وقت، زنانے میں، خلوت خانے میں، باغ کی آرام گاہ میں، وہ افسر جن کا کام ہے کہ مجھے اپنی رعایا کی خبر دیں میرے پاس آتے ہیں اور میں اپنے فرائض انجام دیتا ہوں۔ چنانچہ میں نے حکم دیا ہے

کہ یہاں کہیں بھکشوؤں کی کسی مجلس میں اختلاف یا جھگڑا ہو تو مجھے فوراً اطلاع دی جائے۔ اس لئے کہ عدل و انصاف کے معاملے میں جتنا اہتمام کیا جائے کم ہے .... رفاہ عام کی جڑ مستعدی اور عدل گستری ہے ...... میری ساری کوششوں کا ایک ہی مقصد ہے .... کہ جو ذمہ داری مجھ پہ اپنی رعایا کی طرف سے عائد ہوتی ہے۔ اُسے پورا کر دوں !!

ذیل کی سرحدی پالیسی ہمارے حکمرانوں کی توجہ کی مستحق ہے اس پر عمل کرنے کی جتنی ضرورت آج ہے کبھی نہ تھی۔ "یہ مذہبی کتبہ اس مقصد سے کھدوایا گیا ہے کہ ہمارے بیٹے اور پوتے یہ نہ سمجھیں .... کہ جو فتح تلوار سے حاصل کی جاتی ہے وہ فتح کہلانے کی مستحق ہے۔ تاکہ انھیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ تشدد اور تباہی کے سوا کچھ نہیں .... تاکہ غیر مفتوح سرحدی علاقے مجھ سے ڈریں نہیں بلکہ مجھ پر اعتماد کریں اور انھیں مجھ سے رنج نہ پہنچے بلکہ راحت !!

اور ان میں سب سے زیادہ شاندار ذیل کی ہدایت ہے جو مذہبی رواداری کے متعلق ہے :-

"یہ سچ ہے کہ مختلف فرقوں کے نزدیک مختلف نیکیاں اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن ان کی ایک مشترک بنیاد ہے اور وہ حلم اور نرم گفتاری ہے۔ چنانچہ کسی شخص کو یہ نہیں چاہئے کہ اپنے فرقے کی بہت زیادہ

تعریف کرے اور دوسروں کی تحقیر کرے۔ ان کو خواہ مخواہ برا نہیں
کہنا چاہیے۔ بلکہ ہر موقع پر ان کا وہ احترام کرنا چاہیے جس کے وہ
مستحق ہیں۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو دوسروں کی بھلائی کے ذریعے
اپنے فرقے کا بھلا کرتا ہے۔ لیکن اگر اس کے خلاف کرتا ہے، تو
دوسروں کو نقصان پہنچاتا ہے اور اپنے فرقے کو کوئی فائدہ نہیں
پہنچاتا۔ جو کوئی شخص اپنے فرقے کی محبت میں اور اس کی ترقی کے
خیال سے اس کو بہت بڑھاتا اور دوسروں کو گراتا ہے اور اصل
خود اپنے فرقے کو صدمہ پہنچاتا ہے۔ اس لئے ثواب صرف اس میں ہے
کہ آپس میں اتفاق ہو۔ ہر شخص دوسروں کے عقیدے سے رواداری
برتے اور سچے دل سے برتے"

آخر میں میں ایک اور ہدایت نقل کرتا ہوں جس پر ہندو مسلم
اتحاد اور گئو رکھشا کے حامیوں کو غور کرنا چاہیے۔ "لوگوں میں مذہب
دو طریقوں سے رواج پاتا ہے۔ ایک تو مقررہ ضابطوں کے ذریعوں
سے اور دوسرے مذہبی جذبات کے ذریعے سے جو ان کے دل میں پیدا
کیے جائیں۔ ان دونوں میں سے مقررہ قاعدے کچھ زیادہ قدر و قیمت
نہیں رکھتے۔ کامیابی در اصل اسی سے ہوتی ہے کہ دل میں مذہبی روح
پیدا کی جائے۔ مقررہ قاعدے وہ احکام ہیں جو میں جاری کرتا ہوں
_____ مثلاً بعض جانوروں کو ذبح کرنے کی ممانعت
یا بعض مذہبی ہدایات جو میں نے بہت سے لوگوں کے لئے جاری

کی ہیں۔ لیکن صرف دلی جذبات میں انقلاب پیدا کرنے ہی کے ذریعے مذہب جیو رکھشا کو رواج دینے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس خیال سے میں نے کتبہ شائع کیا ہے تاکہ وہ میرے بیٹوں اور پوتوں کے وقت تک باقی رہے......... کیونکہ صرف اس طریقے سے انسان دنیا میں اور آخرت میں سچی خوشی حاصل کر سکتا ہے۔ جہاں کہیں یہ فرمان پتھر کے ستونوں پر کھدا ہوا ہے، خدا کرے ہمیشہ باقی رہے۔"
ظاہر ہے کہ اس پر ہر انسان آمین کہے گا۔

سترھواں باب

ٹیکسلا

(۲)

سکندر اعظم کے ماتحت یونانیوں کے ہندوستان پر حملہ کرنے کی داستان میں تاریخ ہند کے بہت سے دلچسپ حاشیے ملتے ہیں لیکن غالباً ان میں سب سے زیادہ دلچسپ وادی ٹیکسلا میں مقدونیہ اور ہندوستان کے حکیموں کی ملاقات کا قصہ ہے جسے مختلف یونانی مورخوں نے تفصیل سے لکھا ہے۔ اس قصے کی اہمیت اس کے تمثیلی پہلو کی وجہ سے ہے۔

جنگ میں فریقین کو بہادری دکھانے کے بڑے بڑے موقع ملے جس کا دونوں نے اعتراف کیا۔ راجہ پورس (جس کو یونانی پوروس کہتے ہیں) لڑائی ہار گیا لیکن جو کچھ اس نے میدانِ جنگ میں کھویا تھا اپنی ہمت اور استقلال کی بدولت اس سے زیادہ حاصل کرلیا جب سکندر نے اس سے پوچھا کہ فاتح کو مفتوح کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے تو اس نے جواب دیا "اس سبق کو سامنے

رکھ کر جو آج کے دن حاصل ہوا ہے۔ جب کہ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دولت و اقبال کتنی جلدی خاک میں مل جاتا ہے"! مورخ لکھتا ہے کہ سکندر اس تیکھے جواب سے اس سے زیادہ خوش ہوا جتنا کہ وہ لجاجت سے ہوتا

میدان جنگ میں یونانیوں کو کامیابی ہوئی اور سکندر کی طاقت نے ہر ایک کو مغلوب کر لیا۔ لیکن اس عالم گیر فاتح سے کچھ نہ بن پڑی۔ جب اُسے اُن لوگوں سے مقابلہ پڑا جنھوں نے اُسے اپنی حاضر جوابی کی قابلیت سے چکر میں ڈال دیا اور پھر ایک ایسا شخص ملا جس نے نہتا ہونے کے باوجود اپنی روح کو ایسی سپر بنا لیا جس پر دنیا کا کوئی ہتھیار اثر نہیں کر سکتا تھا۔

پشاور کے قریب سکندر نے دس سنیاسیوں کو گرفتار کیا جنھوں نے راجا سنبھاس کو اس کے مقابلے پر آمادہ کیا تھا، اور "دوسرے طریقے سے بھی اہل مقدونیہ کو نقصان پہنچایا تھا" یعنی عام طور پر لوگوں میں مزاحمت کی ایسی روح پیدا کر دی تھی جو کسی طرح دبائی نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے اُن کے سامنے چند مشکل مسئلے حل کرنے کے لئے پیش کئے اور یہ کہا "جو شخص سب سے کمزور جواب دے گا اس کو پہلے قتل کیا جائے اور ترتیب وار دوسروں کو"!

اس نے پہلے شخص سے پوچھا "تمھارے خیال میں کون تعداد میں زیادہ ہیں۔ زندے یا مردے؟" اس نے جواب دیا "زندے"! اس

لئے کہ مردوں کا تو وجود ہی نہیں۔" دوسرے سے پوچھا" کہاں زیادہ جانور ہیں سمندر میں یا زمین پر؟" اس نے جواب دیا" زمین پر اس لئے کہ سمندر اسی کا ایک حصہ ہے۔" تیسرے سے پوچھا گیا" کون جانور سب سے زیادہ ہوشیار ہے؟" اس نے کہا" جس سے انسان واقف نہ ہو۔" چوتھے سے پوچھا کہ" سمبھاس کو کس وجہ سے مقابلے پر آمادہ کیا" اس نے جواب دیا" اس لئے کہ میں چاہتا تھا وہ عزت سے جئے اور عزت سے مارا جائے۔" پانچویں سے پوچھا "تمہارے خیال میں کون پہلے تھا، دن یا رات؟" اس نے کہا "دن، ایک دن پہلے تھا۔" بادشاہ یہ سن کر متعجب ہوا تو اس نے کہا" مہمل سوالوں کا جواب بھی مہمل ہونا چاہئے۔" اب سکندر چھٹے کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے پوچھا" آدمی کس طرح ہردلعزیز ہو سکتا ہے؟" اس نے جواب دیا" اس کے پاس بہت بڑی طاقت ہو مگر وہ اس کی کوشش نہ کرے کہ لوگ اس سے ڈریں۔" اب جمنسپا سی باقی رہ گئے تھے، ان میں سے ایک سے پوچھا" انسان دیوتا کیوں کر بنتا ہے؟" جواب ملا" ان کاموں کو کرنے سے جو انسان نہیں کر سکتا۔" دوسرے سے پوچھا" دونوں میں سے کون زیادہ طاقت ور ہے زندگی یا موت؟" اس نے کہا" زندگی اس لئے کہ وہ اتنی بہت سی برائیوں کا بوجھ اٹھاتی ہے۔" آخری شخص سے پوچھا" آدمی کے لئے کتنے دن تک زندہ رہنا مناسب ہے۔" اس نے جواب دیا

تھے جب تک وہ زندہ رہنے کو مرنے پر ترجیح دے۔" اب سکندر نے جج کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ تم فیصلہ کرو۔ جج نے کہا کہ سب نے ایک سے بدتر جواب دئے ہیں۔ سکندر نے کہا "اگر تمھارا یہ فیصلہ ہے تو سب سے پہلے تم ہی کو قتل کرنا چاہیئے۔ اس نے کہا "نہیں اے بادشاہ اگر ایسا ہوا تو آپ کا قول غلط ہو جائے گا۔ اس لئے کہ آپ نے کہا تھا کہ جو شخص سب سے بدتر جواب دے گا اُسے پہلے قتل کیا جائے گا۔"

ٹیکسلا پہنچ کر سکندر کو یہ شوق پیدا ہوا کہ ان دانش مندوں میں سے ایک اس کے ساتھ رہے اس لئے کہ اس کو ان کا صبر استقلال اور جفاکشی بہت پسند تھی۔ اونیسکریٹس (ONESIKRITOS جو دیقیانوس کے مذہب کا ایک فلسفی تھا بادشاہ کا پیام لے کر ڈنڈا میس (DANDAMIS) کے پاس گیا جو اس علاقے کے سنیاسیوں کا گرو تھا۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ میں اس ہندوستانی حکیم سے زیادہ دل کش شخصیت کوئی نہیں تھی۔ اس میں ساوانرولا (SALA YAROLA) کا ساخلوص ٹیلی مے چس (TELMACHOULS) کی سی صاف گوئی اور ان دونوں سے بڑھ کر دانش مندی اور روحانیت تھی۔ مسلسل ریاضت سے اس نے مکمل ضبط اور تجرد کا وہ درجہ حاصل کر لیا تھا جس کے آگے بادشاہوں کی شان و شوکت ماند پڑ جاتی تھی اور اپنشد کا یہ جملہ یاد آجاتا تھا "وہ حکیم جس نے برہمہ کی معرفت حاصل

کر لی ہے۔ خوف کا نام تک نہیں جانتا۔" شاہی پیام بر نے اس جید حکیم کو جنگل میں پتوں کے بستر پر لیٹا ہوا پایا اور اس سے گفتگو شروع کی۔

حکیم کی گفتگو کا منشا یہ تھا کہ سب سے بہتر فلسفہ وہ ہے جو انسان کے نفس کو رنج و راحت سے آزاد کر دے۔ رنج اور محنت میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر انسان کے لئے مضر اور آخر الذکر مفید ہو۔

اس پر انیسکریٹس نے کہا کہ فیثاغورث نے بھی اس قسم کی تعلیم دی تھی اور اپنے شاگردوں کو ترک حیوانات کی ہدایت کی تھی اور سقراط اور دیو جانس کا بھی یہی خیال تھا۔ ڈنڈامیس نے جواب دیا کہ میں ان بزرگوں کو اور تو ہر لحاظ سے دانش مند سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ ان کی غلطی تھی کہ "رسم و رواج کو فطرت پر ترجیح دیتے تھے" ورنہ وہ انتہائی سادگی کی زندگی بسر کرتے اور سادہ غذا کھانے سے نہ شرماتے تھے" اس لئے کہ سب سے اچھا مکان وہ ہے جسے سب سے کم مرمت کی ضرورت ہو۔" اس کے بعد انیسکریٹس نے اپنے آنے کی غرض بیان کی اور کہا "اے برہمنوں کے گرو۔ زلیس دیوتا کا بیٹا سکندر جو سب انسانوں کا شہنشاہ ہے۔ تم کو اپنے ہاں بلاتا ہے۔ اگر تم اس کے حکم کی تعمیل کرو گے تو وہ تمہیں بہت بڑا صلہ دے گا۔ لیکن تم نے انکار کر دیا تو وہ تمہارا سر کٹوا دے گا۔"

حکیم نے مسکراتے ہوئے اس کی پوری بات سنی اس

نے پتوں کے بستر سے سر تک نہ اُٹھایا۔ بلکہ لیٹے لیٹے جواب دیا کہ اگر سکندر زلیس کا بیٹا ہے تو میں بھی ہوں۔ مجھے اس سے کسی چیز کی ضرورت نہیں، جو کچھ میرے پاس ہے وہی بہت ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ جو لوگ سکندر کے ساتھ ہیں وہ بے کار سمندر اور خشکی میں گھومتے پھرتے ہیں اور ان کا چکر کبھی ختم ہی نہیں ہوتا"۔ پھر اس نے بہت حقارت سے کہا "جاؤ سکندر سے کہہ دو کہ شہنشاہ خدا ہے جو کبھی ظلم نہیں کرتا، بلکہ روشنی کا، امن کا، زندگی کا، پانی کا اور انسان کے جسم و روح کا خالق ہے۔ جب موت ان کو آزاد کر دیتی ہے یہ خدا سے مل جاتی ہیں۔" جو مرض اور فساد سے بری ہے۔ وہی خدا میری اطاعت کا سزاوار ہے جو خوں ریزی سے نفرت کرتا ہے اور لوگوں کو لڑائی کے لئے نہیں اکساتا۔ سکندر خدا نہیں ہے۔ اس لئے کہ اسے خود فنا کا جام پینا ہے۔ بھلا ایسا شخص دنیا کا مالک کیسے کر ہو سکتا ہے، جو ابھی تک سب ملکوں کو فتح نہیں کر سکا۔

"اس کے علاوہ کیا سکندر نے آخرت کی زندگی کا مسئلہ حل کر لیا ہے؟ وہ نہ تو اب تک زندہ ہیڈلیس یعنی یم لوک میں داخل ہوا ہے اور نہ یہ جانتا ہے کہ زمین کے اندرونی حصے میں سورج کا راستہ گیا ہے۔ ان قوموں نے جو سطح ارض پر رہتی ہیں کبھی ان کا نام تک نہیں سنا۔ اگر اس کی موجودہ قلمرو اس کے حوصلے سے کم ہو تو گنگا کے پار چلا جائے۔ اگر ادھر کے علاقے میں اس کی سمائی نہیں ہے

تو ادھر اس کو ایسا خطہ نظر آئے گا جس میں اس کی ساری فوج سما جائے گی۔

"تم یہ جان لو کہ جو انعام و اکرام مجھے دینے کا وعدہ کرتا ہے ان کی میری نظر میں کوئی قیمت نہیں۔ میں جن چیزوں کی قدر کرتا ہوں اور جنھیں مفید سمجھتا ہوں وہ یہ پتے ہیں جو میرے لئے گھر کا کام دیتے ہیں۔ یہ ہرے بھرے پودے ہیں جن سے مجھے کھانا ملتا ہے اور یہ پانی ہے جو میں پیتا ہوں۔ ان کے علاوہ اور سب چیزیں اور وہ املاک جو بڑی مشکل سے جمع کی جاتی ہے۔ جمع کرنے والے کے لئے تباہی کا باعث ہوتی ہے۔ اس سے سوا رنج اور تکلیف کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جوگی فانی انسان کے لئے یوں ہی کچھ کمی نہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں جنگل میں پتوں کے بستر پر لیٹ جاتا ہوں اور چونکہ میرے پاس کچھ نہیں جس کی حفاظت کرنی ہو اس لئے بڑے چین سے سوتا ہوں۔ لیکن اگر میرے پاس نگہبانی کرنے کے لئے کچھ ہوتا تو میری نیند اُڑ جاتی۔ زمین مجھے سب کچھ دے دیتی ہے، اسی طرح جیسے ماں بچے کو دودھ پلاتی ہے۔ میں جہاں جی چاہتا ہے جاتا ہوں۔ مجھے کوئی فکر نہیں جسے خواہ مخواہ لادے لادے پھروں۔

اگر سکندر میرا سر بھی کاٹ دے تو میری روح کو برباد نہیں کر سکتا میرا جسم سر سے الگ ہو کر خاموش ہو جائے گا۔ اور میرا جسم پھٹے ہوئے لباس کی طرح زمین پر رہے گا اور اسی مٹی میں مل جائے گا
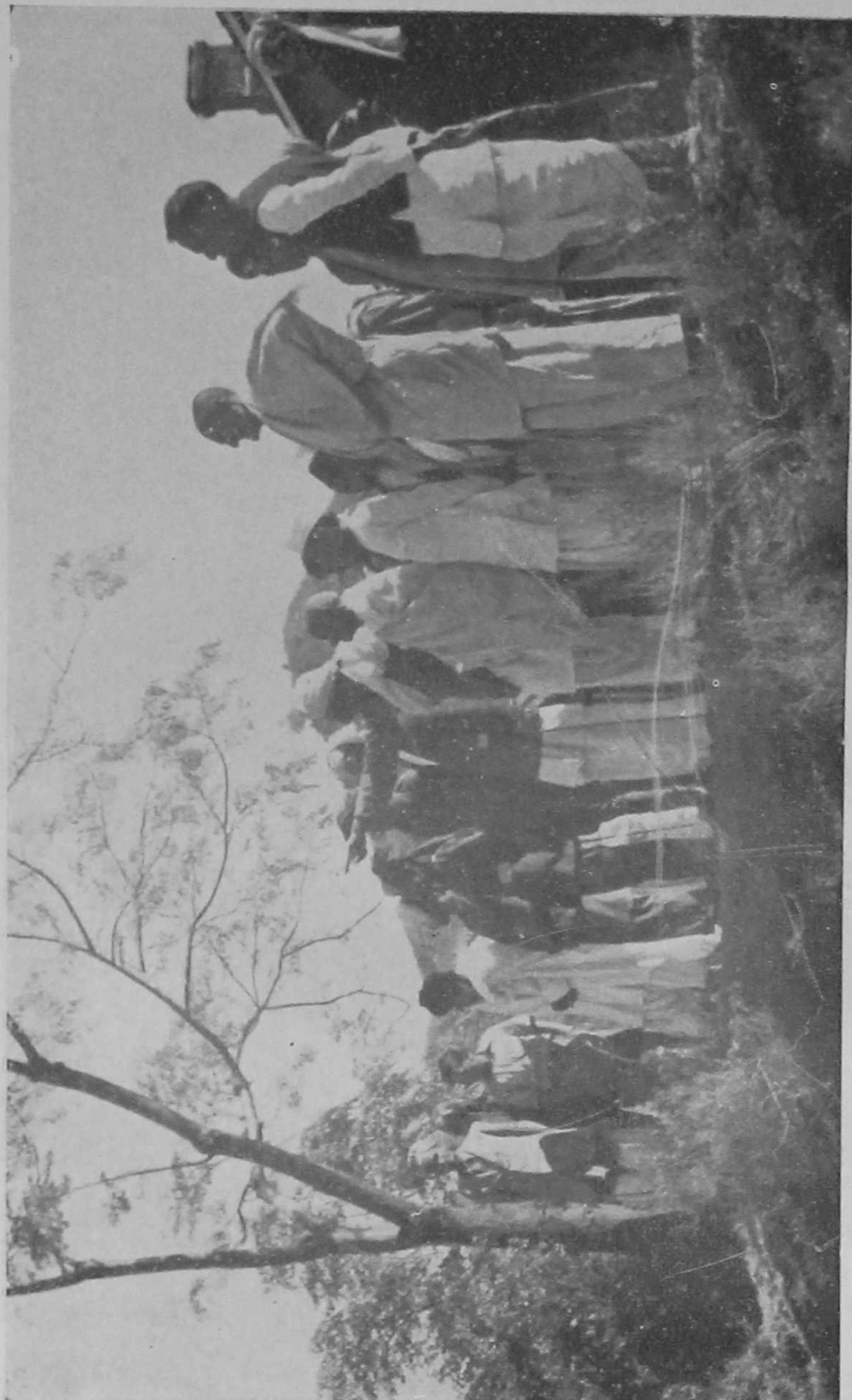
جس سے وہ پیدا ہوا تھا مگر میں روح بن کر اپنے خدا کے پاس چلا جاؤں گا جس نے مجھے جسم خاکی عطا کر کے زمین پر بھیجا تھا تاکہ وہ اس کا امتحان کرے کہ آیا ہم اس دنیا میں اس کے احکام کی پابندی کرتے ہیں یا نہیں۔ جب ہم یہاں سے رخصت ہو کر اس کے پاس جائیں گے تو وہ ہم سے ہماری زندگی کا حساب لے گا۔ وہ ہر سرکشی اور ظلم کا انتقام لینے والا ہے۔ مظلوم کی آہیں ظالم کے لئے سزا بن جاتی ہیں۔

سکندر یہ دھمکیاں ان لوگوں کو دے جو مال اور دولت کے طلب گار ہیں اور موت سے ڈرتے ہیں۔ ہمارے خلاف یہ دونوں ہتھیار بے کار ہیں۔ اس لئے کہ برہمنوں کو نہ روپے کا لالچ ہے نہ موت کا خوف۔

پس تم سکندر سے جا کر یہ کہہ دو کہ ڈنڈا میس کو تم سے کچھ نہیں چاہیئے۔ اس لئے وہ تمھارے پاس نہیں آیا۔ اگر تم اس سے کچھ چاہتے ہو تو خود اس کے پاس چلے جاؤ۔"

مورخ لکھتا ہے کہ سکندر کو انڈیسکریٹوس سے ملاقات کا حال سُن کر ڈنڈا میس سے ملنے کا اور زیادہ اشتیاق پیدا ہو گیا۔ یہ وہ بوڑھا اور برہنہ حریف تھا جس سے بہت سی قوموں کے فاتح سکندر نے زک اُٹھائی۔

اٹھارھواں باب

خاتمہ

(مطلع پر بادل چھا گئے)

واقعات کی رفتار کو دیکھتے ہوئے اس کی ضرورت پیش آئی کہ کتاب کے آخر میں ایک خاتمہ کا اضافہ کیا جائے اور اسے اُس کے غیر متوقع اور افسوس ناک انجام تک پہنچایا جائے۔ اس منصوبے کے مطابق جو بادشاہ خاں نے گاندھی جی کے مشورے سے بنایا تھا انھوں نے سرداریاب میں خدائی خدمت گاروں کی ٹریننگ کے لئے ایک مرکز قائم کیا، ان کی درخواست پر گاندھی جی نے پہلے شریمتی میرابین (مس سلیڈ) اور پھر بی بی امۃ السلام کو دیہ ایک مسلم خاتون ہیں۔ جو اُن کے آشرم میں داخل ہوئی تھیں اور جنھیں وہ اپنی بیٹی کی طرح سمجھتے تھے) اس غرض سے بھیجا کہ وہ بادشاہ خاں کو ان کے کام میں خاص طور پر مسلمان عورتوں کی تعلیم اور معاشرتی اصلاح میں مدد دیں۔ ۱۹۳۹ء میں گاندھی جی پھر صوبہ سرحد گئے

لیکن اس عرصے میں ان کی صحت بہت بگڑ گئی تھی اور وہ اضلاع کا دورہ نہیں کر سکے یہاں تک کہ خدائی خدمت گاروں کے مرکز میں بھی نہیں جا سکے۔ اس لئے انھیں اپنے اور بادشاہ خاں کے اس ارادے کی تکمیل کو آئندہ کے لئے ملتوی کرنا پڑا کہ پٹھانوں اور خدائی خدمتگاروں کے ساتھ جا کر رہیں اور انھی بہادروں کا عدم تشدد سکھانے کا تجربہ کریں۔ مگر افسوس کہ اس کی کبھی نوبت نہ آ سکی۔

۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو انگلستان اور فرانس نے محوری طاقتوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ۲۲ اکتوبر کو کانگریس نے حکومت چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور ورکنگ کمیٹی نے صوبوں کی کانگریسی وزارتوں کو ہدایت کی کہ وہ ان دو باتوں کے خلاف احتجاج کے طور پر استعفا دے دیں ——— ایک یہ کہ ہندوستان کو اس کی رضامندی کے بغیر جنگ میں شریک کر دیا گیا اور دوسرے یہ کہ برطانوی حکومت نے اس اصول کو جس کے لئے وہ جنگ کرنے کا دعوے کرتی تھی ہندوستان پر عائد کرنے سے مسلسل انکار کیا۔ اس ہدایت کے مطابق صوبہ سرحد کی کانگریسی وزارت نے ۷ نومبر کو استعفا دے دیا، جو ایک ہفتہ کے بعد منظور کر لیا گیا۔ اس استعفا کے بعد کوئی دوسری وزارت نہیں بن سکی اور ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ ۹۳ کے مطابق صوبے پر گورنری راج مسلط کر دیا گیا۔ یہ الجھن مئی ۱۹۴۳ء تک جاری رہی۔ ۱۴ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء

کو باعزت سمجھوتے کی ساری کوششوں کے ناکام ہونے کے بعد کانگریس
نے گاندھی جی کی رہنمائی میں انفرادی سول نافرمانی کی تحریک شروع
کی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان جنگی کوششوں میں حصہ نہ
لے اور تقریر کی آزادی کا حق دیا جائے۔ اس کے بعد واقعات
کی رفتار بہت تیز ہو گئی جس کا نقطۂ عروج اگست ۱۹۴۲ء کی
"ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک تھی۔

بادشاہ خان اس وقت کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے
جب اس نے پونا کے اجلاس میں جنگی کوششوں میں مشروط تعاون
کی پیش کش کی اور گاندھی جی کو اپنے اہنسا کے اصول کی بنا
پر اس سے الگ ہونا پڑا۔ بادشاہ خان نے اسی بنا پر استعفا دے
دیا۔ ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک کے دوران میں وہ گاندھی جی
اور دوسرے ممتاز کانگریسیوں کے ساتھ گرفتار کر کے جیل میں
ڈال دیے گئے۔ گاندھی جی اپریل ۱۹۴۴ء میں چھوڑ دیے گئے۔

اس عرصے میں صوبہ سرحد میں نقشہ بدل گیا تھا۔ اورنگ زیب
وزارت جس نے مئی ۱۹۴۳ء میں گورنر نے کانگریسی وزارت کی جگہ مقرر
کیا تھا اور جو اپنے آپ کو صرف اس طرح قائم رکھے ہوئے تھی کہ اس نے
قانون ساز مجلس کے مخالف ممبروں کو گرفتار کر کے جیل میں
ٹھونس دیا تھا، اپنے لالچ، نالائقی اور بے ایمانی کی وجہ سے
بے حد غیر مقبول ہو گئی تھی۔ ۱۲ مارچ ۱۹۴۵ء کو ایک عدم اعتماد کے

رزولیوشن کی بنا پر یہ وزارت ٹوٹ گئی ، اور ڈاکٹر خاں صاحب کی
کانگریسی وزارت نے اس کی جگہ لے لی۔ اس کا سب سے پہلا یہ کام
تھا کہ اس نے بادشاہ خاں ، خدائی خدمت گاروں اور دوسرے
سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا۔

مارچ ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ ڈیلی گیشن ہندستان آیا اور مئی میں
مرکزی اسمبلی اور صوبوں کی مجالس کے انتخابات ہوئے۔ بادشاہ خاں
نے ان انتخابات میں حصہ لیا، لیکن ان کا مقصد ووٹ حاصل کرنا
نہیں بلکہ ووٹروں کو تعلیم دینا تھا۔ وہ ان سے کہتے تھے "میں ووٹ
مانگنے نہیں آیا ہوں، اس لئے کہ میرے نزدیک یہ ووٹ اور موجودہ
اسمبلیاں کوڑی کام کی نہیں۔ میں تو تمھارے لئے یہ ہندوستانہ
پیام لایا ہوں کہ اس آزادی کو جس کے لئے تم برسوں سے لڑ رہے ہو
حاصل کرو۔ تم آزادی کی دہلیز تک پہنچ گئے ہو......... اس موقع
سے فائدہ اٹھاؤ، اب کی بار اسے نہ کھوؤ۔"

انتخابات کے بعد نئی منتخب شدہ کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کے
ممبروں سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا "تم جانتے ہو کہ اب
تک میں نے وزارت کے یا اس کے کام کے معاملے میں براہِ راست
کوئی حصہ نہیں لیا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ مجھے ان چیزوں سے
مطلق دلچسپی نہیں......... اب......... دوستوں نے مجھے
سمجھایا ہے کہ پارلیمنٹری پروگرام بھی غریبوں کی خدمت کا ایک طریقہ

ہے ایک اور موقع پر کراچی میں انھیں پبلک کی طرف سے جو ایڈریس دیا گیا اُس میں "سلطان" کے لقب سے خطاب کیا گیا۔ انھوں نے اس کا جواب اپنے مخصوص انداز سے دیا۔ "بھائیو .... میں اس ایڈریس کے لئے آپ کا شکر گذار ہوں۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ تم نے مجھے "سلطان" کہا .... ہماری خدائی خدمت گاروں کی تحریک سلطانوں کے پیدا کرنے کے لئے نہیں ہے، تم جانتے ہو کہ سلطان کے معنی بادشاہ کے ہیں، اور لفظ بادشاہ .... سب کہیں عوام کے لئے .... افلاس اور مصیبت کے معنی رکھتا ہے .... جب تم سلطانوں کا ذکر کرتے ہو تو در اصل خدائی خدمت گار تحریک کے بنیادی اصول سے انحراف کرتے ہو۔"

اکتوبر ۱۹۴۶ء میں گاندھی جی نواکھلی روانہ ہوئے تاکہ اس طوفان کے بعد جو دو قوموں کے نظریئے کے حامیوں نے فرقہ وارانہ نفرت کی تلقین سے برپا کیا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان میں طلائی کا سنہری پل باندھیں، نواکھلی کے بعد اس قسم کے فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ ہندوستان کے اور حصوں میں بھی شروع ہو گیا یعنی بہار، کلکتہ، یو، پی اور اس کے بعد پنجاب، صوبہ سرحد کے ضلع ہزارہ اور سندھ میں۔ اس سے خان بھائیوں کے دل ہل گئے، لیکن ان کا عقیدہ اور زیادہ مضبوط اور واضح ہو گیا۔ جنوری

۱۹۴۷ء میں بادشاہ خان گاندھی جی کے امن کے مشن میں ان کا ساتھ دینے کے لئے بہار گئے۔ ان کا وقار، توازن، چٹان کی سی مضبوطی انسانی فطرت کی بنیادی، نیکی کا عقیدہ اور خدا پر سچا ایمان، طوفانی رات کی تاریکی میں ایک روشن رہنما مینار کی طرح تھا۔

ایک اخبار نویس نے جو کوئی جذباتی آدمی نہ تھا لکھا ہے "اس شخص کے خلوص نے جو اُس کے ہر ایک لفظ میں شیشے کی طرح جھلکتا ہے۔ سننے والوں کے دل پر بڑا گہرا اثر کیا ہے۔ یوں دیکھو تو اس کی تقریر میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی .... پھر بھی چند سیدھے سادے لفظ جو ایک غم گین دل سے نکلتے ہیں سننے والوں کے دلوں کے تار کو چھیڑ دیتے ہیں۔ سرحدی گاندھی کے ایک جلسے میں ہندو مسلمانوں کا بھائیوں کی طرح گلے ملنا، اور عبادت گاہوں میں اکٹھا جانا خلافت کے دنوں کی یاد دلاتا ہے۔" آگے چل کر یہ نامہ نگار کہتا ہے "یہ چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں، لیکن وہ اس گھنی تاریکی میں روشنی کی کرن بن کر چمکتے ہیں"!

بادشاہ خان کو پٹنہ شہر میں ہر مندر کے گوردوارے میں جو گرو گووند سنگھ کی ولادت کی جگہ ہے بلایا گیا۔ یہاں انھوں نے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے ایک مشترک مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔" ہندوستان آج دیوانگی کا ایک جہنم نظر آتا ہے اور میرا دل یہ دیکھ کر روتا ہے کہ ہم اپنے ہاتھ سے اپنے گھروں کو آگ

نکار رہے ہیں آج مجھے ہندوستان پر تاریکی چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ میری آنکھیں روشنی کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتی پھرتی ہیں۔ مگر وہ کہیں نظر نہیں آتی۔" انھوں نے کہا کہ وہ طاقت کی سیاست سے اُکتا گئے ہیں، اور اُنھیں نفرت کے سبق سے جو سارے ہندوستان میں پڑھایا جا رہا ہے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ ایک "خدائی خدمتگار" کی حیثیت سے اُنھیں صرف اس کا شوق ہے کہ دکھ بھرنے والی انسانیت کی خدمت کریں۔ جلسے کے ختم ہونے کے بعد ہندو، مسلمان اور سکھ اُن کے ساتھ ایک مسجد میں جو گوردوارے سے متصل تھے گئے اور ایک دوسرے کو سلام کر کے گلے ملے۔

بادشاہ خاں نے مونگیر میں ایک موقع پر یہ کہا "میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں ایک ہی قوم رہتی ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ بعض صوبے ایسے ہیں جن میں ہندو ایک بہت چھوٹی سی اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں، اور بعض میں مسلمانوں کی یہی حیثیت ہے۔ جو کچھ یہاں ہوا ہے اگر وہی دوسری جگہ بھی ہو اور اکثریت اقلیت کو کچلنے اور قتل کرنے کی کوشش کرے تو پھر قوم کا خدا ہی حافظ ہے۔ پھر وہ ہمیشہ کے لئے غلام بن کر رہ جائیں گے۔"

اپنے خاص صاف گوئی کے انداز میں انھوں نے سب کو کھری کھری سنائی، کانگریسی وزیروں کو بھی نہیں چھوڑا، ظاہر ہے کہ ہندوستان کے قوم پروروں کو تنبیہ کرنے کا ان سے زیادہ اور کسے حق تھا

انھوں نے کہا کہ صوبوں کی حکومتیں جو عوامی وزیروں کے ہاتھ میں ہیں، اتنی طاقت نہیں رکھتیں کہ بڑے جھگڑوں کو روک سکیں۔ انھوں نے مسلم لیگ سے بھی اپیل کی "میں آپ کو اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ اسلام سے زیادہ رواداری کی تعلیم دنیا میں اور کسی مذہب نے نہیں دی۔ اگر ہم سچے مسلمان بننا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیئے اور انتہائی کوشش کرنی چاہیئے کہ اپنے بھائیوں میں رواداری پیدا کریں .... آج میں یہ دیکھتا ہوں کہ دوسرے فرقوں میں ہم سے زیادہ رواداری ہے، ہمیں اپنی اس کوتاہی کو دور کرنا چاہیئے .... تاکہ ہم سچے مسلمان بن سکیں"

لیکن یہ ایک عام جنون کا زمانہ تھا اور ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ دسمبر ۱۹۴۶ء ہی میں بہار سے آتش زبان فتنہ پردازوں نے فرقہ وارانہ نفرت کی آگ صوبہ سرحد تک پہنچا دی تھی اور مارچ میں ضلع ہزارہ میں بدامنی پھیل گئی۔ اس لئے بادشاہ خاں کو بڑی عجلت میں اپنے صوبے میں واپس جانا پڑا۔ انھوں نے پشاور میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا "شاید یہ ہمارے ملک کی تاریخ میں سب سے نازک وقت ہے۔ ساری فضا میں تشدد پھیل گیا ہے ہم میں سے بہت سے لوگ انسانیت سے گذر گئے ہیں ہم وحشی بن گئے ہیں" انھوں نے یہ وعدہ کیا کہ صوبہ سرحد میں اپنا سارا وقت اس کوشش میں صرف کریں گے کہ اپنے ہم مذہبوں کو صوبے کے اندر

بھی اور قبائلی علاقے میں بھی، وحشیانہ حرکتوں سے باز رکھیں مجھے
مسلم لیگ سے یا یورپین افسروں سے کوئی عداوت نہیں ہے۔ میری
تو بس یہ آرزو ہے کہ پٹھانوں کو اور کچھ انھیں پر موقوف نہیں
بلکہ دنیا کی ساری قوموں کو غیروں کے تسلط سے آزاد دیکھوں۔"

انھوں نے بہار میں ساڑھے تین مہینے رہنے کے بعد پہلے
عام جلسے میں کہا "میں ان لوگوں کو جو ہمارے پیارے ملک
میں آگ لگا رہے ہیں، متنبہ کرتا ہوں کہ ان کی لگائی ہوئی آگ
انھیں بھی بھسم کردے گی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عبادت گاہوں
میں آگ لگانے سے .... اور بے گناہوں کو مارنے
اور لوٹنے سے اسلام کی خدمت کیسے ہو سکتی ہے۔"

مگر ان کے مجروح دل کو اس سے بڑی تسکین ہوئی کہ مارچ
کے فسادات میں خدائی خدمت گاروں نے ان کی ساری توقعات
پوری کیں اور ان میں سے دس ہزار جو اپنے عہد کے سچے تھے
اپنے مصیبت زدہ ہندو اور سکھ بھائیوں کی مدد کے لئے پہنچ کر
ان کے جان و مال کی حفاظت کی۔

جتنا زیادہ وہ اس بات پر غور کرتے تھے کہ آخر بے گناہوں
کے اس قتل اور خانماں بربادی کی اصل وجہ کیا ہے، اتنی ہی زیادہ
اُن کے دل کو تکلیف ہوتی تھی، مگر انھوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری
سب صحیح العقل عناصر کو تاکید کرتے رہے کہ وہ مایوس نہ ہوں

اور امن کی کوشش برابر جاری رکھیں ۔ انھوں نے ایک شلک سے جو ان باتوں پر ہنستا تھا کہا " تم ہندو مسلم اتحاد سے مایوس کیوں ہو؟ کوئی کوشش جو سچے دل سے کی جائے بے کار نہیں جاتی ۔ ذرا اس کھیت کو دیکھو! جو بیج اس میں بویا جاتا ہے وہ کچھ عرصے تک زمین میں رہتا ہے اس کے بعد ایک دن پھوٹ نکلتا ہے اور اپنے وقت پر اپنے جیسے سینکڑوں دانے پیدا کرتا ہے ۔ یہی صورت ہر کوشش کی ہے جو کسی نیک مقصد کے لئے کی جائے " ۱۹۴۵ء میں رہا ہونے کے بعد سے وہ خدائی خدمت گاروں کی نئی تنظیم اور تہذیب نفس میں لگے ہوئے تھے ۔ اب انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ بے نفس خدائی خدمت گاروں کی جماعتوں کو سارے صوبے میں دورے کے لئے بھیجیں تاکہ وہ بھٹکے ہوئے لوگوں کے ضمیر کو خدا کے اور انسانیت کے نام پر جگائیں اور انھیں ان کی غلطیوں کا احساس دلائیں ۔

انھوں نے کہا " مجھے یقین ہے کہ خدا اس مقدس مشن میں میری مدد کرے گا ، اور لوگ اس بات کو سمجھ جائیں گے کہ محبت سچائی اور عدم تشدد کی صفات ایک اچھی آزاد اور خوش حال سماج کی نشانیاں ہیں "

لیکن خدا کو انھیں ایک اور آزمائش میں ڈالنا منظور تھا برطانوی کیبنٹ کا جو ڈیلیگیشن ہندوستان آیا تھا اس نے اپنے ۱۵ مئی کے بیان میں اعلان کیا تھا کہ " صوبوں کے گروپ بنانا "

ان کی انتقالِ اختیارات کی اسکیم کا ایک لازمی جزو ہے اس اسکیم کے مطابق ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق کے صوبے جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی الگ الگ گروپ بننے والے تھے اور یہ تجویز تھی کہ ہر ایک گروپ کے نمائندے ایک سیکشن میں جمع ہوں۔ یہ سیکشن گروپ کا آئین بنائے اور صوبوں کو یہ اختیار رہے کہ اگر چاہیں تو نئے آئین کے مطابق منتخب کیے ہوئے نمائندوں کی اکثریت سے اس گروپ سے الگ ہو جائیں۔ اس طرح صوبہ سرحد پنجاب، بلوچستان اور سندھ گروپ (ب) میں رکھے گئے تھے اور آسام اور بنگال گروپ (ج) میں۔ باقی سب صوبے گروپ (الف) میں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ شمال مغرب اور مشرق میں مسلم اکثریت کے الگ علاقے بن جائیں تاکہ مسلم لیگ کا پاکستان کا مطالبہ عملی طور پر پورا ہو جائے۔ مگر اس میں خرابی یہ تھی کہ اگرچہ کیبنٹ مشن کی تجویز میں گروپ میں شامل ہونا اختیاری رکھا گیا تھا لیکن جو دفعہ گروپ بنانے کے بارے میں تھی اس کا نتیجہ عملاً یہ ہوتا کہ صوبہ سرحد کو اپنے نمائندوں کی مرضی کے خلاف گروپ (ب) میں شامل ہونا پڑتا جس پر دو قوموں کے نظریے کے حامی چھائے ہوئے تھے۔ حالانکہ خود صوبہ سرحد اس نظریے کو قطعی طور پر رد کر چکا تھا اور ہو سکتا تھا کہ یہ گروپ ایک ایسا آئین بناتا کہ کسی صوبے کے لئے آگے چل کر گروپ سے الگ ہو جانا ناممکن ہو جاتا۔ لیکن کانگریس نے یہ سمجھ کر کہ اگر کسی صوبے کے

لوگ یہ طے کرلیں کہ وہ ایک خاص گروپ میں شریک نہیں ہوں گے تو کوئی انھیں مجبور نہیں کر سکتا۔ ۱۶ مئی کی تجویز کو منظور کر لیا تھا مگر وہ ان دفعات کی جو گروپ بنانے سے تعلق رکھتے تھے یہ تعبیر کرتی تھی کہ صوبہ سرحد کے لوگوں کو یہ آزادی ہے کہ وہ اپنی قسمت کا جس طرح چاہیں فیصلہ کریں۔ خان بھائیوں کو گروپ بنانے کی تجویز کے سیاسی پہلو سے کوئی بحث نہ تھی۔ انھیں کسی ایسے گروپ میں شامل ہونے پر اعتراض نہ تھا جو پٹھانوں کو اپنی راہ پر چلنے کی پوری آزادی دے۔ جولائی ۱۹۴۶ء میں بادشاہ خاں نے یہ کہہ دیا تھا "مجھے پنجاب، سندھ اور بلوچستان والے گروپ میں شامل ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میں ضرور کہتا ہوں کہ اس طرح کی شرکت سے پہلے ہمیں چاہیے کہ بھائیوں کی طرح سر جوڑ کر بیٹھیں اور ایک دوسرے کے شکوک دور کر کے اس بات کا یقین دلائیں کہ گروپ میں شامل ہونے سے ہر صوبے کو فائدہ ہوگا۔ بعض لوگ اسے مذہبی رنگ دیتے ہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ بھلا مذہب کو اس سے کیا تعلق ہے؟ یہ تو ایک معاشی مسئلہ ہے یعنی فائدے اور نقصان کا سوال ہے۔ زبردستی سے کام نہیں چل سکتا۔ آج کل باپ بھی بیٹے کو مجبور نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ دوسرا اہم مسئلہ جو قابل توجہ ہے یہ ہے کہ ایسی حالت میں جب ہم پنجاب، سندھ اور بلوچستان سے ہر طرف سے گھرے ہوئے ہیں، ہندوستان سے ملنا کیوں کر ممکن ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم اور اپنے ہمسائے کو نظر انداز کر دیں اور

اسے چھوڑ کر دوسروں سے مل جائیں ۔ اگر ہم کبھی کوئی گروپ بنائیں گے تو وہ صرف پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے ساتھ مل کر بن سکتا ہے دوسرے صوبوں کے ساتھ نہیں، اس لئے کہ وہ سب صوبے جن میں ہندوؤں کی اکثریت ہیں ہم سے سینکڑوں میل دور ہیں ۔

لیکن کیبنٹ ڈیلی گیشن کی تجویز ناکام رہی اور ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو مسٹر اٹیلی نے دارالعوام میں یہ اعلان کیا کہ اگر کیبنٹ ڈیلی گیشن کی ۱۶ مئی والی تجویز کے مطابق اختیارات کو منتقل کرنے اور آئندہ آئین بنانے پر دونوں بڑی پارٹیاں متفق نہ ہوئیں تو برطانوی حکومت کو یہ سوچنا پڑے گا کہ جب وہ ہندوستان کو چھوڑے تو اختیارات کس کے سپرد کرے اور کیسے کرے؟ اشارتاً یہ بھی کہہ دیا گیا کہ جن صوبوں کی نمائندگی آئین ساز اسمبلی میں پوری طرح نہ ہوگی ممکن ہے کہ وہاں اختیارات اُس حکومت کو منتقل کر دئے جائیں جو اس وقت موجود ہو ۔ اس کے معنی یہ تھے کہ صوبہ سرحد میں اختیارات اس حکومت کی طرف منتقل ہوتے جس کے صدر ڈاکٹر خان صاحب تھے چنانچہ دو قوموں کے نظریے کے حامیوں نے اس حکومت کو توڑنے میں اپنا سارا زور لگا دیا اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے سب سے آسان ترکیب یہ تھی کہ فرقہ دارانہ جذبات کو بھڑکایا جائے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے مارچ اور پھر اپریل میں ہزارہ اور صوبے کے بعض اور حصوں

میں پھر ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف بڑے پیمانے پر فساد کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے بعد آسام اور پنجاب کی طرح یہاں بھی ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کے خلاف "ڈائرکٹ ایکشن شروع ہو گیا۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہو کر ہندوستان پہنچے۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں وہ صوبہ سرحد آئے۔ اس موقع پر مسلم لیگ کے والنٹیروں کا ایک مظاہرہ کیا گیا اور گورنر انھیں اس جماعت کی ریلی دیکھنے کے لئے لے گئے۔ جو خود اُن کے وزیروں کے خلاف شورش برپا کر کے قانون کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ ایک صوبے کے حاکم کے لئے ایسی حرکت کرنا ایک عجیب بات تھی۔

گورنر نے ایک اور عجیب حرکت کی انھوں نے وائسرائے کو اس پر آمادہ کرنا چاہا کہ صوبہ سرحد میں دفعہ ۹۳ نافذ کر دیں اور نئے سرے سے انتخاب کرائیں۔ وہ اس پر بھی اُتر آئے کہ صوبے کے کیبنٹ کے ایک جلسے کی جو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے قیام کے دوران میں ہوا تھا غلط اور مسخ کی ہوئی رپورٹ وائسرائے کو بھیجی اور وزیر اعظم کی سچی رپورٹ کو روک دیا۔ بعد میں یہ رپورٹ براہ راست دہلی بھیجی گئی۔

بات یہ ہے کہ صوبہ سرحد کے بڑے برطانوی افسر چاہتے تھے کہ اس طاقت میں سے جو ان کے ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی جتنی بھی بچ سکے بچا لیں، اور اس کی صورت یہ تھی کہ اسے اپنی منظور نظر اور

اور تاریخی حلیف " مسلم لیگ کے حوالے کر دیں جواب پھر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ادھر برطانوی کیبنٹ کو بھی جو دل سے یہ چاہتی تھی کہ ہندوستان کو برطانیہ کے تسلط سے آزاد کر دے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ہندوستان کی ایسی تقسیم کرے جو مسلم لیگ کے لئے قابل قبول ہو۔ اور اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ صوبہ سرحد طوعاً کرہاً مسلم لیگ کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ ہمیں برطانیہ کے خلوص کی توہین مقصود نہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ برطانوی کیبنٹ اور مقامی برطانوی افسروں کے بیچ میں صوبہ سرحد مفت میں مارا گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ انصاف کو مصلحت پر قربان کر دیا گیا۔

اپنے بہار کے قیام کے زمانے میں بادشاہ خاں سنجیدگی سے اس پر غور کر رہے تھے کہ وہ سیاست سے بالکل الگ ہو جائیں۔ سیاسی میدان میں جو تنگ ظرفی اور خود غرضی نظر آئی تھی اس سے اُن کی طبیعت کراہیت کرتی تھی۔ لیکن صوبہ سرحد کے حالات نے انھیں اپنے فیصلے کو بدلنے پر مجبور کیا۔ انھوں نے سوچا کہ ایسے وقت میں پبلک لائف سے ہٹنا گویا پٹھانوں کو منجدھار میں چھوڑ دینا ہو گا۔ مہمند قبیلے کے ایک مجمع میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا " ہم نازک دور سے گذر رہے ہیں۔ انگریز اور اُن کے پٹھو اس خیال سے پریشان ہیں کہ اُن کے ہاتھ سے طاقت نکلنے والی ہے لوگ تمھیں اسلام کے نام سے گمراہ کرتے ہیں .... میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

کہ تمھیں آنے والے خطروں سے آگاہ کر دوں تاکہ میں قیامت کے دن خدا کے سامنے شرمندہ نہ ہوں .... مجھے کسی طرح چین نہیں آتا۔" گورنر کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا "میں دہلی گیا تھا اور مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے کہ وہی شخص جو جرگے میں تم سے ملتا ہے اور تمھارے دوست ہونے کا دعوے کرتا ہے۔ تمھارے خلاف رپورٹیں بھیجتا رہا ہے اور دہلی کی حکومت سے اصرار کرتا رہا ہے کہ وہ بمبار ہوائی جہازوں کو تیار رکھے تاکہ وہ تم پر ہلاکت اور تباہی کی بارش کریں۔ اب کے جو وہ جرگے میں آئیں تو اُن سے پوچھنا کہ وہ سچ ہے یا نہیں۔ اگر وہ انکار کریں تو انھیں میرا سامنا کرنے دو اور میں اپنے الزام کا پورا ثبوت دوں گا"

انھوں نے کہا کہ حال میں سر اولف کیرو نے سرحد کے وزیروں سے کہا تھا یاد رکھو کہ تمھارے اور ہندوستان کے درمیان کوئی چیز مشترک نہیں۔ اگر تم کانگریس کو چھوڑ دو تو میں پوری طرح تمھارا ساتھ دوں گا۔

انھوں نے لوگوں سے پوچھا کہ آخر سر اولف کیرو سرحد میں نئے انتخابات کیوں چاہتے ہیں ۹ ۶ء؁ کے انتخابات میں جو خاص پاکستان کے مسئلے کی بنیاد پر لڑے گئے تھے، کانگریس نے ۵۰ نشستوں میں سے ۳۲ نشستیں جیت لی تھیں۔ ان میں ۳۸ مسلم نشستوں میں سے ۲۱ اور ۹ کی ۹ ہندو نشستیں اور تین میں سے دو سکھ نشستیں

شامل تھیں۔ ان کے مخالفوں نے جو ۱۷ اسلم نشستیں حاصل کی تھیں اُن میں سے گیارہ ہزارہ ضلع کی تھیں جو پشتو بولنے والوں کا علاقہ نہیں ہے۔" سر اولف کا منشا صاف ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ طاقت اپنے ٹوڈیوں اور پٹھوؤں یعنی خانوں، نوابوں اور چند افسروں کے ہاتھ میں دے دیں جنھوں نے ان سب تحریکوں میں جو خدائی خدمت گاروں نے برطانیہ کے خلاف چلائی تھیں، انگریزوں کی مدد کی ہے انتقالِ اختیارات کے وقت گورنر کیرو کو یہ فکر ہے کہ حکومت انھیں انگریزوں کے دستوں کے سپرد کریں نئے انتخابات کے اس کے سوا اور کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ ابھی سال بھر پہلے پٹھانوں نے ان انتخابات میں جو پاکستان کے مسئلے کی بنیاد پر ہوئے تھے۔ اپنی رائے صاف صاف ظاہر کر دی تھی۔ پٹھانوں نے بہت بڑی اکثریت کے ساتھ خدائی خدمت گاروں کو منتخب کیا تھا۔"

یہ بد دیانتی ہوگی کہ مسلم لیگ کی فرقہ وارانہ تحریک کو جس کے پیرو جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں، ایک سیاسی تحریک کی حیثیت دی جائے۔"

یہ بات بادشاہ خاں نے اس لئے کہی کہ گورنر دلیل پیش کر رہا تھا کہ جو پر تشدد مظاہرے سارے صوبوں میں ہو رہے ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کو وزارت پر اعتماد نہیں ہے۔ بادشاہ خاں نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ اگر گورنر اپنا فرض ادا کرتا تو وہ

خوں ریزی کو روک سکتا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں ایک سر پھرے پٹھان نے ایک برطانوی افسر پر گولی چلائی تو ۲۴ گھنٹے کے اندر مجرم گرفتار بھی ہوگیا اور اُسے پھانسی کی سزا بھی دے دی گئی۔ جب مس ہولی ایلس کو اغوا کیا گیا تھا اور ان کو چھوڑا گیا تھا تو ٹوری پارٹی کے ایک ممتاز اخبار نے لکھا کہ یہ واقعہ اس کی مثال ہے کہ ایک برطانوی عورت کی عزت کی حفاظت کے لئے برطانوی سلطنت کے سارے وسائل سے کام لیا جاتا ہے۔ جنگ کے دوران میں چھ سال تک جبکہ انگریز خود مشکل میں گرفتار تھے، قبائلی علاقے میں کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ چونکہ انگریز امن چاہتے تھے، اس لئے امن رہا، اور اب سینکڑوں آدمی قتل کردئے گئے۔ ہزاروں بچے یتیم ہو گئے، اور بہت سے گھر اُجڑ گئے۔ مگر سرحد کے برطانوی حکام چپ چاپ تماشہ دیکھتے رہے، اور انھوں نے اس بدامنی کو روکنے کے لئے وہ سخت کارروائی جو اُن کے وزیر چاہتے تھے نہیں کی۔ بلکہ اس بدامنی کی بنا پر انھوں نے ان وزیروں کو ہٹا دینے کا مطالبہ کیا۔ حالانکہ انھیں رائے دہندوں کی بہت بڑی اکثریت نے منتخب کیا تھا، اور اب تک آئین ساز اسمبلی میں ان کی اکثریت تھی۔

بادشاہ خان نے مسلم لیگیوں سے پرجوش اپیل کی کہ "خدائی خدمت گاروں" کے ساتھ ایک مشترک جرگہ کرکے ان مختلف مسائل پر غور کریں جو انگریزوں کے ہندوستان سے جانے کے بعد پیدا ہوں

گے .... اب جبکہ انگریز جا رہے ہیں ان کو ہمارے ساتھ ایک جرگے میں بیٹھنا چاہیے۔ اگر وہ بھائیوں کی طرح ہم سے ملیں اور اپنے تشدد کے طریقے چھوڑ دیں تو ہم آج بھی اپنے اختلافات کو دور کر سکتے ہیں۔ میں ہر باعزت سمجھوتے کو جو ہم آپس میں کریں منظور کرلوں گا، اگر واقعی دل سے کیا جائے۔ مسلم لیگ والوں کو ہندوؤں کے تسلط کا ڈر ہے اور ہمیں انگریزوں کے تسلط کا۔ بہتر ہے کہ ہم دونوں مل کر ایک دوسرے کو سمجھائیں۔ ہم تو ان کا خوف دور کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ کیا وہ بھی ہمارا خوف دور کر دیں گے؟"

جون ۱۹۴۷ء میں انھوں نے پھر سمجھوتے کی کوشش کی۔ انھوں نے لیگیوں سے کہا کہ وہ پاکستان میں شامل ہونے پر تیار ہیں۔ اگر

(۱) باعزت شرطوں پر سمجھوتا کیا جائے۔

(۲) اس صورت میں کہ پاکستان آزادی کے بعد برطانیہ کے تسلط میں رہنا چاہے تو آئینی اضلاع اور قبائلی علاقے کے پٹھانوں کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ اس ڈومنین سے الگ ہوکر ایک آزاد ریاست بنالیں۔

(۳) ان سب معاملات کا جو قبائلیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ فیصلہ خود پٹھان کریں اور اس میں غیر پٹھانوں کا کوئی دخل نہ ہو۔ جیسا کہ موجودہ آئین ساز اسمبلی نے منظور کیا ہے۔

یہ پیش کش ٹھکرادی گئی اور پاکستان بن گیا۔ تقسیم کی تجویز میں یہ بھی شامل تھا کہ صوبہ سرحد میں اس مسئلے پر عام رائے شماری کی جائے کہ وہ کس کے ساتھ شامل ہوگا یہ ناانصافی کی بات تھی۔ بلوچستان میں تو عام رائے شماری کی جگہ عوام کے نمائندوں کی ایک جماعت گھڑ لی گئی اور سرحد میں جہاں عوامی نمائندوں کی جماعت پہلے سے موجود تھی۔ اس کے فیصلے سے بچنے کے لئے یہ چال کی گئی کہ ایک غلط سوال پر عام رائے شماری کی گئی۔ خان بھائیوں نے کہا کہ یہ سوال کہ سرحد ہندوستان میں شامل ہوگا یا پاکستان میں پہلے ہی ختم ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ اصولاً کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے تقسیم کی تجویز مان لی ہے اور صوبہ سرحد جغرافی لحاظ سے باقی ہندوستان سے بالکل الگ ہے وہ عام رائے شماری سے نہیں ڈرتے تھے مگر یہ چاہتے تھے کہ وہ اس سوال پر ہو کہ کیا پٹھان اپنے علاقے میں خود مختار حکومت چاہتے ہیں۔ بادشاہ خان کہتے تھے کہ پٹھان یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان کی ریاست کے اندر ایک خود مختار پٹھانستان ہو جس میں پٹھانوں کو اپنے معاملات خود طے کرنے کی آزادی ہو۔

پٹھان پچھلی تاریخ کی بنیاد پر اس کے سخت مخالف تھے کہ اُن پر میدانی علاقے کے لوگوں کا تسلط ہو، اور بادشاہ خاں کا خیال تھا کہ پاکستان میں شامل ہونے سے پنجابی مسلمان سرمایہ دار پٹھانوں پر حاوی ہو جائیں گے۔ انھوں نے ایک بیان میں جو اخباروں کو دیا تھا، یہ کہا " ہمارے صوبے پر پنجابی چھا گئے ہیں

اور وہ پٹھانوں کو آپس میں لڑانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ پنجاب کے نوابوں اور بڑے سرمایہ داروں نے صوبے کی فرقہ وارانہ تقسیم کے بعد پنجاب کا ایک بڑا حصہ کھو دیا ہے، اور اس کی تلافی کے لئے وہ اب ہمارے صوبے پر قبضہ کرنے کی فکر میں ہیں۔" اس اعتراض کے جواب میں کہ پٹھانستان کا علاقہ اپنی معاشی ضرورتوں کو خود پورا نہیں کر سکے گا۔ انھوں نے اپنے خاص انداز میں کہا "یہ غلط ہے کہ پٹھانستان ایک خسارے کی ریاست ہوگی۔ اس وقت ہمارا نظم و نسق سرمایہ داری طرز کا ہے جس میں حکام کو بہت بڑی بڑی تنخواہیں ملتی ہیں۔ اکیلے گورنر پر ایک لاکھ روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور برطانوی حکام ہیں جو ہمارے صوبے کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ لے جاتے ہیں۔ اگر ہم اس فضول خرچی کو ختم کر دیں اور جو رقم بچے اُسے ایسی اسکیموں پر صرف کریں جس سے پیداوار میں اضافہ ہو تو ہم یقیناً اپنا خرچ پورا کر لیں گے۔ اگر ہماری آزادی برقرار رہے تو ہم پھونس کی جھونپڑیوں پر اور سوکھی روٹی پر قناعت کریں گے اور اسے اس پر ترجیح دیں گے کہ غلام بن کر محلوں میں رہیں۔"

ایک اور موقع پر انھوں نے اعلان کیا "ہم میں اور مسلم لیگ میں پاکستان اور آزاد پٹھانستان کے مسئلے پر رائے شماری کا مقابلہ ہو جائے۔ اگر عوام اس مقابلے میں پاکستان کے حق میں

رائے دیں تو میں پہلا آدمی ہوں گا جو پاکستان کی حمایت کرے گا۔"
اس پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ افغانستان کے ہاتھوں میں کھیل رہے
ہیں۔ ایک ایسے شخص پر جس کی جان اپنی قوم کی آزادی میں اٹکی ہوئی
تھی۔ یہ الزام صریحی طور پر غلط اور مضحکہ خیز تھا۔ خود گاندھی جی کو
جنھوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی اس بے بنیاد پروپاگنڈا کی وجہ
سے اس شخص کی حمایت میں پھر خاموشی توڑنی پڑی جس کے متعلق وہ
جانتے تھے کہ سچائی اور دیانت داری کی جان ہے۔

انھوں نے تیسری جولائی کو جو اُن کا ہفتے کا خاموشی اور مشاہدۂ
نفس کا دن تھا، پرارتھنا کے بعد ایک لکھے ہوئے پیام میں کہا "بادشاہ
خاں اور اُن کے رفیق کار اسے پسند نہیں کرتے کہ اُن سے ہندوستان
اور پاکستان میں انتخاب کرنے کو کہا جائے جسے زبردستی ہندوؤں
اور مسلمانوں میں انتخاب کرنے کے معنی پہنائے جاتے ہیں۔ اسی لئے
خدائی خدمت گار اپنے ووٹ استعمال نہیں کریں گے۔ بادشاہ خاں
پر یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ پٹھانستان کا نعرہ بالکل نیا ہے۔
لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے کانگریس کی وزارت قائم ہونے
سے بھی پہلے بادشاہ خاں کا یہ خیال تھا کہ پٹھانوں کو اندرونی معاملات
میں خود مختاری حاصل ہو۔ وہ کوئی نئی ریاست قائم کرنا نہیں چاہتے
تھے۔ اگر انھیں اپنا مقامی آئین بنانے کا حق دیا جائے تو وہ خوشی
سے دونوں ریاستوں میں سے ایک میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیں گے۔

پٹھانوں کی اس آزادی کی آرزو پر جو اعتراض کیا جاتا ہے اس کا سمجھنا میرے لئے مشکل ہے۔ ہاں اگر اس کا مقصد پٹھانوں کو ذلیل کرنا اور انھیں زبردستی محکوم بنانا ہو تو اور بات ہے۔ اس سے زیادہ سنگین الزام یہ ہے کہ بادشاہ خاں افغانستان کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان میں تو اس قسم کی ریشہ دوانیوں کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ وہ اس کو ہرگز گوارا نہیں کریں گے کہ صوبہ سرحد افغانستان میں شامل ہو جائے۔"

گاندھی جی نے آگے چل کر کہا "ان کے دوست کی حیثیت سے اور دوست ہونے کی وجہ سے میں ان کی ایک کمزوری کا اعتراف کرتا ہوں۔ انھیں برطانیہ کے وعدوں اور ارادوں کے بارے میں بہت شبہہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سب لوگ اس خامی کو جو صرف انھی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے نظر انداز کر دیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان جیسے بلند پایہ لیڈر کو یہ بات زیب نہیں دیتی۔ پھر بھی اگرچہ میں نے اسے خامی کہا ہے، اور ایک لحاظ سے ہے بھی، دوسرے لحاظ سے اسے خوبی کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اگر کوشش بھی کریں تو اپنے دلی خیالات کو چھپا نہیں سکتے۔ یہ ان کی دیانت داری کی دلیل ہے۔"

چنانچہ رائے شماری ہوئی۔[۵] خدائی خدمت گاروں اور اُن کے

---

[۵] ہزارہ میں رائے شماری سے پہلے جو "آپ دھوا" تھی اس کا اندازہ ایک (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حامیوں نے اس میں حصہ نہیں لیا۔ رائے شماری کے بعد یہ اعلان کر دیا گیا کہ صوبہ سرحد پاکستان کا ایک حصہ ہے لیکن بادشاہ خان

(بقیہ بسلسلہ صفحہ ۳۱۹) صاحب کے شائع کئے ہوئے بیان سے ہوگا جو ضلع ہزارہ کی طرف سے اسمبلی کے ممبر تھے :-

"میں وزارت کو متنبہ کرتا ہوں کہ اگر کوئی وزیر ضلع ہزارہ میں کانگریس کا پروپیگنڈا کرنے کے لئے آنے کی کوشش کرے گا تو وہ قتل کر دیا جائے گا۔" یہ الفاظ ضلع ہزارہ کے ممبر اسمبلی خان جلال الدین نے ایبٹ آباد میں ایک جلسے میں کہے جو لوگوں کو پاکستان کی تائید پر آمادہ کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جو ہندو اور سکھ ہزارہ میں واپس آنا چاہتے ہیں انھیں اگر اس ضلع میں چین سے رہنا ہو تو یہ اعلان کر دینا چاہئے کہ پاکستان کی پوری طرح تائید کریں گے اور اس اعلان کی ایک کاپی لیگ کے دفتر میں بھیج دینا چاہئے۔

ہندوستان ٹائمز ۳ر جولائی ۱۹۴۷ء

رائے شماری کے نتیجے سے یہ ظاہر ہوا کہ ۵۷۲۷۹۸ ووٹوں میں سے مسلم لیگ کو ۲۸۹۲۴۴ ووٹ ملے۔ اگر کل ووٹوں میں سے ۴۸۷۸۱ مسلمانوں کے ووٹ منہا کر دئے جائیں جنھوں نے انتخاب میں حصہ نہیں لیا تو ۱۹۸۷۷۳ یعنی چالیس فیصدی آدمی باقی رہ جاتے ہیں جنھوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ نہیں دیا غیر پٹھان رائے دہندوں کو جن کی ضلع ہزارہ اور بعض شہروں میں اکثریت تھی چھوڑ کر دیکھا جائے تو غالباً پاکستان کے حق میں رائے دینے والوں سے کہیں زیادہ نکلیں گے۔

کے نزدیک لڑائی ہاری نہیں گئی تھی، وہ تو ابھی شروع ہوئی تھی اب تک تو ان کا مقابلہ انگریزوں سے تھا جو بدیسی تھے۔ اب حکومت اُن کے بھائیوں کے ہاتھ میں تھی اگر وہ ان سے انصاف کی امید نہ کرتے تو اور کس سے کرتے؟ جو لڑائی وہ سالہا سال سے لڑ رہے تھے اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ایک جوا گردن سے اتار کر دوسرا رکھ لیں۔ تقسیم کے بعد بھی ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت قائم تھی یہ اتنی مضبوطی سے جمی ہوئی تھی کہ اسے آئینی طریقے سے اُکھاڑنا ممکن تھا۔ اسی لئے ۲۱ اگست ۱۹۴۷ء کو قائد اعظم نے اسے اپنے حکم سے برخاست کر دیا۔ تیسری اور چوتھی ستمبر کو سرداریاب میں ایک مجمع سے خطاب کرتے ہوئے جو صوبائی جرگوں پارلیمنٹری پارٹی، ظلمے پختون (نوجوان پٹھانوں کی جماعت) خدائی خدمت گاروں اور قبائلی علاقوں پر مشتمل تھا۔ بادشاہ خان نے ایک بار اور اپنے پٹھانوں کے مطالبے کی تشریح کی اور اس کے معنی یہ بتائے کہ پٹھانوں کو پاکستان کے اندر اپنے اندرونی معاملات میں پوری آزادی ہو۔ اس جلسے میں جو رزولیوشن پاس ہوئے ان میں سے ایک کے الفاظ یہ تھے "نئی ریاست صوبہ سرحد کے چھ آئینی اضلاع اور پٹھانوں کے ان متصل علاقوں پر مشتمل ہوگی جو اپنی خوشی سے اس میں شامل ہوں۔ یہ ریاست دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے بارے میں پاکستان کے ڈومینین سے معاہدہ کرے گی۔"

بادشاہ خاں نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا "میں ساری عمر پٹھانستان قائم کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ خدائی خدمت گاروں کی تنظیم ۱۹۳۰ء میں اسی غرض سے شروع کی گئی کہ پٹھانوں کو متحد کیا جائے۔ میرے اصول اب بھی وہی ہیں جو ۱۹۳۰ء میں تھے۔ اسی لئے میرا راستہ بالکل صاف ہے۔ اسے ہرگز نہیں چھوڑوں گا چاہے میں دنیا میں اکیلا ہی کیوں نہ ہوں" لیکن خدائی خدمت گاروں کو بدنام کرنے اور ستانے کی مہم جاری رہی۔ بادشاہ خاں رائے عامہ کو پٹھانستان کے نصب العین کی حمایت کے لئے تیار کرنے کی ان تھک کوشش کرتے رہے۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں گاندھی جی جو اتنے سال سے اہنسا کی راہ میں اُن کی رہنمائی کر رہے تھے قاتل کی گولی کھا کر شہید ہو گئے اور سرحدی گاندھی پٹھانوں میں عدم تشدد کا خطرناک تجربہ کرنے کے لئے جو اب تک دونوں مل کر کرتے رہے تھے اکیلے رہ گئے۔ گاندھی جی کی شہادت کے بعد کے چند مہینوں میں بادشاہ خاں کی عظمت اور بلندی اس طرح ظاہر ہوئی جیسے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

فروری میں انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کراچی جا کر ڈومینین پارلیمنٹ کے جلسے میں شریک ہوں۔ خاص طور پر اس مقصد کے لئے کہ جو غلط فہمی اُن کے خلاف ایک منظم پروپاگنڈا کے ذریعے سے پاکستان کے مسلمانوں میں پیدا کی گئی ہے اُسے دور کریں۔ کئی پر زور بیانوں میں

جو انھوں نے اخباروں میں شائع کئے، پٹھانستان کے بارے میں اپنے خیالات صاف صاف ظاہر کر دیے۔

انھوں نے بتایا کہ پٹھانستان یا پختونستان، پاکستان کے اندر ایک خود مختار علاقہ ہوگا۔ وہ پٹھانوں کے لئے ہوگا، جیسے سندھ سندھیوں کے لئے، پنجاب پنجابیوں کے لئے اور بنگال بنگالیوں کے لئے۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ، انگریزوں کا گھڑا ہوا نام ہے اور اُسے اب باقی نہیں رہنا چاہئے۔

انھوں نے اس الزام کو بالکل بے بنیاد قرار دیا کہ وہ پٹھانستان کی ایک آزاد ریاست بناکر پاکستان میں رخنہ ڈالنا چاہتے ہیں خود یہ بات کہ وہ پاکستان کے دستور کی وفاداری کا حلف اُٹھا چکے تھے اس الزام کی تردید کے لئے کافی تھی۔ انھوں نے اپنے مطالبے کی وجوہ سمجھاتے ہوئے کہا کہ سرحد کے لوگ سیاسی حیثیت سے پسماندہ ہیں اور زیادہ تر غریب طبقے اور متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ان میں سرمایہ داروں کا طبقہ نہیں ہے۔ درآں حالیکہ پاکستان میں دولت مند زمیندار، سرمایہ دار اور اونچے طبقے والے چھائے ہوئے ہیں، جو پالسی پاکستان پٹھانوں کے بارے میں اختیار کر رہا ہے وہ انگریزوں کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالسی سے بھی بدتر ہے۔ انگریز حکمراں پٹھانوں کے حوصلے کو اتنا پست نہیں کر سکے تھے جتنا کہ اب پاکستانی حکام نے کر دیا ہے۔

انھوں نے اس سوال کا کہ آیا اُن کی تنظیم کو فقیر ایپی سے کوئی تعلق ہے۔ نفی میں جواب دیا۔ انھوں نے اس پر زور دیا کہ اس قسم کے سب بیانات بالکل غلط ہیں اور اُن کے دشمنوں کے پھیلائے ہوئے ہیں۔

انھوں نے اس سے بھی انکار کیا کہ ان کی تنظیم پٹھانستان کے معاملے میں افغانستان سے کس قسم کا علاقہ رکھتی ہے۔ ان میں اور افغانستان کے لوگوں میں اس کے سوا کوئی تعلق نہیں کہ دونوں ایک نسل سے ہیں اور خون کے رشتے سے وابستہ ہیں۔

بادشاہ خاں نے یہ بھی کہا کہ افغانستان کی حکومت نے پٹھانوں کو حقِ خود اختیاری ملنے کے متعلق جو کچھ کیا ہو یا افغانستان اور پاکستان میں دوسرے مسئلوں کے بارے میں جو اختلاف ہوا اس سے ان کو کوئی واسطہ ہے اور نہ انھیں اس کا علم ہے یہ دونوں حکومتوں کا اپنا معاملہ ہے۔

انھوں نے اس الزام کی پر زور تردید کی کہ پٹھانستان کا مطالبہ صوبہ داری جذبہ پر مبنی ہے اور اسلامی برادری کی روح کے منافی ہے۔ انھوں نے کہا "اسلام کا جوہر مساوات ہے نہ کہ ایک کا دوسرے پر تسلط۔ ہم پٹھان لوگ نہ تو دوسروں کے حقوق ھتھیانا چاہتے ہیں اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے ہمارے حقوق غصب کریں۔ پاکستان میں چار جماعتیں ہیں۔ پٹھان، بنگالی،

پنجابی اور سندھی۔ ہم سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ ان میں سے کوئی دوسرے کے معاملات میں مداخلت نہ کرے۔ سب کو کامل خود اختیاری حاصل ہو۔ اگر ایک دوسرے سے مدد چاہے تو اسے ضرور دینا چاہیے"۔

جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا اس سے پاکستان کمزور نہیں ہو جائے گا تو انھوں نے جواب دیا کہ نہیں بلکہ اس طرح مختلف حصے اپنی خوشی سے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے۔ انھوں نے کہا "میں نے قائد اعظم جناح سے درخواست کی کہ وہ پٹھانوں کو ایک مضبوط قوم بننے دیں تاکہ وہ اپنی حفاظت اور پاکستان کے مسلمانوں کی حفاظت کر سکیں اور انسانیت کو فائدہ پہنچا سکیں۔ میں انسانیت کا ایک ادنٰی خادم ہوں"۔

اس سوال کے جواب میں کہ کیا وہ پٹھانستان کے سوال پر رائے شماری چاہتے ہیں اور اگر ایسا ہے تو انھوں نے پچھلی رائے شماری کا بائیکاٹ کیوں کیا۔ بادشاہ خاں نے کہا کہ "بائیکاٹ اس لئے کیا گیا کہ یہ رائے شماری غلط مسئلے پر کی گئی تھی اور اس کا طریقہ نامناسب تھا۔ اب رائے شماری کا کوئی سوال نہیں بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان سے براہِ راست گفت و شنید کر کے معاملہ طے کر لیں۔

اُن سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کو یہ اندیشہ نہیں کہ گاندھی جی کی

وفات کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت بدتر ہو جائے گی۔
بادشاہ خاں نے اس کی سختی سی تردید کی اور کہا "جب تک ہندوستان
میں وہ بڑے بڑے لیڈر زندہ ہیں جو گاندھی جی کے اصولوں کے
پیرو ہیں جیسے پنڈت نہرو، بابو راجندر پرشاد اور کئی حضرات، اس
وقت تک ہندوستان مسلمانوں کو ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اُن کی
حالت ہرگز خراب نہیں ہوگی۔"

اس بات کی مثال کے طور پر کہ انھیں کس کس طرح ستایا گیا۔ انھوں نے
یہ واقعہ بیان کیا کہ جنوری کے مہینے میں ایک نوعمر لڑکا جو خدائی خدمت گار
تھا آکر اُن کے پاس ٹھہرا۔ اس کے پاس ایک پستول تھا تاکہ اس بدامنی
کے زمانے میں ضرورت کے وقت اپنی حفاظت کر سکے۔ پستول لڑکے
کے چچا کا تھا اور ان دونوں نے یہ بیان دیا کہ بادشاہ خاں کو اس
پستول سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ انھیں اس کا علم بھی نہیں۔ پھر
بھی بادشاہ خاں مجرم قرار دئے گئے، اور ان کو یہ سزا دی گئی کہ
یا تو دو روپے جرمانہ ادا کریں یا عدالت کے برخاست ہونے
تک قید رہیں۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے جرمانہ ادا کرنے سے انکار
کیا۔

آخر میں انھوں نے عدم تشدد پر کامل اور غیر مشروط یقین کا
اظہار کیا "میں ایک عملی آدمی ہوں، اور ہر بات کا اندازہ اس کے
نتائج سے کرتا ہوں۔ فی الحال میں انتظار کروں گا اور واقعات کی

رفتار کو دیکھتا رہوں گا۔ اپنے ہر عمل میں عدم تشدد کا پابند رہوں گا۔ جو میری زندگی کا لنگر ہے۔"

۱۰ مارچ ۱۹۴۸ء کو سب کی آنکھیں ان کی طرف لگی ہوئی تھیں جب انھوں نے پاکستان کی ڈومینین پارلیمنٹ میں تحریک پختونستان کی تشریح کی اور بڑے جوش کے ساتھ یہ اپیل کی کہ رواداری سے اور اسلام کی تعلیم کے مطابق اخوت اور مساوات سے کام لیا جائے تاکہ پاکستان مضبوط اور خوش حال ہو۔

عام نظم و نسق کی بجٹ کے سلسلے میں احتجاج کے طور پر تخفیف کی تجویز پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا "آزادی کے بعد چھ مہینے میں پاکستان کے نظم و نسق میں بدیسی حکومت اور نوکر شاہی کا رنگ اس سے بھی زیادہ گہرا ہو گیا تھا جیسا کہ برطانوی حکومت کے بدترین زمانے میں تھا۔ اس میں اور ہندوستان کی حالت میں ایک نمایاں تضاد ہے۔ وہاں کم سے کم ہندوستانی گورنروں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور تقریباً سارا نظم و نسق ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ پاکستان کی حکومت کو عوام کی خدمت کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہیے اور فنی ماہروں کے سوا بدیسیوں کو بالکل نہیں رکھنا چاہیے۔"

یہ رائے ظاہر کرتے ہوئے کہ پاکستان قائم ہونے کے بعد مسلم لیگ کا کام ختم ہو گیا ہے۔ بادشاہ خاں نے یہ رائے دی کہ مسلم لیگ کو توڑ

دیا جائے اور اس کی جگہ ایک خالص غیر فرقہ وار جماعت بنائی جائے جو غریب اور بے بس لوگوں کی خدمت کے لئے وقف ہو۔ وزارتی پارٹی کے اعتراض کے جواب میں انھوں نے کہا کہ جب سے سندھ الگ صوبہ بنا ہے۔ صوبہ واری جذبات کو اکسانے کی ذمہ داری مسلم لیگیوں پر خصوصاً پنجابیوں پر ہے۔ پٹھان بھی ویسی ہی خود مختاری چاہتے ہیں جیسی سندھ، پنجاب اور بنگال۔ میں نہ تو پاکستان کے ٹکڑے کرنا چاہتا ہوں اور نہ اُسے برباد کرتا۔

انھوں نے کہا " ہندوستان آزاد ہو گیا ہے، لیکن پاکستان جہاں برطانوی گورنروں کا راج ہے اور برطانوی افسروں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی ہے جتنی سالہا سال سے نہیں ہوئی تھی۔ استبداد کے پنجے میں پہلے سے بھی زیادہ گرفتار ہے۔ پاکستان کی حکومت اس طریقے سے راج کر رہی ہے جو انگریزوں نے ایجاد کیا تھا بلکہ سچ پوچھئے تو نئے قاعدوں اور ضابطوں بدلیسی طرز معاشرت اور فضول خرچی کو دیکھتے ہوئے پہلے سے بدتر ہے۔ لوگ صوبے داری جذبے کی شکایت کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ جذبہ مسلم لیگ کا اور پنجابیوں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ میں یقیناً پٹھانستان چاہتا ہوں، مگر وہ پٹھانستان جو پاکستان کے اندر ہو، اسی طرح جیسے سندھی اور پنجابی چاہتے ہیں "

آگے چل کر انھوں نے کہا " مسلم لیگ کو جو اس وقت ایک

فرقہ وار جماعت کی حیثیت رکھتی ہے نئے سرے سے بنانا چاہیئے اور اس میں پاکستان کے سب باشندوں کو شریک کرنا چاہیئے، اسی میں ملک کا بھلا ہے۔ پاکستان امریکی اور برطانوی ماہرینِ فن کو صنعتی ترقی کے لئے ضرور رکھے۔ لیکن ان کو انتظامی عہدوں سے الگ کر دے۔ ورنہ پاکستانیوں کو اپنے ملک پر بھروسہ نہیں رہے گا۔"

اخباروں کو ایک بیان دیتے ہوئے انھوں نے ان سختیوں اور بدسلوکیوں کی ایک لمبی فہرست پیش کی جو خدائی خدمت گاروں کے ساتھ کی گئی تھیں۔" پاکستان کی حکومت کہتی ہے کہ اس نے ہمارے اخبار پختون کی زبان بندی نہیں کی۔ صرف اتنا ہوا کہ جب اس کے پرانے پبلشر نے استعفیٰ دے دیا تو حکومت کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اُسے آئندہ کے لئے ڈکلیریشن دینے سے انکار کر دیا۔ اگر ڈکلیریشن نامنظور کر دینا جس کی وجہ سے اخبار بند ہو گیا۔ زبان بندی نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے؟"

"اب رہا ضلع مردان میں شہری آزادی کا سوال تو مجھے اس کی بھی اجازت نہیں دی گئی کہ میں اپنے دوستوں سے ملوں۔ جب مجھے عدالت میں حاضر ہونا پڑا تو سارے علاقے میں دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری نافذ کر دیا گیا۔ مرداسں کے جشن کے موقع پر یہی دفعہ سارے ضلع مردان اور ضلع پشاور میں نافذ کر دی گئی......... یہ صحیح

ہے .... کہ اس کا مقصد ان لوگوں کو دبانا تھا جو غذا کی رسد بڑھانے کا تقاضا کر رہے تھے۔ لیکن محض اس بات سے کہ اس کی زد میں مسلم لیگی بھی آئے تھے، یہ ثابت نہیں ہوتا کہ لوگوں کے شہری حقوق میں مداخلت نہیں کی گئی بلکہ اس سے تو الزام اور شدید ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نئے انتظام میں خود سرکاری پارٹی کے لوگوں کے بنیادی حقوق بھی سلب کر لئے گئے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۰۹ کی رو سے ہزارہا شہریوں کو بغیر عدالتی تحقیقات کے جیل میں بھر دیا گیا۔ کیا حکومت اس کے صحیح اعداد پیش کرے گی؟"

انھوں نے کہا معلوم نہیں حکومت مخالف پارٹیوں کی خبروں کو دبانے کے لئے کیا ترکیب کرتی ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ سرخ پوشوں کے دو اہم جلسے ہوئے جن میں اخباروں کے نمائندے موجود تھے۔ لیکن ان کی خبر کسی جگہ کے کسی اخبار میں شائع نہیں ہوئی۔" ظاہر ہے کہ اخبار کے نمائندوں نے اتنی زحمت خواہ مخواہ نہیں اٹھائی تھی۔"
آخر میں انھوں نے کہا کہ یہ باتیں اس وقت تو سمجھ میں آتی تھیں جب ملک میں بدیسیوں کی حکومت تھی۔ مگر اب جبکہ پاکستان آزاد ہو گیا ہے اور یہ دعوٰے کیا جاتا ہے کہ ایک عوامی اسلامی حکومت وجود میں آئی ہے تو یہ کسی طرح عقل میں نہیں آتا کہ آخر صوبے کی حکومت نے "وہی بدیسی سامراجیوں کے پرانے نوکر شاہی طریقے" کیوں استعمال کئے۔

بادشاہ خاں کے آخری سفر کراچی کے موقع پر ان کے ساتھ کوئی تیس خدائی خدمت گار تھے جو اپنے خرچ پر آئے تھے اور ان کے باڈی گارڈ کا کام کرتے تھے۔ یہ لوگ اُن کے اپنے گاؤں اتمان زئی میں اور دوسری جگہ مسلح ہو کر پہرہ دیتے تھے تاکہ اگر ان پر قاتلانہ حملہ کیا جائے تو اُن کی حفاظت کریں۔ دس سال پہلے جب گاندھی جی اتمان زئی میں بادشاہ خاں کے مہمان تھے تو یہ سوال اُٹھا تھا کہ گاندھی جی کی حفاظت کے لئے رات کو مسلح پہرہ لگایا جائے۔ بادشاہ خاں کو وہ گفتگو یاد تھی جو اس موقع پر گاندھی جی سے ہوئی تھی "بادشاہ خاں نے اپنے ساتھیوں کو کئی بار اس بات پر جھڑکا کہ وہ ان کی حفاظت کے لئے مسلح ہو کر پہرہ دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ اسے عدم تشدد کے اصول کے خلاف سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ اُسے اپنا فرض سمجھ کر اس سے باز نہیں آئے۔ انھیں اپنے محبوب لیڈر کی طرف سے بڑی فکر ہے، اور ان کی وفاداری کو دیکھ کر دل پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ ان کو بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں...... لیکن وہ کبھی پہرے سے غافل نہیں ہوتے...... ایک منٹ کے لئے بھی نہیں

ایک پارٹی میں جو بادشاہ خاں کے اعزاز میں کراچی میں دی گئی، سندھ کے اقلیت کے ایک نمائندے نے کہا کہ مہاتما جی کی زندگی میں وہ اپنی مشکلوں کو حل کرنے کے لئے ہمیشہ اُن کے پاس جایا کرتے تھے لیکن اب ان کی وفات کے بعد ایسے موقعوں پر وہ بادشاہ خاں

کے پاس جایا کریں گے" جس کی وہ مہاتما جی کے بعد سب سے زیادہ عزت کرتے ہیں۔" انھوں نے یہ درخواست کی کہ اس مشکل زمانے میں وہ ان کی رہنمائی کریں۔ بادشاہ خاں نے اس کے جواب میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ زمانہ سب کے لئے آزمائش اور مصیبت کا ہے۔ خدائی خدمت گاروں نے صوبہ سرحد میں اپنی وزارت بنالی تھی۔ لیکن چند سال کے بعد وہ ختم ہو گئی۔ اس لئے کہ وزارت نے عوام کی اتنی خدمت نہیں کی جتنی اُسے کرنی چاہئے تھی۔ اس نے جو وعدہ عوام سے کیا تھا اُسے پوری طرح نہیں نباہا۔ انھوں نے کہا کہ وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کو صوبہ سرحد کی وزارت کی کمزوری جتایا کرتے تھے، لیکن نہ تو ورکنگ کمیٹی نے اس صورت حال کی اصلاح کی اور نہ خود وزارت نے۔

بادشاہ خاں نے کہا" آخر کار دنیا میں حق اور انصاف کا بول بالا ہوگا اور ملک کی ترقی بے غرض اور مخلص لیڈروں ہی کے ہاتھوں ہوگی نہ کہ خود غرض اور خود مطلب زمانہ سازوں سے۔ ہندوستان اور پاکستان کے سامنے ترقی اور بہبودی کی راہ اسی وقت کھلے گی جب اُن کے لیڈروں میں یہ صفات ظاہر ہوں۔"

گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں نے مغربی پاکستان میں اقلیتوں کی مصیبت کی داستان بہت غور سے سُنی۔ خدا کی طرف سے ہمیشہ انسانوں کا امتحان ہوتا رہتا ہے

اور صرف وہی قومیں اور افراد جو ان آزمائشوں کا مقابلہ صبر، استقلال اور ہمت سے کرتے ہیں، آخر میں کامیاب ہوتے ہیں۔ پاکستان کے قائم ہونے کے بعد سے شمال مغربی سرحدی صوبے میں خالص آرڈیننس کی حکومت ہے۔ پاکستان کے وجود میں آنے کا باعث دراصل آزادی کی وہ لڑائی ہے جو پٹھان اور دوسرے لوگ ایک مدت سے لڑ رہے ہیں۔ اگر وہ انگریزوں کو اختیارات کے منتقل کرنے پر مجبور نہ کر دیتے تو پاکستان کبھی نہ بن سکتا۔ لیکن ملک کو چھوڑتے وقت انگریز حکمرانوں نے اختیارات ان لوگوں کے ہاتھ میں نہیں دیئے جو آزادی کے لئے لڑ رہے تھے۔ بلکہ ان کو سونپے جنہوں نے اُس کے لئے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

بادشاہ خان نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ سچے امن پسند ہیں، اور ہمیشہ اس پر اصرار کرتے رہے ہیں کہ خدمت کا جو عہد غریبوں سے خدا کے سامنے کیا گیا ہے اس پر عمل کیا جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔ اسی لئے ان لوگوں کو یہ مصیبت اُٹھانی پڑی۔ اس آزمائش کے وقت لوگوں کو اپنے غصّے کو قابو میں رکھنا چاہیئے، ایک کڑے اخلاقی ضابطے اور نصب العین کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر حال میں اس پر عمل کرنا چاہیئے، اور اس کی کوشش کرنی چاہیئے کہ یہی اخلاقی ضابطہ حکومت کے نظم و نسق پر بھی عاید کیا جائے۔

پٹھانوں کے ایک مجمع کے سامنے جو زیادہ تر مزدوروں پر مشتمل تھا۔ بادشاہ خاں نے اپنی صاف گوئی کو خطرناک حد تک پہنچا دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں جماعت کی حیثیت سے صرف پٹھان ہی ایسے ہیں جنھوں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑی ہے، اور انھیں کی بدولت پاکستان بن سکا۔ وہ سرمایہ دار طبقہ جس کے ہاتھ میں پاکستان کی حکومت ہے پٹھانوں سے اس لیے ڈرتا ہے کہ وہ خود غرضی سے پاک ہیں اور ملک کی خاطر تکلیفیں اٹھانے کو ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ "وہ ہمیشہ ہندوستان کی تقسیم کے خلاف رہے اور اس خول ریزی اور ناقابلِ بیان مصیبت نے جو تقسیم کے بعد لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو اٹھانی پڑی یہ ثابت کردیا کہ ان کی رائے صحیح تھی۔ مگر پھر بھی جب سے پاکستان بنا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کا فائدہ خود ان کا فائدہ اور پاکستان کا نقصان خود ان کا نقصان ہے"

آخر میں بادشاہ خاں نے کہا "پٹھانوں کو اپنے مستقبل کے بارے میں شبہ ہے اور وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں ان کا مقام کیا ہوگا۔ اگر واقعی ان کے ساتھ بھائیوں کا سا برتاؤ کرنے کی نیت ہے تو پاکستان کے طرز حکومت اور دوسرے معاملات کے متعلق ان کی رائے لی جانی چاہیئے۔ ہندوستان

میں صوبوں کے گورنر کے انتخاب میں صوبائی وزارتوں سے مشورہ کیا جاتا ہے۔ لیکن صوبہ سرحد میں ایک انگریز افسر جسے پٹھان ناپسند کرتے ہیں، اُن کے سر پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ پٹھان یہ جاننا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں ان کی حیثیت کیا ہوگی، کیا ان کے ساتھ برابری کا برتاؤ کیا جائے گا؟

خدائی خدمت گار اس کے سوا کچھ نہیں چاہتے کہ پاکستان کے عوام کی موجودہ غربت اور پس ماندگی کو دور کیا جائے اور اس کوشش میں وہ ہر حال میں عدم تشدد کے جو ساری عمر ان کا اصول رہا ہے پابند رہیں گے۔

۱۵ را پریل کو بادشاہ خاں کی ملاقات قائد اعظم جناح سے ہوئی قائد اعظم نے اُن سے پوچھا کہ کیا خدائی خدمت گار مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے اور صوبہ سرحد کی وزارت کے ساتھ کولیشن کی صورت میں تعاون کریں گے؟ اس کے جواب میں بادشاہ خاں نے پھر سے پاکستان کی وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ مسلم لیگ میں شریک ہونے اور سرحد کی وزارت کی کولیشن بنانے سے معذور ہیں۔ اس کے بعد قائد اعظم نے ایک بہت بڑے جلسے میں اعلان کیا کہ ان کے اور بادشاہ خاں کے درمیان گفت وشنید ناکام رہی۔ انھوں نے پٹھانوں کو تاکید کی کہ "وہ ایسے لوگوں سے کوئی واسطہ نہ رکھیں کہ جو پاکستان کی وفاداری کا بہانہ کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں اس کی بنیاد کو کمزور

کرنا چاہتے ہیں۔"

۱۳ مئی کو بادشاہ خاں نے اعلان کیا کہ انھوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ خدائی خدمت گاروں کی تحریک کو پاکستان کے سب صوبوں میں پھیلائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ یہ جماعت پاکستان کی عوامی پارٹی کے لئے جو اسی وقت بنی تھی اور جس نے انھیں اپنا پہلا عارضی صدر منتخب کیا تھا ایک والینٹیر کور کا کام دے گی۔ اس پارٹی کا منجملہ اور مقاصد کے ایک مقصد یہ تھا کہ پاکستان کو ایک مضبوط اور مستحکم ریاست اور سوشلسٹ جمہوریتوں کا ایک یونین بنائیں جس کی بنیاد عوام کے ارادے اور مرضی پر ہو۔ جس میں سب صوبوں کو پوری آزادی حاصل ہو اور جو ہمسایہ ریاستوں خصوصاً انڈین یونین سے دوستانہ تہذیبی تعلقات رکھے۔"

اس پارٹی کی کانفرنس نے ختم ہونے سے پہلے کئی روزلیوشن پاس کئے جن میں صوبہ سرحد کی استبدادی پالیسی پر ملامت کی گئی جس نے خدائی خدمت گاروں کو جیلوں میں ڈال دیا تھا۔ یہ مطالبہ کیا گیا کہ پاکستان کے فائدے کو مدنظر رکھ کر یہ پالیسی بدل دی جائے اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ بلوچستان کے نیشنلسٹ لیڈر عبدالصمد خاں کو رہا کر دیا جائے۔"

کانفرنس نے یہ اعلان کیا کہ عوامی پارٹی اس پارٹی سے جو برسرِ حکومت ہے تعاون کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہے

"آئین ساز مجلس کے اندر بھی اور باہر بھی ایک متفقہ پروگرام کی بنیاد پر جو نئی ریاست کی سلامتی استحکام اور فلاح و بہبود کے لئے بنایا جائے۔"

ایک تجویز یہ بھی تھی کہ جب تک اس قسم کا کوئی سمجھوتہ نہ ہو اس پارٹی کی پالیسی یہ ہوگی کہ پاکستان کی موجودہ حکومت کا ساتھ دے۔

بہت جلد یہ بات ظاہر ہوگئی کہ پاکستان کی حکومت نئی عوامی پارٹی کے قیام کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی۔ صوبہ سرحد کے وزیر اعظم خان عبدالقیوم خاں نے سُرخ پوشوں کے لیڈر خان عبدالغفار خان کو ایک ایسا دشمن قرار دیا جو پاکستان کی حکومت کی جڑ کھودنے کی پوری کوشش کر رہا ہے" اور اس حلف وفاداری کے متعلق جو انھوں نے اور ان کی پارٹی نے اُٹھایا تھا یہ کہا کہ "یہ ایک ڈھونگ سے زیادہ نہیں" اسی کے ساتھ انھوں نے یہ معنی خیز جملہ کہا "جب کبھی ہم اپنے امن پسند شہریوں کی بھلائی کے لئے مناسب سمجھیں گے۔ ضروری تدبیریں اختیار کریں گے۔"

بادشاہ خاں پر انتشار پیدا کرنے کا الزام لگایا گیا مگر ان کا کہنا یہ تھا کہ میں بہت سوچتا ہوں مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستان کے اربابِ اختیار کدھر جا رہے ہیں۔ وہ اسلام کا نام لے کر ریاست کے قوت اور استحکام کی اپیل کرتے ہیں لیکن اسی کے

ساتھ وہ اُن لوگوں سے جو پاکستان کی قوت اور خوش حالی کے بنیادی مسئلے میں اُن سے متفق ہیں لیکن اس کے طریقے کے بارے میں ایمان داری کے ساتھ ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔ تنگ دلی اور تنگ نظری سے پیش آتے ہیں۔"

ہمارے ہمسایہ ڈومینین ہندوستان میں تقسیم سے پہلے ہندو مہاسبھا اور ڈاکٹر امبیدکر کا اچھوتوں کا فیڈریشن برابر ہر قدم پر کانگریس کی مخالفت کرتا تھا۔ لیکن جیسے ہی ہندوستان آزاد ہوا سب مخالف پارٹیاں مل گئیں۔ چنانچہ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی اور امبیدکر اب پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کے رفیق کار ہیں۔ اگرچہ انھوں نے اپنی جماعتوں کو کانگریس پارٹی میں ضم نہیں کیا ہے۔ بخلاف اس کے جو کچھ پاکستان میں ہورہا ہے وہ بہت افسوسناک ہے اور اگر یہی صورت حال رہی تو نہ صرف مسلم لیگ کے لیڈروں کو بلکہ خود قوم کو اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ میں نے بارہا ان بیانات میں جو اخباروں کو دئے جو ان تقریروں میں جو مجمع عام میں کیں پاکستان کی وفاداری کا اظہار کیا ہے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں میں باہم تفریق کی جاتی ہے اور میری پارٹی کے لوگوں کے ساتھ مخالفت بلکہ دشمنی کا برتاؤ ہورہا ہے۔ میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا :۔ ہم آپ کے نظم ونسق میں رکاوٹ نہیں ڈالتے۔ ہم کو حکومت کی ہوس نہیں۔ وزارت آپ کو

مبارک ہو۔ ہم تو صرف اس کی اجازت چاہتے ہیں کہ اپنے تعمیری طریقے سے اپنے بھائیوں کی خدمت کر سکیں۔ مگر اس پر بھی وہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے "۔

...... بادشاہ خاں صوبہ سرحد میں واپس آئے تاکہ نئی جمعیتہ العوام کا پروگرام اپنی قوم کے سامنے پیش کریں۔ انھوں نے ضلع مردان میں ایک بہت بڑے جلسے کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا " میں نے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کا تماشا دیکھ لیا۔ پاکستان کے لیڈروں میں اور پرانے انگریز حکام میں کوئی مطلق فرق نہیں ہے۔ اس حکومت کی حمایت میں جو دلیل بظاہر سب سے زیادہ معقول معلوم ہوتی ہے اور عموماً پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ نئی ریاست ابھی ایک نوزائیدہ بچہ ہے۔ میں ان سے یہ کہتا ہوں کہ ہندوستان کو دیکھو جس کے لیڈروں نے سخت طوفان کے باوجود ریاست کی کشتی کو کنارے تک پہنچا دیا ہے۔ انھوں نے اپنا نیا آئین بنا لیا ہے۔ درآں حالیکہ پاکستان میں ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا ہے "۔

اس سے ہم صرف یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ پاکستان کے موجودہ لیڈر جمہوری نظام سے ڈرتے ہیں۔ یہ لیڈر جنھیں اپنے اپنے فائدے کی فکر ہے۔ پاکستان کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھتے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ یہ سب مہاجرین ہیں اور پاکستان کے

اصلی باشندے نہیں ہیں۔

میں اس موقع پر تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلامی یا قرآنی قانون جس کے لئے تم اتنے دن سے چلا رہے ہو، اور جس کی خاطر تم نے اور تمہارے عزیزوں نے اپنی جانیں قربان کی ہیں، پاکستان میں کبھی نافذ نہیں ہوں گے۔

انھوں نے اپنی تقریر کو ان پر زور الفاظ پر ختم کیا "میرے افغان بھائیو! میں تمھیں یہ جتانا چاہتا ہوں کہ تم پاکستان کی ریاست میں حصہ دار ہو، اس کا چوتھائی حصہ تمھارا حق ہے۔ اب یہ تمھارا کام ہے کہ تم مل کر اٹھ کھڑے ہو، اور یہ عہد کرو کہ اپنا حق لے کر رہیں گے۔ تم متحد ہو جاؤ اور مضبوط ارادے سے کام لے کر ان ریت کی دیواروں کو گرا دو جو پاکستان کے لیڈروں نے تمھارے گرد کھڑی کر دی ہیں۔ ہم موجودہ صورتِ حال کو اب برداشت نہیں کر سکتے۔ اپنی کمریں کس لو اور اپنی منزل کی طرف بڑھے چلو۔ تمھاری منزل اُن پٹھانوں کی آزادی ہے۔ جنھوں نے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں اور بڑی بڑی مصیبتیں اُٹھائی ہیں۔ ہم اس وقت تک چین نہیں لیں گے جب تک پٹھانستان یعنی پٹھانوں کی حکومت پٹھانوں کے ذریعے سے اور پٹھانوں کے لئے قائم نہ کر لیں۔"

تین دن بعد وہ گرفتار کر لئے گئے۔ اُن کے ساتھ اُن کے بیٹے عبدالولی خاں اور دو اور سرخ پوش لیڈر بھی پکڑ لئے گئے۔

بندہ واؤ شاہ کے چھوٹے سے کچے ڈاک بنگلے میں جو بنوں کی بڑی سڑک پر واقع ہے۔ اُن کے مقدمے کی سرسری تحقیقات ہوئی۔ اُن پر "بغاوت" کا اور "پاکستان کے دشمن فقیر ایپی کے ساتھ تعاون کا ارادہ رکھنے" کا الزام لگایا گیا۔ کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر نے جس کے سامنے مقدمہ پیش ہوا تھا اُن سے کہا کہ اپنی صفائی پیش کریں۔ انھوں نے ارتکاب جرم سے انکار کیا۔ مگر اس کے سوا اور کوئی صفائی پیش نہیں کی۔ اس پر مجسٹریٹ نے پوچھا کہ کیا آپ صوبہ سرحد کے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۴۰ کے مطابق تین سال کے لئے نیک چلنی کا مچلکہ دینے پر تیار ہیں۔ بادشاہ خان نے جواب دیا کہ "میں نے ایسے مچلکے نہ کبھی دئے ہیں اور نہ اب دوں گا۔" چنانچہ انھیں تین سال کی قیدِ بامشقت جو اس جرم کی کم سے کم سزا ہے دی گئی۔

بادشاہ خان کی گرفتاری کے فوراً بعد صوبہ سرحد کی حکومت نے اپنے اس اقدام کی توجیہہ کے لئے ایک کمیونکے شائع کیا جس میں کہا گیا کہ باوجود اس کے کہ ہندوستان کی تقسیم کانگریس اور مسلم لیگ کی باہمی رضامندی سے ہوئی، عبدالغفار خان "پاکستان کے قیام کے قطعاً مخالف ہیں۔" یہ بات صحیح نہیں تھی۔ عبدالغفار خان ستمبر ہی میں یہ اعلان کر چکے تھے کہ وہ پاکستان کو قبول کرتے ہیں البتہ وہ یہ چاہتے تھے کہ پشتو بولنے والے لوگوں کو اپنے وطن

میں جس کا نام اُنھوں نے پٹھانستان رکھا، وہی حیثیت اور حقوق حاصل ہوں جو سندھیوں کو سندھ میں، پنجابیوں کو پنجاب میں اور بنگالیوں کو بنگال میں ہیں۔ بہرحال اس کمیونکے میں یہ لکھا تھا" انھوں نے اپنے پیروؤں کو یہ حکم دیا کہ ۱۵ اگست کے جشن آزادی میں شرکت نہ کریں" اور پاکستان کی نئی ریاست کا حلفِ وفاداری نہ اُٹھائیں۔ اسی لیئے اُن کے بھائی کی وزارت جو ان دنوں برسر حکومت تھی، پاکستان سے غداری کی بنا پر برخاست کردی گئی تھی۔" ظاہر ہے کہ یہ الزام اسی وقت غلط ثابت ہو گیا جب بادشاہ خاں نے کراچی میں حلف وفاداری اُٹھایا، اور صاف صاف الفاظ میں پاکستان کی ریاست سے سچی وفاداری کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو الزام اُن پر لگایا گیا اُسے اُن کے بھائی کی وزارت" سے " جو ان دنوں برسر حکومت تھی" کیا تعلق ہے؟ کیا یہ وہی پرانا قصہ نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ بھیڑیے نے میمنے پر یہ الزام لگا کر کہ وہ اس کا پانی گدلا کر رہا ہے اُسے ہڑپ کر لیا تھا۔ اس کے بعد کمیونکے میں یہ الفاظ تھے" اسی کے ساتھ اُنھوں نے نام نہاد جمعیت العوام کو قائم کر کے اپنے دائرۂ عمل کو اور وسیع کر لیا" کوئی پوچھے کہ یہ کون سا جرم تھا اور پاکستان کے پرانے کانگریسی عناصر کو اکٹھا کر لیا۔ ظاہر ہے جسے سزا دینا ہو، اس پر کچھ الزام تو لگانا ہی چاہیئے" دوسری بار کراچی جانے کے بعد...... بادشاہ خاں

نے سوچ سمجھ کر اور پورا انتظام کر کے صوبے میں شورش کرنے کی کوشش کی۔ عین اس وقت جب ہندوستانی فوج کا حملہ، جس کا بہت کچھ اشتہار دیا گیا تھا، صوبہ سرحد پر ہونے کی توقع تھی" اگر کوئی ایسی سازش تھی کہ بادشاہ خاں کی مفروضہ جدوجہد اسی وقت شروع ہو جب "ہندوستانی فوج کا حملہ، جس کا بہت کچھ اشتہار دیا گیا تھا، صوبہ سرحد پر ہونے کی توقع تھی" (دراصل یہ حملہ کمیونیک کے مصنف کے ذہن کی پیداوار تھی) تو پاکستان کی حکومت بھی اسی سازش میں ضرور شریک رہی ہوگی، تبھی تو اس نے آئین ساز اسمبلی کا جس میں بادشاہ خاں حلف وفاداری اٹھانے کے لئے گئے تھے ٹائم ٹیبل ایسا بنایا کہ وہ اس کی کارروائی ختم ہونے کے بعد ٹھیک وقت پر اپنے صوبے میں پہنچ سکیں۔ "گڑھی حبیب اللہ کی بم باری" جو ہندوستان کی ہوائی فوج نے کہر کی وجہ سے غلطی سے کردی تھی اور جس کے لیے ہندوستان کی حکومت نے فوراً علانیہ معافی مانگی تھی" نے بادشاہ خان کو اور اکسایا۔" (یہ اس شخص کا ذکر ہے جس نے حال ہی میں کراچی میں کہا تھا کہ پاکستان کے قائم ہونے کے بعد سے وہ پاکستان کے فائدے کو اپنا فائدہ اور اس کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھتا ہے) "اور وہ گاؤں گاؤں پھر کر لوگوں سے یہ کہنے لگے کہ پاکستان ایک ریل کے پل کی طرح ہے جو ایک ہی دھکے میں بیٹھ جائے گا" یہ بات ان کے الفاظ کو زبردستی توڑ مروڑ کر کہی گئی۔ حقیقت میں انھوں نے یہ

کہا تھا کہ پٹھانوں کو متحد ہو کر " ان ریت کی دیواروں کو گرا دینا چاہیئے جو پاکستان کے لیڈروں نے ان کے گرد کھڑی کر دی ہیں " تا کہ ان کے حقوق کو محدود کر دیں۔ کمیونکے کے آخری الفاظ یہ تھے " اپنی تقریروں میں جو وہ آخر مئی سے کر رہے ہیں وہ نہ صرف حکام کو بُرا بھلا کہتے ہیں بلکہ لوگوں کو واقعی اکسا رہے ہیں کہ اس حکومت کے خلاف جو جائز طور پر قائم ہوئی ہے شورش برپا کریں۔ اب آپ ان الفاظ کا مقابلہ بادشاہ خان کے اس بیان سے کیجیئے جو انھوں نے صاف دلی سے ۱۶ مئی ۱۹۴۸ء کو یعنی اپنی گرفتاری سے ایک مہینے پہلے دیا تھا " مجھے مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ باوجود اس اپیل کے جو میں نے حال میں اپنے مخالف پارٹی کے دوستوں سے اخباروں اور تقریروں کے ذریعے سے کی تھی انھوں نے جمعیتہ العوام کے قیام کو ہمدردی کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ وہ میری پارٹی والوں کی نیت پر بار بار شبہہ کا اظہار کر رہے ہیں محض اس لیئے کہ وہ ایک زمانے میں ہندوستان کی نیشنل کانگریس سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بات اس وجہ سے اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے کہ اس جمعیت نے اپنے خاص رزولیوشن میں حب وطن کے جذبے کے ساتھ غیر مشروط طور پر حکومت کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ ہمارے حریفوں کے نزدیک ریاست سے وفاداری کا معیار یہ ہے کہ ایک پارٹی حکومت کے سامنے بے چون و چرا سر جھکا دیا جائے " دنیا سے یہ توقع کرنا بے جا ہے کہ وہ اس بات کو

مان لے گی کہ وہ شخص جس کو ساری عمر اپنی قوم کو تشدد سے باز رکھنے کی لگن رہی جو اُسے اُن کے لئے مہلک سمجھتا تھا جس نے خوفناک پٹھانوں کو عدم تشدد کا پابند بنا کر دنیا کو حیران کر دیا جس کے خلوص اور سچائی کی گاندھی جی نے اچھی طرح جانچ کرنے کے بعد شہادت دی تھی۔ اس جرم کا مرتکب ہو سکتا ہے کہ جو بار بار خالص عدم تشدد کا اور پاکستان کی وفاداری کا دعوےٰ کرنے اور مجمع عام میں اس کی خیر خواہی کا اعتراف کرنے کے بعد ایک دم سے اپنے عقیدے سے پھر جائے گا اور اِن اصولوں کو جن کا وہ عمر بھر پابند رہا چھوڑ دے گا راقم الحروف جسے بادشاہ خاں کی دوستی اور ہم طعامی کا فخر حاصل ہے اور جو گاندھی جی کے زیر سایہ اُن کے گھر میں خاندان کے ایک رکن کی حیثیت سے رہ چکا ہے۔ یہ کہہ سکتا ہے کہ آج ہندوستان یا پاکستان میں کوئی ایک شخص بھی نہیں جو بادشاہ خاں کی طرح گاندھی جی کے حق اور عدم تشدد کے اصولوں کا اور اُن کی گہری روحانیت کا مجسمہ ہو، جو ان کی طرح خدا پر عقیدہ رکھتا ہو، اس کی مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہو اور اس کے بندوں کی دل و جان سے خدمت کرتا ہو۔[1]

---

[1] مہادیو ڈیسائی نے جو گاندھی جی اور بادشاہ خاں دونوں کو اتنی اچھی طرح جانتے تھے جتنا کوئی اور نہیں جانتا ہو گا ۱۹۳۸ء میں لکھا تھا "مجھے آج تک کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو پاکبازی اور زہد و تقوےٰ اور اسی کے ساتھ رقت قلب اور خدا پر سچا عقیدہ رکھنے میں بادشاہ خاں سے بڑھ کر بلکہ ان کے برابر بھی ہو۔"

" دو خدائی خدمت گار " از مہادیو ڈیسائی

خان بھائیوں کی مسلسل اسیری مہذب دنیا کے ضمیر کے لئے ایک چیلنج ہے۔ اگر بے گنا ہوں کی جنھوں نے اپنی زندگی کو ایک اعلیٰ نصب العین کی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے۔ قربانی کی مثال دیکھنی ہو تو ان دونوں بھائیوں کو خصوصاً بادشاہ خان کو دیکھئے۔ اُن کے دل میں کسی کی طرف سے دشمنی کا جذبہ نہیں بادشاہ خاں کی کوئی ذاتی غرض نہیں، کوئی شخصی حوصلہ نہیں "میں ساری عمر ایک سپاہی رہا ہوں اور مرتے دم تک سپاہی رہنا چاہتا ہوں" ان الفاظ کے ساتھ انھوں نے ۱۹۳۴ء میں کانگریس کا صدر بننے سے انکار کیا تھا۔ انھوں نے اپنی خوشی سے ضبط نفس کے لئے ہر طرح کی جسمانی تکلیفیں اُٹھانے کی عادت ڈالی۔ سفر کے زمانے میں وہ اپنا سامان خود اُٹھاتے تھے اور تیسرے درجے میں سفر کرتے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں جب وہ پہلی بار گاندھی جی سے ملنے کے لئے بورسد آئے تو اُن کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا تھا "جب فاصلہ اتنا ہو جسے وہ پیدل طے کر سکیں تو کبھی سواری استعمال نہیں کرتے، لیکن جب اس کے بغیر کام نہ چل سکے تو وہ سب سے سستی سواری ڈھونڈھتے ہیں۔ وہ ہر قسم کے تعیشات سے پرہیز کرتے ہیں اور نہایت سادی غذا استعمال کرتے ہیں۔ اِنھیں لوگوں کی اطاعت اور سچی وفاداری حاصل ہے۔ اس لئے کہ وہ خود ان صفات کا مجسمہ ہے۔

خان بھائیوں کو پاکستان کی حکومت سے جو اختلاف بھی ہو

بادشاہ خاں کے اس خط کی عکسی تصویر جو موصوف نے امن پسندوںکی کانفرنس بمقام شانتی نکیتن و سیوا گرام (دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء) کے دعوت نامہ کے جواب میں بھیجا تھا۔

Name of Sender: Abdul Ghaffar, Montgomery Central Jail W. Punjab

Full name of address and relationship of addressee and of any other mentioned in this letter: Hiralal Bose org. Secretary, World Pacifist Meeting, 1 Upper Wood Street, Calcutta 16, INDIA

To be detached here

Signature of censoring officer

Censored and passed.

For Deputy Inspector General of Police, West Bengal

پیارے ھیرا لال جی، آپ کا ۱۵ نومبر سنہ ۱۹۴۹ء کا خط مجھے ۸ دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء کو ملا۔ شکریہ۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں قید ھوں اور آپ لوگوں کی مجلس میں شرکت کرنے سے معزور ھوں۔

آپ لوگوں نے بنی نوع انسان کی بہبودی کے لئے جو نیک کام شروع کیا ہے اس سے مجھے پورا پورا اتفاق ہے - اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی آپ لوگوں کو اس پاک مقصد میں کامیاب کرے -

دستخط عبدالغفار

(قیدی)

۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء

نگران کی دیانت داری شبہ سے بالاتر ہے۔ مجھے یاد ہے کہ تقسیم کے بعد جب میں آخری مرتبہ گاندھی جی کے ساتھ دسمبر ۱۹۴۷ء اور جنوری ۱۹۴۸ء میں ٹھیرا تھا تو بادشاہ خاں نے گاندھی جی کو یہ پیام بھیجا تھا کہ آپ میری طرف سے یا ڈاکٹر خان صاحب کی طرف سے کوئی فکر نہ کیجئے۔ ہم آپ سے ملنے یا آپ کو خط لکھنے سے خاص کر کے پرہیز کرتے ہیں تاکہ پاکستان کے ساتھ ہماری وفاداری کے بارے میں کوئی شبہ نہ کیا جا سکے۔ ان دونوں کے ساتھ یہ بڑا ظلم ہوگا کہ ان پر دھوکے یا دوغلے پن کا شبہ کیا جائے۔ وہ اس قسم کی حرکتیں کر ہی نہیں سکتے۔ انھیں اپنے ملک سے اور اپنی قوم سے گہری اور والہانہ محبت ہے۔ بادشاہ خاں فطری طور پر سیدھے سادے اور کھرے واقع ہوئے ہیں اور کبھی ایسے بھولے پن کی باتیں کرتے ہیں کہ دوسرا آدمی گھبرا جاتا ہے۔ ایسا شخص کبھی اس ریاست کا دشمن نہیں ہو سکتا جو اپنے آپ کو اسلامی ریاست کہتی ہے۔

خان بھائی اس مٹی کے بنے ہیں جس سے ہیرو اور شہید بنتے ہیں۔ وہ اس مقصد کی خاطر جس کے لئے انھوں نے اپنی ساری زندگی گذار دی، خوشی سے جان دینے پر تیار ہو جائیں گے "مجھے پوری طرح یقین ہے کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔ جب تک وہ مجھ سے جیل کے باہر کام لینا چاہتا تھا اس نے مجھے جیل سے باہر رکھا۔ اب اس کی مرضی یہ ہے کہ میں اندر رہ کر کام کروں میں اسی میں

خوش ہو جو اس کی خوشی ہو،" یہ الفاظ بادشاہ خاں نے اس وقت کہے تھے جب وہ واردھا سے اس زمانے کی بھی حکومت کے حکم سے گرفتار کر لیے گئے تھے اور انھیں تین سال کی قید سخت کی سزا دی گئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ آج بھی وہ یہی الفاظ دہراتے ہوں گے۔ اس لیے وہ جہاں ہیں اچھے ہیں۔ لیکن انصاف سے کہیے کہ کیا ایسے خدائی خدمت گاروں سے اس سے بہتر کام نہیں لیا جا سکتا تھا کہ انھیں جیل کی دیواروں کے اندر زندہ دفن کر دیا جائے۔ کاش آج ہندوستان کا کوئی خدمت کرنے والا بادشاہ خاں کی طرح با خدا بے نفس، حق شناس اور سچی تنقید کرنے والا ہوتا جو حکومت کو تنبیہہ کرتا رہتا اور اُسے سیدھے راستے پر چلاتا جو ان کی سی کھری سیرت، بے لاگ دیانت رکھتا اور جیسے حضرت مسیح کی طرح غریبوں اور بے کسوں سے محبت اور ہمدردی ہوتی اور جو اپنی زندگی کے ہر سانس کو ان کی آزادی اور خدمت کے لئے وقف کر دیتا۔ اگر دونوں ملکوں میں ایسے دو دو آدمی ہوتے تو یہ ان دونوں بلکہ شاید سارے ایشیا اور پوری دنیا کے لئے امن اور سلامتی کی بہترین ضمانت ہوتی۔

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بادشاہ خاں میں کوئی خامی یا کمزوری نہیں ہے۔ کون انسان اس سے خالی ہے؟ ان کی ایک کمزوری یہ ہے کہ وہ انگریزوں کی بات پر شبہہ کرتے ہیں۔ ایسا

کے بارے میں میں گاندھی جی کی رائے بیان کر چکا ہوں۔ بات یہ ہے کہ انسان ویسا ہی بن جاتا ہے جیسا واقعات اُسے بناتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۳۱ء میں گاندھی اروِن معاہدے کے بعد گاندھی جی انھیں سر آرتھر گریفتھ سے ملنے کے لئے لے گئے۔ بادشاہ خاں بڑے افسروں سے ملنا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک سیدھا سادا آدمی ہوں اور ڈپلومیسی نہیں جانتا ہوں۔ گاندھی جی نے اُنھیں سمجھا بجھا کر راضی کیا۔ جب سر گریفتھ سے ملاقات ہوئی تو بادشاہ خاں نے اُن سے کہا "میں ایک صاف آدمی ہوں اور صاف باتیں پسند کرتا ہوں۔ میرے ساتھ ڈپلومیسی نہ برتیے گا۔" انھوں نے جواب دیا "خاں صاحب سیاست ایک شطرنج کا کھیل ہے جس میں دونوں طرف سے چالیں چلی جاتی ہیں۔ میں آپ کو مات دینے کی کوشش کرتا ہوں، آپ کو موقع ملے تو مجھے مات دیجئے۔" بادشاہ خاں نے کہا "تو پھر میں آپ کے ڈھب کا آدمی نہیں ہوں۔" اور یہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سر گریفتھ نے حکمت عملی سے اپنا طرز بدل دیا۔ انھیں روک لیا اور ملاقات جاری رہی۔ اس کے کئی سال بعد بادشاہ خاں نے اس کے نتیجے کو بیان کیا "میں نے اپنی تجویز اُن کے سامنے رکھی (کہ قبائلیوں میں جاکر اور محبت کے ساتھ ان کی خدمت کر کے ان کے دلوں کو ہاتھ میں لیا جائے) .... مگر اس پر غور کرنے کے بجائے انھوں نے مجھے جیل میں ڈال دیا۔" وہ حد سے زیادہ

حساس ہیں اور کبھی کبھی اُن کے مزاج میں چڑچڑاپن آ جاتا ہے۔ وہ صاف گو اور مُنہ پھٹ ہیں، اور جب کبھی اُنھیں غصہ آ جاتا ہے تو اُن کے منہ سے گرم لاوا کی طرح الفاظ ابلنے لگتے ہیں اور سُننے والے کی روح کے اندر جھوٹ کی کھیتی جل جاتی ہے۔ لیکن اُن کے غصّے میں عداوت نہیں ہوتی۔ انھیں غصہ برائی پر آتا ہے۔ بُرے آدمی پر نہیں آتا۔ پھر بھی ستیہ گرہ کے نقطہ نظر سے یہ ایک خامی ہے اس لئے کہ ستیہ گرہ کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ سچی بات جب محبت بھرے دل سے نکلے تو اس میں سختی نہیں ہونی چاہیئے۔ سارا معاملہ یہ ہے کہ انسان کو اس کا ڈھب آتا ہو۔ اسی طرح ان کی بعض اور کمزوریاں بھی گنائی جا سکتی ہیں۔ خدا اپنے سچے خدمت گذار دل کی غلطیوں کو درست کر دیتا ہے۔ مگر اُن سے چشم پوشی نہیں کرتا۔ عدم تشدد کا قانون اٹل ہے۔ اور اگر اس پر عمل کرنے میں ناتجربہ کاری سے کام لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ فوری مقصد میں ناکامی ہو، مگر یہ نام نہاد ناکامی عدم تشدد کی نہیں ہوتی بلکہ اس ناقص ذریعے کی ہوتی ہے۔ جس سے وہ ظاہر کیا جائے۔ بجائے اس کے کہ اس سے انسان کا عقیدہ کمزور ہو یا اس پر مایوسی کا غلبہ ہو عدم تشدد کے پیرو کو چاہیئے کہ توفیق الٰہی کے لئے۔ جس کے بغیر انسان کوئی چیز نہیں، اور زیادہ دعا کرے۔

"انسان کو اس سے زیادہ نہیں دبا گیا۔
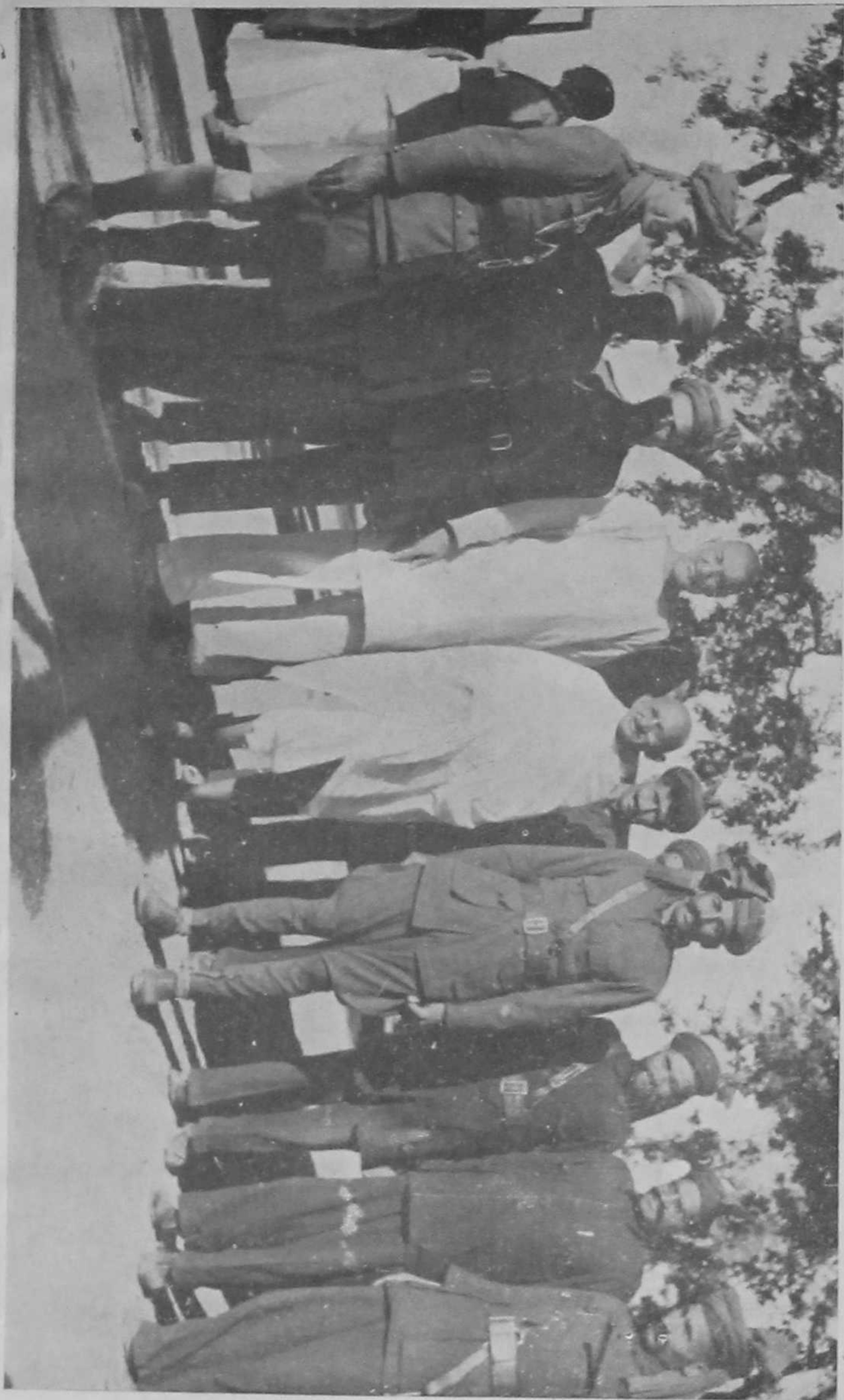
اس کی روح میں صرف اتنی ہی طاقت ہے
کہ جو آج سیکھے، اس پر کل عمل کرے۔
اس کے لئے یہ کام کیا کم ہے
کہ صناع حقیقی کو کام کرتے ہوئے دیکھے
اور اس سے کاری گری کے حقیقی گُر
اور اوزاروں کا صحیح استعمال تھوڑا بہت سیکھ لے!"

اب رہے خدائی خدمت گار تو جو خبریں اس کے بارے میں مل رہی ہیں کہ بادشاہ خاں کی اسیری کے زمانے میں انھیں اپنے سردار کی وفاداری کے جرم میں کیا کچھ بھگتنا پڑ رہا ہے اگر ان کا ایک شمہ بھی صحیح ہے تو انھیں بڑی سخت آزمائش کا سامنا کرنا ہے۔ انھیں گاندھی جی کے یہ الفاظ جن میں آئندہ کی خبر دی گئی ہے، یاد رکھنے چاہئیں:-

"اگر آخری مقابلے میں خدائی خدمت گار اس عقیدے میں سچے ثابت نہ ہوئے جس کی پابندی کا وہ دعوے کرتے ہیں تو ظاہر ہوگا کہ دراصل عدم تشدد ان کے دل میں نہ تھا۔ آزمائش کا موقع بہت جلد آئے گا۔ اگر وہ جوش اور خلوص سے تعمیری پروگرام پر عمل کرتے رہے تو ان کے لئے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ امتحان کے وقت دنیا کے سب سے زیادہ بہادر آدمی ثابت ہوں گے۔

"عدم تشدد کسی کی اجازت کا پابند نہیں۔ وہ آپ
مُہر اور اپنی سند ہے۔ وہ بے گناہ قربانی اور ظاہری
کے ذریعے سے ہر معرکے کو سر کر لیتا ہے۔ وہ کبھی نا
ہوتا۔"